اداریہ

پچھلے دنوں ادارہ مخزن کی طرف سے اردو کانفرنس ہوئی ۔ یہ کانفرنس کابینہ کمیٹی کے اس اجلاس کی تائید میں تھی جس میں نفاذِ اردو کے عمل کو تیز کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ کانفرنس کا افتتاح جناب محمد میاں سومرو نے کیا جو اس وقت مرکزی اسمبلی کے چیئرمین تھے اور اب حسن اتفاق سے عبوری حکومت کے وزیراعظم ہیں اور اس پوزیشن میں ہیں کہ ان وعدوں کی تکمیل کر سکیں جو انہوں نے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں کیے تھے۔ ہم توقّع کرتے ہیں کہ اس مختصر وقت میں قومی زبان کو اس کا حق ضرور دلوائیں گے۔

کابینہ کمیٹی کی سفارشات کے علاوہ کچھ ایسے اقدامات بھی ہیں جو وہ اپنے حکم سے نافذ کر سکتے ہیں۔ مثلاً وزارت اطلاعات کو یہ ہدایت جاری کی جائے کہ سرکاری اشتہارات اردو اخبارات کو لازماً اردو زبان میں بھیجے جائیں۔ اسی طرح مقتدرہ قومی زبان کو اقبال اکیڈمی کی طرح وہ اختیارات دیے جا سکتے ہیں جو مالی امور میں داخلی طور پر اقبال اکیڈمی کو حاصل ہیں۔ علاوہ ازیں مقتدرہ قومی زبان کو اردو اصطلاحات کے سلسلے میں Authentication کا اختیار دے دیا جائے تاکہ سرکاری ادارے مقتدرہ کی وضع کردہ اصطلاحات کو اختیار کرنے کے پابند ہو جائیں۔ مقتدرہ قومی زبان کابینہ کے فیصلے کی روشنی میں وجود میں آیا تھا لیکن آئینی طور پر پاکستان کے دستور اساسی کا حصہ ہے۔ اسے موجودہ غیر یقینی صورت حال سے نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک آرڈیننس کا نفاذ کیا جائے جو بعد میں اسمبلی آنے پر قانونی شکل اختیار کرے۔

اسی طرح ہم صحافیوں کی انجمن کے صدر سے التماس کرتے ہیں کہ اخبارات کے

ضابطۂ اخلاق میں یہ شق بھی شامل کی جائے کہ اردو اخبارات صرف اردو میں اشتہارات شائع کرنے کے پابند ہوں۔ آج کل اردو اخبارات میں سرکاری اور غیر سرکاری اشتہارات ترجیحی طور پر انگریزی میں شائع ہو رہے ہیں جس سے نفاذِ اردو کا عمل بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔

امید ہے موجودہ حکومت قومی زبان کے سلسلے میں واضح پالیسی اختیار کر کے نفاذِ اردو کے عمل کو آسان بنانے میں عملی اقدامات کرے گی۔

مدیر

سانجھ بھی چودیس

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

۱۸۵۷ء میں انگریز کمپنی کے خلاف برِعظیم کے باشندوں کی جدّ وجہد کو سو سال پورے ہوئے تو ۱۹۵۷ء میں اس کی یاد منانے کا موقع تھا۔ میں ان دنوں جامعہ پنجاب میں ایم اے (تاریخ) کا طالب علم تھا۔ اس صد سالہ یادگار کی تقریبات منانے میں حکومت پاکستان نے بڑی سرد مہری کا مظاہرہ کیا کیونکہ یہاں کے حکمران ان لوگوں کے خلاف تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں جی جان سے انگریزوں کی خدمت کی تھی۔ ہمارے ایک استاد نے کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے آزادی خواہوں کی تمام مساعی کو اس بنا پر رد کر دیا کہ اس زمانے میں ہمارے ہاں قوم پرستی کا احساس ہی پیدا نہ ہوا تھا۔ اس رویّے پر مجھے دکھ ہوا، چنانچہ میں نے اس موضوع پر ایک مفصل مضمون لکھ ڈالا۔ پھر اس کو چھپوانے کا خیال آیا۔ ان دنوں احمد ندیم قاسمی صاحب روزنامہ ''امروز'' کے مدیر تھے۔ ان کا نام شروع سے کان میں پڑتا رہا تھا بلکہ ان کی ابتدائی دو کتابیں ''دھڑکنیں'' اور ''بگولے'' جن پر انہوں نے ۶۔ جون ۱۹۴۲ء کو دستخط کیے تھے، گھر میں موجود تھیں اور آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ گرمی کی چھٹیاں ہونے والی تھیں لہٰذا میں نے وہ مضمون ڈاک کے ذریعہ مدیر ''امروز'' کے نام ارسال کر دیا اور خود لاڑکانہ روانہ ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد مجھے قاسمی صاحب کا ''امروز'' کے پیڈ پر ۵۔ جولائی ۱۹۵۷ء کا نوشتہ موصول ہوا۔ لکھا تھا:

''برادر عزیز مکرم، سلام مسنون ___ حیرت ہے کہ آپ لاہور میں مقیم رہے مگر ایک بار بھی ملاقات نہ ہوئی۔ بہر حال آپ نے یاد کیا اس کے لیے میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں ..... مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کیجیے۔ آپ کو شاید اس امر کا پورا پورا احساس نہیں کہ میرے دل میں اپنے اختر کے تمام متعلقین کی کتنی عزت ہے۔ آپ کا مخلص احمد ندیم۔''

تعطیلات کے اختتام پر جب میں لاہور آیا تو ''امروز'' کے دفتر جا کر ان کی خدمت میں حاضری دی۔ اس طرح ٹوٹ کر ملے کہ میں حیران رہ گیا اور پھر یہ تعلق خاطر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

آیندہ سال ۱۹۵۸ء میں ایم۔اے کے فائنل امتحان سے فراغت پا کر میں پھر لاڑکانہ چلا گیا۔ نتیجہ نکلا تو ۹۔ اکتوبر کو انہوں نے مجھے کامیابی پر مبارکباد کا خط روانہ کیا اس کے آخر میں لکھا تھا:

''مجھے اپنی زندگی سے وابستہ سمجھیے کہ بے لوث اور پر خلوص تعلقات کے بارے میں، میں بہت ضدّی قسم کا انسان ہوں۔ مجھے آپ کے مستقبل سے بہت گہری دلچسپی ہے، اس لیے اگر میں کسی امداد و تعاون کے قابل سمجھا جاؤں تو یہ میری خوش نصیبی ہو

گی۔کبھی لاہور آئیں تو مجھ سے ضرور مل لیا کیجیے کہ یہ آپ کا احسان ہوگا۔

آپ کا بھائی ندیم''

مبارکباد کے جواب میں، میں نے انہیں شکریہ کا خط لکھا تو ۱۹۔اکتوبر کے مکتوب میں پھر لکھتے ہیں:

''مجھے ہمیشہ اپنے اتنا ہی قریب سمجھیے جتنا آپ کا کوئی قریبی عزیز ہوسکتا ہے۔اس لیے کہ آپ کے مجھ پر اور میرے آپ پر چند حقوق ہیں اور میرے دل میں آپ کے سارے گھرانے کا احترام ہے۔''

جب ایوب خاں کے دور میں حکومت نے پروگریسو پیپرز پر قبضہ جمایا تو قاسمی صاحب نے ''امروز'' کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا۔اس پر انہیں گرفتار کرلیا گیا اور جب کچھ عرصے بعد رہا ہوئے تو معاشی اعتبار سے فارغ تھے۔۱۹۔مئی ۱۹۵۹ء کو نسبت روڈ والے مکان سے لکھتے ہیں:

''پیارے بھائی۔سلام محبت ..... میں ان دنوں قطعی بیکار ہوں ..... بزنس میرے بس کا روگ نہیں، ورنہ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کردیتا۔بہرحال ..... حالات سے میں نے بہت کم شکست کھائی ہے اس لیے میری جدوجہد ہمیشہ جاری رہتی ہے ..... آپ پر اتنے بڑے اور اتنے معزز گھرانے کی ذمہ داریاں ہیں اور مجھے بے انتہا حیرت (اور مسرت) ہوتی ہے کہ آپ کتنی استقامت سے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہتے ہیں۔خدا آپ کو مزید برکت دے۔''

سچ پوچھیے تو زندگی کے مسائل کے حل کی جدوجہد میں وہ جس طرح میری ہمت بندھاتے تھے اس سے مجھے بڑا سہارا ملا۔اکتوبر ۱۹۵۸ء سے اگست ۱۹۵۹ء تک کا عرصہ میں نے میں نے ٹونک میں چھوڑی ہوئی آبائی جائداد کے کلیم کی ایڈجسٹمنٹ وغیرہ کی مصروفیات میں گزارا اور ستمبر ۱۹۵۹ء میں لاہور آکر اورینٹل کالج میں ایم۔اے (فارسی) کے دوسرے سال کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔میں ولنگڈن ہاسٹل میں رہتا تھا۔ماہ ستمبر کے اختتام پر مجھے سخت بخار نے آلیا۔یکم اور پانچ اکتوبر کو وہ مجھے ڈاکٹر یحییٰ فاروقی صاحب کے مطب (بالمقابل میو ہسپتال) لے کر گئے اسی موقع پر میری بڑی بہن پروین اختر صاحبہ سے جو عمر کوٹ میں رہتی تھیں ان کی خط و کتابت کا آغاز ہوا۔میرے تندرست ہونے کے بعد ان کا یہ معمول ہوگیا کہ ہفتے عشرے میں عصر یا مغرب کے بعد میرے پاس تشریف لاتے، گھنٹہ پون بیٹھتے اور چائے کی ایک پیالی پیتے۔ایک دن آئے تو کلائی پر گھڑی نہیں تھی۔میں نے پوچھا تو بتایا کہ ''صبح غسل کرتے ہوئے اتاری تو فرش پر گر کر شیشہ ٹوٹ گیا۔ہائی کلاس واچ کمپنی میں مرمت کے لیے دے آیا ہوں۔'' یہ رولیکس کی آئسٹر پرپیچول آٹومیٹک گھڑی تھی جو انہوں نے چند سال قبل ایک وفد کے ساتھ چین جانے پر ہانگ کانگ سے خریدی تھی۔اتفاق سے میرے پاس رولیکس پریسیشن کی چابی والی طلائی گھڑی تھی۔میں نے وہ اتار کر پیش کردی کہ آپ کو وقت دیکھنے میں دقت ہوگی۔کہنے لگے ''اور آپ کیا کریں گے؟'' میں نے کہا ''مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔دن کو کالج کی گھنٹی اور رات کو قریبی گرجے کا گھڑیال میرے لیے کافی ہیں۔اگلے ہفتے آئے تو جیب سے میری گھڑی نکال کر دی۔ساتھ ہی بولے:

''مظہر بھائی، آپ کی گھڑی تو بڑی قیمتی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا ''آپ کو کس نے بتایا؟'' کہنے لگے ''جب میں ہائی کلاس والوں سے اپنی گھڑی لے کر باندھنے کی غرض سے آپ کو گھڑی اتارنے لگا تو ان کے منیجر نے مجھے کہا، آپ وہ گھڑی اتار کر یہ

گھڑی باندھ رہے ہیں؟'' میں پوچھا' کیوں؟ اس میں کیا خاص بات ہے؟ یہ تو چابی سے چلتی ہے۔'' بولا، اس سے کیا ہوتا ہے؟ اس کی قیمت میں آپ جیسی تین چار گھڑیاں آسکتی ہیں۔''

کیا محبت کے آدمی تھے۔ میری اس چھوٹی سی بات سے اتنے متاثر ہوئے کہ یہ قصہ پروین بہن کو لکھ بھیجا۔ ان کا جواب آنے میں تاخیر ہوئی تو ۷۔ فروری ۱۹۶۰ء کو یاددہانی کے خط میں لکھتے ہیں: ''اس دوران میں تمہیں ایک اور خط بھی لکھا تھا جس میں اپنی گھڑی کے لوٹنے اور عزیزی مظہر کے ایک نہایت پیارے اقدام کا ذکر تھا..... وہ مجھ سے اتنا پیار کرنے لگے ہیں اور اتنی اپنائیت سے ملتے ہیں کہ خدا کی قسم سینہ فراخ ہو جاتا ہے۔''

میرا ایم۔اے (فارسی) کا امتحان ہو رہا تھا کہ ان کی ہمشیرہ یعنی ظہیر بابر صاحب کی والدہ علالت کے بعد لاہور کے ایک ہسپتال میں وفات پا گئیں۔ ان کی میت انگہ لے جائی گئی۔ مجھے اگلے روز اخبار سے علم ہوا تو میں نے تعزیت کا تار دیا اور آخری پرچہ دیتے ہی اپنے دوست بشیر صاحب کے ساتھ لے کر انگہ پہنچ گیا۔ دو راتیں قیام کرنے بعد واپسی ہوئی۔ اس سے ان کو طمانیت کا احساس ہوا۔ فرماتے تھے'' آپ کے آنے سے میری بڑی ڈھارس بندھی بلکہ میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔''

ستمبر ۱۹۶۰ میں امتحان کا نتیجہ نکلا۔ قاسمی صاحب کے ایما پر طفیل ہوشیارپوری صاحب، سی۔ایم۔صادق، ڈائرکٹر تعلیمات کے پاس گئے اور میرا تقرر عارضی بنیاد پر گورنمنٹ ڈگری کالج مظفر گڑھ میں ہو گیا۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں وہاں پہنچا۔ ۲۷۔ اکتوبر کو ملتان میں ایک مشاعرہ تھا جس میں وہ بھی مدعو تھے۔ یہ اطلاع دیتے ہوئے ۲۲۔ تاریخ کے خط میں لکھتے ہیں: ''اگر اس مشاعرے میں آیا تو مظفر گڑھ ضرور پہنچوں گا اور ایک دن آپ کے پاس بسر کروں گا..... آپ بہت یاد آتے ہیں اس لیے کہ آپ میرے دل کے بہت قریب ہیں۔''

وہ مشاعرے میں پہنچ گئے۔ میں اور میرے ساتھی اگلے روز دوپہر کے کھانے پر مظفر گڑھ میں ان کے منتظر رہے لیکن وہ نہیں پہنچے۔ پھر ان کا ملتان سے دیا ہوا تار ملا کہ انہیں بامر مجبوری لاہور واپس جانا پڑ رہا ہے۔ لاہور سے ۲۔ نومبر کو خط لکھا:

''میں کیوں نہ آسکا؟ اس کی وجہ زبانی ہی عرض کی جا سکتی ہے۔ بہر کیف آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کے پاس حاضر ہونے کی راہ میں کوئی ناقابل عبور رکاوٹ ہی حائل ہوگی..... میں آپ کے علاوہ آپ کے عزیز دوستوں سے بھی عاجزانہ معافی چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ نے میرے حاضر نہ ہو سکنے کی وجہ کا ذرا سا اندازہ ضرور لگا لیا ہوگا۔'' دراصل معاملہ وی سی۔آئی۔ڈی کے تعاقب کا تھا اور وہ ہم سرکاری ملازمین کو کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔''

انہیں یہ فکر رہا کرتی تھی کہ میں اپنی کوئی تکلیف یا ضرورت تکلفاً ان سے پوشیدہ نہ رکھوں۔ چنانچہ ایک نہایت جذباتی خط (مکتوبہ ۲۸۔ جنوری ۱۹۶۱ء) میں اس ضمن میں رقم طراز ہیں: ''یہ سب کچھ محض اس لیے لکھا ہے کہ اس دوران میں جب کبھی کسی قسم کی ضرورت محسوس کریں تو مجھے غیر کبھی نہ سمجھیں اور ایک لمحے کی بھی جھجک محسوس نہ کیا کریں۔ عین ممکن ہے کہ زندگی کے کسی آیندہ مرحلے پر مجھے بھی آپ کی مدد کی ضرورت پڑے اس لیے آپ اب جھجکیں گے تو میں بھی جھجکوں گا اور میں ایسا نہیں چاہتا۔''

دراصل یہ انہوں نے محض مجھے مائل کرنے کے لیے لکھا تھا ورنہ انہیں میری کیا ضرورت ہو سکتی تھی۔

بعض دیگر عوامل کے علاوہ ان کی محبت کی کشش تھی جس کے باعث میں نے لاڑکانہ سے نقل مکانی کا فیصلہ کیا اور ۱۹۶۲ء کے موسم گرما کی تعطیلات ختم ہونے سے قبل دادی جان، والدہ اور چھوٹے بھائی کو شیخوپورہ منتقل کر دیا اور خود اپنی ملازمت پر مظفر گڑھ پہنچ گیا۔ اس مواقع پر انہوں نے میرے نام اپنے ۱۰۔ستمبر کے خط میں لکھا ''اللہ تعالیٰ آپ کو اس نئی ہجرت کے بعد آرام وسکون نصیب کرے۔ میری دعائیں ہمہ وقت آپ کے ساتھ ہیں۔''

دسمبر ۱۹۶۲ء کے تیسرے عشرے میں مظفر گڑھ کے ادب دوست ڈپٹی کمشنر سید محمد عسکری نقوی نے ایک دھوم دھامی مشاعرے کا اہتمام کیا، جس میں پاکستان کے اکثر نمایاں شعراء نے شرکت کی۔ اس موقع پر میں نے قاسمی صاحب سے، جوش صاحب سے ملانے کی درخواست کی۔ رات ایک بجے کے قریب جب جوش صاحب پنڈال میں پہنچے تو میں قاسمی صاحب کی ہدایت کے مطابق سٹیج پر پہنچ گیا۔ تعارف ہونے پر جوش صاحب بولے ''بیٹا! خدا غریق رحمت کرے تمہارا باپ ہمارا بڑا اچھا دوست تھا۔'' اس موقع پر سید محمد جعفری صاحب بھی بڑی محبت سے ملے اور پوچھا ''آپ نے اپنے ابا کی کتاب ''پھولوں کے گیت'' دیکھی ہے، جو بچوں کے لیے لکھی گئی تھی؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔'' کہنے لگے ''اس میں ایک نظم شریر لڑکا کے عنوان سے بھی ہے۔'' میں نے کہا ''جی ہاں، وہ مجھے زبانی دیا ہے۔'' بولے ''وہ انہوں نے بطور تفنن مجھ پر لکھی تھی'' اس انکشاف پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے:

جعفری اک شریر لڑکا ہے　　پڑھنے لکھنے سے جی چراتا ہے

اور اس میں یہ شعر بھی ہے:

بد بلا نے وہ گل کھلائے ہیں　　سارے ہمسائے تنگ آئے ہیں

اگلے دن لیہ میں مشاعرہ تھا چنانچہ علی الصباح خاص خاص شعرا ادھر روانہ ہو گئے۔

۱۹۶۳ء کے آغاز میں، قاسمی صاحب کے ایما پر میں نے محکمہ کے نام مظفر گڑھ سے شیخوپورہ تبادلہ کی درخواست بھجوا دی اور انہی کی مساعی کے نتیجے میں بالآخر مجھے گورنمنٹ انٹر کالج شیخوپورہ تبدیل کر دیا گیا۔ اس کا فائدہ تو یہ ہوا کہ ہفتے عشرے میں لاہور کا چکر لگنے پر ان سے ملاقات ہونے لگی اور نقصان یہ کہ ہمارے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ عندالضرورت رابطے تک محدود ہو گیا۔ اس اثناء میں انہوں نے اپنا اشاعتی ادارہ ''کتاب نما'' قائم کیا، نیز ''فنون'' کا اجرا ہوا۔ خدیجہ مستور صاحبہ کا ناول ''آنگن'' کتاب نما نے چھاپا تھا۔ میں نے دادا جان کی معروف کتاب ''پنجاب میں اردو'' جس میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے ضروری ضمائم اور مختصر حواشی کا اضافہ کیا تھا، اشاعت کے لیے پیش کی۔

میری نسبت لاڑکانہ میں ہوئی تھی۔ جولائی ۱۹۶۴ء میں شادی طے پائی۔ وہ لاڑکانہ تو نہ جا سکے لیکن بعد میں اپنی طرف سے نیڈوز ہوٹل میں عصر کی چائے کا اہتمام کیا جس میں بہت سے احباب نے شرکت کی۔

۴۔مارچ ۱۹۶۵ء کو ہمارے کالج کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ میری درخواست پر قاسمی صاحب، عابد علی عابد صاحب، قتیل شفائی صاحب اور طفیل ہوشیار پوری صاحب جیسے معروف شعراء کو لے کر شیخوپورہ آئے اور یوں اس معمول کے مشاعرے کو یادگار بنا دیا۔

وہ جب بھی کسی تقریب سے شیخوپورہ آتے تو میرے غریب خانے پر تشریف لا کر میری عزت افزائی کرتے۔ اگر کوئی رات کا مشاعرہ ہوتا تو شب بسری بھی کر لیتے۔ ۱۹۶۵ء کی موسم گرما کی تعطیلات میں نے لاڑکانہ میں گزاریں۔ اور حماقت یہ کی کہ ان کو خیریت سے مطلع بھی نہ کیا۔ آخر ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ ۵۔ ستمبر کو شیخوپورہ کے پتے پر خط لکھا:

''پیارے بھائی۔ محبت، کہیں آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں۔ یہ میری نالائقی اور بدبختی ہے کہ ان دنوں نہ آپ کے پاس آ سکا نہ خط لکھ سکا۔ دراصل میں ان دنوں بڑی مشکلوں میں گرفتار ہوں اور ارادہ ہے کہ ۱۲۔ تاریخ تک فون پوسٹ کرنے کے بعد چند گھنٹوں کے لیے آپ کے پاس آ کر ان مشکلوں کے بارے میں مشورہ کروں، یہ تو خیر بعد کی بات ہے..... آپ بہت دنوں سے تشریف نہیں لائے .....اس وجہ سے سخت پریشان ہوں..... میں تو آپ کو ان اپنوں میں شمار کرتا ہوں، جن کے دم سے زندہ رہنے سے جی اکتاتا نہیں ہے..... مجھے آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے سے دلچسپی ہے اور یہ دو مہینے تو میرے لیے بڑے کربناک بن کر رہ گئے ہیں۔''

۶۔ تاریخ کو جنگ ستمبر کا آغاز ہوا اور میں لاڑکانہ میں محصور ہو کر رہ گیا۔ آخر جنگ کے اختتام پر واپس آ کر ان کی خدمت میں حاضر ہو سکا۔

نومبر دسمبر ۱۹۶۵ء میں ایسا اتفاق ہوا کہ دو تین بار حاضری کے باوجود ان سے ملاقات نہ ہو پائی اس پر معذرت خواہانہ انداز میں ۳۔ جنوری ۱۹۶۶ کو لکھتے ہیں:

''پیارے مظہر بھائی۔ دعا اور محبت، میری بدقسمتی ہے کہ پچھلے ڈیڑھ دو مہینے سے آپ سے کھل کر کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔ میں شیخوپورہ بھی نہ آ سکا اور آپ یہاں آئے تو نہ مل سکا۔ اب جی چاہتا ہے کہ عید کے بعد ایک مکمل دن آپ کے ساتھ گزاروں۔ تشنگی سی محسوس ہو رہی ہے۔''

۱۹۶۶ء کے موسم بہار میں اچانک میرا تبادلہ ملتان ہو گیا جس سے میں بہت گھبرایا۔ لاہور جا کر قاسمی صاحب کو بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ مجھے ساتھ لے کر مصطفیٰ زیدی صاحب کے پاس پہنچے جو ان دنوں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے اور ڈائرکٹر تعلیمات کو فون کر کے تبادلہ منسوخ کرنے کو کہا۔ چنانچہ مجھے شیخوپورہ انٹر کالج سے شیخوپورہ ڈگری کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔

اس کالج میں بھی ایک معیاری مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کی صدارت حکیم نیر واسطی صاحب نے کی تھی لیکن یہ بعد کی بات ہے یعنی ۱۹۶۷ء کے ربع اوّل کی۔ اس کی کامیابی بھی قاسمی صاحب اور ان کے دوست شعرا کی مرہون منت تھی۔

پروفیسر حمید احمد خان صاحب کی وفات کے بعد مئی ۱۹۷۴ء میں قاسمی صاحب مجلس ترقی ادب کے ناظم مقرر ہوئے۔ میرا مجلس کے ساتھ سید امتیاز علی تاج صاحب کے وقت سے تعلق تھا کیونکہ میں مجلس کے لیے مقالات حافظ محمود شیرانی کے سلسلے کی تدوین کو رہا تھا۔ اس کی چھ جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔ قاسمی صاحب کی نظامت کے دوران میں طویل وقفوں سے اس سلسلے کی ساتویں، آٹھویں اور نویں جلدیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ اس تاخیر کا باعث مجلس کی سقیم مالی حالت تھی۔ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''حافظ محمود شیرانی اور ان کی

علمی وادبی خدمات'' بھی دو جلدوں میں مجلس ہی نے چھاپا تھا۔اس کی اشاعت پر قاسمی صاحب کو بطور ناشر، علی گڑھ سے مشہور فاضل ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کا تہنیتی خط موصول ہوا، جس پر وہ بڑے خوش ہوئے۔وفات سے ذرا پہلے انہوں نے مقالات حافظ محمود شیرانی'' کی دسویں اور آخری جلد کی طباعت کی منظوری بھی تحریری طور پر دے دی تھی۔

۱۹۹۵ء میں ملازمت سے میری سبکدوشی کے موقع پر گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کی بزم ادب وثقافت کا نام تبدیل کر کے ''بزم شیرانی'' رکھ دیا گیا تھا۔اس کے انچارج پروفیسر شبلی صاحب کی خواہش تھی کہ بزم کے باقاعدہ افتتاح کے لیے قاسمی صاحب کو دعوت دی جائے۔میں پہلے تو ندیم بھائی جان کی زحمت کے خیال سے شبلی صاحب کو ٹالتا رہا۔جب ان کا اصرار بہت بڑھ گیا تو ایک دن میں نے ندیم صاحب سے ذکر کر دیا۔وہ فوراً آمادہ ہو گئے۔چنانچہ ۱۴۔جنوری ۱۹۹۶ء کو کالج کے ہال میں ایک بھرپور تقریب ہوئی جس کے آخر میں قاسمی صاحب نے صدارتی خطاب کیا۔اس خطاب میں انہوں نے اختر شیرانی مرحوم کی محبت کے تناظر میں چند ماہ تک عرب ہوٹل میں کھانا کھانے کا ذکر بھی کیا۔یہ قصہ قاسمی صاحب نے اس سے کوئی تیس برس قبل میری موجودگی میں میرے دوست اشتیاق حسن خان کو سنایا تھا۔اس تمام عرصے میں میں نے اسے اپنے سینے میں محفوظ رکھا تا آنکہ خود انہوں نے یہ ایک بھرے جلسے میں کہہ سنایا۔بعد میں کسی جگہ میں نے پڑھا کہ وہ یہ واقعہ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ لاہور کے کسی ادبی اجلاس میں بیان کر چکے تھے۔خدا لگتی بات یہ ہے کہ ان کے بار بار اس علی الاعلان اعتراف سے اختر شیرانی کی خورد نوازی کے ساتھ ساتھ قاسمی صاحب کی اخلاقی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

ندیم صاحب کا گاؤں انگہ وادی سون میں سکیسر جانے والی سڑک کے دائیں جانب والے پہاڑی سلسلے پر ایک پرفضا جگہ واقع ہے۔اس کے ماحول کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ان کے والد ماڈی سے زیادہ روحانی دنیا کے آدمی تھے۔ندیم صاحب کے بڑے بھائی کا نام محمد بخش قاسمی اور خود ان کا احمد بخش قاسمی تھا۔عرفیت احمد شاہ تھی۔جس سے بعض اہل قلم کو ان کے سیّد ہونے کا گمان ہوا۔وہ اعوان قبیلے کی ایک شاخ قسمال (مقامی زبان میں قاسم سے صفت نسبتی) سے تعلق رکھتے تھے۔چنانچہ قسمال کا اردو متبادل قاسمی ان کے نام کا جزو ٹھہرا۔بچپن میں یتیمی اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی محرومیوں اور نارسائیوں نے ندیم کو درد کی وہ دولت عطا کی جو انسان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے اور اسی درد کی بدولت ان کو وہ حساس دل اور دیدۂ بینا ودیعت ہوئے جو ایک بڑا فنکار بننے کے لیے شرط لازم کی حیثیت رکھتے ہیں:

سب حجابات نظر دل کے ندُکھنے تک تھے　　درد چمکا تو اندھیرا بھی نہ رہنے پایا

اس شخص نے اپنی دردمندی کو وسعت دے کر بنی نوع انسان کے مظلوموں اور محکوموں کے دکھوں پر محیط کر دیا اور پھر جیتے جی اس جذبے سے ایک لمحے کو بھی دستکش نہ ہوا۔جب وہ حصول تعلیم کے سلسلے میں لاہور پہنچے تو حسن اتفاق سے انہیں یہاں ایسے لوگوں کی صحبت میسر آئی جس نے اس زرکانی کو کندن بنا دیا۔اختر شیرانی سے ندیم نے شعر وادب سے زیادہ مہر ووفا اور شرم وحیا کا سبق لیا۔دونوں میں ایک اور قدر مشترک سیم وزر کو خزف ریزوں سے زیادہ وقعت نہ دینے کا رویّہ تھا۔اختر ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔اور یہی حال ندیم کا تھا بلکہ مجھ سے ندیم کی شدید محبت کو بھی اس سابقہ محبت کی توسیع سمجھنا درست ہوگا۔

مولانا عبدالحمید سالک کی صحبت میں ندیم نے بہت سی دوسری خوبیوں کے ساتھ ضرورت مندوں کے کام آنے کی عادت سیکھی۔ میں نے کبھی نہ دیکھا کہ کسی نے ندیم صاحب کو کوئی کام بتایا ہو اور انہوں نے اس کے لیے مخلصانہ کوشش سے پہلو تہی کی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کو سعی مشکور ہو یا نامشکور۔ ان مساعی کی کہانی طویل بھی ہے اور سبق آموز بھی، جس کی تفصیلات بیان کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مناسب۔ میں صرف چھوٹا سا واقعہ درج کرتا ہوں۔

کراچی کا ایک شخص جو خاصا اچھا مصور تھا، لاہور میں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرتا تھا۔ ایک دن وہ اپنی پینٹنگ لے کر قاسمی صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ کراچی میں میری والدہ سخت علیل ہیں اور میری جیب خالی ہے۔ اگر اس تصویر کے پانچ سو روپے مل جائیں تو میری مشکل آسان ہو جائے گی۔ یہ کہتے ہوئے اس بھلے مانس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ قاسمی صاحب نہایت غیور واقع ہوئے تھے۔ لیکن جب کسی غریب کا کام ہوتا تو سب کچھ بھول جاتے تھے۔ چنانچہ اس سے تصویر لے لی اور اگلے روز آنے کو کہا۔ اس کے جانے کے بعد اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر تصویر اٹھائی اور سیدھے سعید سہگل کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ موصوف نے بڑی آؤ بھگت کی لیکن تصویر خریدنے سے معذرت کر دی۔ یہ وہاں سے نکل کر میاں ممتاز دولتانہ کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے بھی بڑی خاطر کی۔ یہ حرف مطلب زبان پر لائے البتہ قیمت کا تذکرہ نہیں کیا کہ یہاں سے بھی مایوسی نہ ہو۔ خیال تھا کہ جو کچھ بھی ملے گا اس میں اپنے پاس سے رقم ملا کر اس شخص کی ضرورت پوری کر دوں گا۔ دولتانہ صاحب نے تصویر پسند کی اور اپنے ملازم کو بلا کر ڈرائنگ روم میں آویزاں کرنے کو کہا۔ پھر اٹھ کر گئے اور ایک ہزار روپیہ لا کر ندیم صاحب کو پیش کر دیا۔ اگلے روز جب تصویر کا مالک آیا اور انہوں نے اس کی توقع سے دوگنا رقم اسے دی تو اس کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو جاری ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ صنعت کار نہیں پہنچا، جاگیردار بروئے کار آیا۔ یہ اشارہ پرانے جاگیرداری نظام میں فن کاروں کی سرپرستی والی روایات کی طرف تھا۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں مطلق عار نہیں کہ ندیم صاحب کی اس کاربرآری اور خدمت گزاری کی صفت سے سب سے زیادہ میں نے فائدہ اٹھایا اور ان سے ''کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ'' کے مصداق ایسے ایسے ادبی اور غیر ادبی کام لیے کہ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ملا کی دوڑ مسجد تک، ان سے نہ کہتا تو کس سے کہتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی بے غرضی اور خلوص کے باعث زیادہ تر کام حسب منشا ہو جاتے تھے۔ کسی کے کلام کی اشاعت، کسی کی کتاب پر فلیپ، کسی ضرورت مند شاعر یا ادیب کی مالی امداد، کسی کی چھوٹی موٹی نوکری کی سفارش، کسی کتاب کی تقریب رونمائی میں شمولیت، کسی مفت کے مشاعرے میں شرکت یہ تو معمول کی باتیں تھیں۔ معاملہ کہیں آگے پہنچا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے میں دو واقعات مختصراً عرض کرتا ہوں۔

ضلع سیالکوٹ کے میرے ایک مہربان کا انٹرمیڈیٹ پاس لڑکا گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا اور فوج میں سپاہی بھرتی ہو گیا۔ ایک عرصے تک تو پتہ ہی نہ چلا۔ اس وقت علم ہوا جب وہ ای۔ ایم۔ ای کی ٹریننگ لے کر باقاعدہ تعینات ہو گیا۔ گھر والوں نے واپس لانا چاہا۔ وہ نوجوان بھی آمادہ تھا مگر اب کمبل نہیں چھوڑتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے والد نے مجھ سے بھی اعانت طلب کی۔ پہلے تو میں نے ندیم صاحب کو اس کام کے لیے موزوں نہ سمجھتے ہوئے اپنے بعض مہربان فوجی افسروں سے درخواست کی۔ اکثر نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ بعض نے اپنی سی کوشش بھی کی لیکن کارگر نہ ہوئی۔ آخر تھک ہار کر سارا معاملہ ندیم صاحب کے گوش گزار کیا۔ انہوں نے معروف

شاعر عطا شاد بلوچ کے نام رقعہ لکھ کر دیا جوان دنوں آرٹس کونسل کوئٹہ کے ڈائرکٹر تھے۔ وہاں جانا میرے بس کا روگ نہیں تھا چنانچہ عزیزی عبدالقیوم کو وہ رقعہ دے کر کوئٹہ بھیجا۔ واپسی پر اس نے بتایا کہ جب میں نے عطا شاد صاحب کو ان کے دفتر میں وہ رقعہ پہنچایا تو وہ لفافے پر ندیم کا نام دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور رقعہ اپنے سر پر رکھ لیا۔ کچھ دیر اسی حالت میں ندیم صاحب سے عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔ پھر بیٹھ کر رقعہ پڑھا۔ رقعہ لانے پر میرے ممنون ہوئے، خاطر مدارت کی، دو چار جگہ فون گھمائے۔ ای۔ ایم۔ ای کے بڑے افسر، پھر امان اللہ گچکی، سیف اللہ پراچہ وغیرہ۔ اتفاق سے کسی رابطہ نہ ہو سکا۔ مجھے کہنے لگے، ندیم صاحب کی خدمت میں میرا دست بستہ سلام عرض کرنا اور کہنا کہ آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔ غرض یہ کہ کچھ ہی دن بعد وہ نوجوان ڈسچارج ہو کر اپنے گھر پہنچ گیا۔

دوسرا واقعہ بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ ایک دن میں اپنی زرعی اراضی پر پھر رہا تھا۔ اچانک گاؤں کا ایک ضعیف آدمی، غریب عالم نامی، میرے پاس آیا اور زار و قطار رونے لگا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی لڑکی کی شادی گزشتہ سال ضلع سرگودھا کے کسی چک میں ہوئی تھی۔ اب اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اس کے شوہر نے برادری کی کسی پرانی رنجش کا بدلہ لینے کی خاطر بیوی اور بیٹے کو گھر سے نکال دیا اور اب وہ باپ کے گھر آ بیٹھی ہے۔ اس صدمے نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ میں بڑے میاں کو تسلی دی۔ گھر واپس آ کر سوچتا رہا کہ اس نجی معاملے میں اس بھلے آدمی کی کیونکر مدد کی جا سکتی ہے۔ کوئی صورت نظر نہ آئی تو ندیم صاحب سے استمداد کی ٹھانی۔ دوسرے روز لاہور جا کر انہیں ساری کتھا سنائی۔ انہوں نے فوراً ہی سرگودھے کے ایک چک کے کسی بڑے زمیندار، ملک صاحب (افسوس کہ ان کا نام بھول چکا ہوں) کے نام رقعہ لکھ دیا۔ میں نے وہ رقعہ بابا غریب عالم کو پہنچا دیا اور خود نچنت ہو کر بیٹھ رہا۔ دو ہفتے بعد اس سے ملاقات ہوئی تو تفصیلات کا علم ہوا۔ بابا رقعہ لے کر ملک صاحب کے گاؤں پہنچا۔ شام کا وقت تھا اور ملک صاحب کسی کام سے شہر گئے ہوئے تھے۔ بابا دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈیرے پر ٹھہر گیا۔ رات گئے ملک صاحب واپس آئے۔ اس نے رقعہ پیش کیا۔ ملک نے تفصیل معلوم کی اور اطمینان دلایا۔ اتفاق سے لڑکی کا سسرالی گاؤں اور ملک صاحب کا گاؤں ایک ہی تھانے کی حدود میں تھے۔ صبح ناشتے کے بعد ملک صاحب نے بڑے میاں کو ساتھ لیا اور جیپ میں تھانے پہنچے۔ وہاں سے پولیس بھیج کر بڑے میاں کے داماد کو بلوایا اور آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ کیا جواب دیتا۔ بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ ملک صاحب نے کہا "خیریت چاہتے ہو تو جا کر اپنی بے قصور بیوی اور بچے کو لے آؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا اور یاد رکھنا کہ وہ غریب عالم کی بیٹی نہیں میری بیٹی ہے" بڑے میاں جب تک زندہ رہے مجھے دعائیں دیتے رہے جو میں ندیم صاحب کی طرف منتقل کر دیتا تھا۔

سنہ ۱۹۸۰ء میں جب دادا جان کی صد سالہ تقریب ولادت منانے کا منصوبہ بنا تو اس کے لیے مجلس یادگار حافظ محمود شیرانی کے نام سے ایک انجمن تشکیل دی گئی، جس کے صدر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب تھے۔ ندیم صاحب کو حکیم نیر واسطی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے ساتھ انجمن کے سرپرست کی حیثیت دی گئی۔ اس کاغذی عہدے کے باوجود عملی طور پر انہوں نے سب سے زیادہ تگ و دو کی اور لاہور، کراچی اور اسلام آباد ایک کر دیے۔

ندیم صاحب کے گہرے دینی پس منظر نے ان کے قدموں میں تمام عمر لغزش نہیں آنے دی ان کی مشہور نعت کا یہ شعر اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے:

پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم　　مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

قول وفعل کی ہم آہنگی ان کا خاصہ رہا۔جس بات کو حق سمجھا اس کا کھل کر اعلان کیا۔اسی بنا پر ان کی شخصیت اور ان کے کلام میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔وہ اپنے دین، اپنے ملک اور اپنی تہذیبی اقدار پر کسی سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔انہوں نے پہلی باقاعدہ نظم مولانا محمد علی جوہر جیسے بطل حریت کی وفات پر کہی تھی، جو سید حبیب کے روزنامہ ''سیاست'' میں شائع ہوئی۔استعمار دشمنی کا یہ وطیرہ تاحین حیات قائم رہا۔دوسری جنگ عالمگیر کے زمانے میں بڑے بڑے نامی گرامی ادیب اور شاعر، ترقی پسندوں اور مذہب پرستوں کی تخصیص سے قطع نظر انگریزی سرکار کی فوج کے شعبہ اطلاعات اور جنگی پروپیگنڈا کے محکمے میں ملازم ہو کر اپنے ہم وطن نوجوانوں کو جنگ کا ایندھن بناتے رہے لیکن ندیم اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے پر آمادہ نہ ہوا۔اسی اصول پرستی کے باعث وہ دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں کی سنگ زنی کا نشانہ بنا:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا　　اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

وہ اپنی خوش اخلاقی کے باعث معمولی لوگوں کی بے ضرر خواہشات کو کبھی رد نہیں کرتے تھے لیکن جب کسی معاملے میں ان کے عقائد پر زد پڑتی تو بڑی سے بڑی شخصیت اور پرانے تعلقات کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ایک واقعہ میرے سامنے کا ہے۔ تاریخ یاد نہیں۔سال غالباً ۱۹۷۴ء ۱۹۷۵ء تھا۔میں مجلس ترقی ادب کے دفتر میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ عبدالکریم چپڑاسی نے آکر اطلاع دی کہ فیض صاحب آئے ہیں۔اتنے میں فیض صاحب کمرے میں داخل ہوئے قاسمی صاحب نے اٹھ کر استقبال کیا۔ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد فیض صاحب نے کہا: ''ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہم روس پاکستان دوستی کی انجمن بنا رہے ہیں۔ آپ اس میں ہمارا ساتھ دیں''۔قاسمی صاحب چند لمحے کے سکوت کے بعد یوں گویا ہوئے: ''فیض صاحب! ابھی تو سقوط مشرقی پاکستان کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور ہمارے ملک کو دولخت کرنے میں بھارت کے بعد سب سے زیادہ حصہ روس کا ہے۔میری غیرت تو یہ گوارا نہیں کرتی کہ میں اس ملک کے ساتھ دوستی تصور بھی کروں، جس کے ہاتھ ہمارے وطن کے خون سے آلودہ ہیں۔'' فیض صاحب یہ جواب سن کو تھوڑی دیر توقف کے بعد اٹھ کر خاموشی سے چلے گئے۔

اسلام اور ہادی اسلام سے ندیم کی محبت کا اندازہ ان کی بلند پایہ نعتوں سے ہوتا ہے جن میں صمیم قلب کے ساتھ اظہار عقیدت کیا گیا ہے۔دنیا طلبی اور ریاکاری کی بنیاد پر ایسے شاہکار وجود میں نہیں آیا کرتے۔''فنون'' کے آخری پرچے میں ان کی پانچ اشعار پر مشتمل ایک مختصر نعت چھپی ہے جس کے شعر ذیل مجھے بے حد پسند ہے:

درون سینہ مدینہ اٹھائے پھرتا ہوں　　کہ ایک پل بھی گوارا نہیں جدائی تری

ندیم صاحب نہایت خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔شعر و ادب صحافت میں ان کے بلند مرتبے نیز ان کے حسن اخلاق کے باعث دفتر ''فنون'' اور مجلس ترقی ادب سے ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔بڑے چھوٹے ہر قسم کے لوگ آتے۔بعض نووارد بلا وجہ وقت کے ضیاع کا سبب بھی بنتے لیکن ان کے ماتھے پر شکن نہ پڑتی۔خندہ پیشانی سے گفتگو کرتے، ہنستے ہنساتے، پرانے دلچسپ واقعات پوری جزئیات کے ساتھ سناتے، ان واقعات کو جمع کرنے سے ایک نہایت دلچسپ کتاب مرتب ہو سکتی تھی۔میں دو ایک پر لطف قصے درج کرتا ہوں۔یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ندیم صاحب رہا ہو چکے تھے اور فیض صاحب ابھی اسیر تھے۔مولانا

حسرت موہانی لاہور آئے ہوئے تھے۔ایک روز ایک ادبی اجلاس میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے غزل کی تین قسمیں بتائیں عارفانہ، عاشقانہ اور فاسقانہ۔اس پر کسی نے سوال کیا کہ مولانا آپ کی غزلیں کون سی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔مولانا نے فوراً جواب دیا ''فاسقانہ''۔

اس سے اگلے روز قاسمی صاحب کو بیگم ایلس فیض کا فون آیا کہ ''میں مولانا کو گھیر گھار کر گھر تو لے آئی ہوں لیکن یہ ہاتھ سے نکل جائیں گے۔آپ فوراً آجائیں تا کچھ دیر تک ان سے باتیں کی جاسکیں۔'' یہ پہنچے تو مولانا فیض صاحب کے پر تکلف ڈرائنگ روم میں فرش پر پھسکڑا مارے بیٹھے تھے۔بیگم فیض مولانا کو ان کے حوالے کر کے چائے وغیرہ کا انتظام کرنے گئیں۔دونوں صاحبان کے درمیان سلام کے تبادلے کے بعد مکالمے کا آغاز ہوا مولانا نے اپنی باریک سی آواز میں پوچھا:

''آپ کی تعریف؟''

''جی مجھے احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں۔''

مولانا (کچھ سوچتے ہوئے) ''تم شاعر ہو!''

''جی ہاں کچھ کہہ لیتا ہوں۔''

''تو پھر سناؤ''

''مولانا! میں شاعر ہوں لیکن آپ کے سامنے سنا نہیں سکتا آپ سے سننا چاہتا ہوں۔''

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تم سناؤ ہم بھی سنائیں گے۔''

قاسمی صاحب کے ذہن میں ایک دن پہلے کی ''فاسقانہ'' والی بات تازہ تھی چنانچہ بقول کو اسی زمرے کی ایک غزل سنانے لگے جس کا مطلع ہے:

شام کو صبح چمن یاد آئی　　کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

مولانا دھیرے دھیرے جھومتے رہے۔جب یہ شعر پڑھا گیا کہ:

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط　　اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی

تو مولانا چونک کر بولے ''یہ شعر تم نے کیسے کہہ لیا'' قاسمی صاحب استعجاب آمیز استفہامیہ نظروں سے مولانا کو تکنے لگے۔مولانا نے ذرا توقف کے بعد کہا ''یہ تو ہمیں کہنا چاہیے تھا۔'' یہ واقعہ سن کر میں نے قاسمی صاحب سے عرض کیا کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کو اس سے بڑا خراج تحسین پیش نہیں کر سکتا۔

منٹو کی بے خودی و ہوشیاری کا ایک واقعہ بھی دلچسپ ہے۔جگر مراد آبادی لائل پور کا ٹن مل کے مشاعرے سے فارغ ہو کر لاہور آئے تو ان کے اعزاز میں ایک عشائیے کا اہتمام ہوا۔بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ منٹو بھی موجود تھے۔پایان مستی کا عالم تھا۔اثنائے گفتگو ان کا فن زیر بحث آیا۔جگر صاحب کہنے لگے ''منٹو صاحب تو افسانے کے گورو ہیں۔'' منٹو نے یہ فقرہ سنا تو میز کی دوسری طرف سے ہاتھ بڑھا کر جگر صاحب کی ڈاڑھی تھام لی اور بولے ''یہ گورو نانک کے ہوتے ہوئے مجھے گورو کیوں کہا جا رہا ہے؟۔''

طالب آملی کا شمار مغلیہ دور کے سربرآوردہ شعرا میں ہوتا ہے۔اس وقت تک اس کا دیوان مرتب نہ ہوا تھا۔میں نے اس کی

تدوین کا ارادہ کیا۔دیوان طالب آملی کا ایک قلمی نسخہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے پاس بھی تھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔قاسمی صاحب سے ذکر کیا تو وہ ایک سہ پہر کو صوفی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔صوفی صاحب کے ''شغل'' کا وقت تھا۔انہوں نے دو گلاسوں میں تھوڑا تھوڑا مشروب ڈال کر ایک قاسمی صاحب کی طرف بڑھایا۔انہوں نے کہا ''صوفی صاحب! آپ کو پتہ ہے کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔''صوفی صاحب بولے ''بہت اچھا کرتے ہو۔یہ کمبخت بڑی بری چیز ہے۔ایک بار منہ لگ جائے تو جان نہیں چھوڑتی۔'' ساتھ ہی دونوں جام چڑھا گئے۔جب ذرا سرور ہوا تو دوسری بار دو پیگ تیار کیے۔قاسمی صاحب کو صلا کی۔انہوں نے پہلے والا جواب دیا۔صوفی صاحب کہنے لگے ''کمال ہے۔تم شاعر ہونے کے باوجود اس سے اجتناب کرتے ہو۔بھئی دنیا میں ایک ہی تو نعمت غیر مترقبہ ہے.....۔''

قاسمی صاحب نے کہا ''حضرت! ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ کہہ رہے تھے کہ اس سے بچنا بڑی اچھی بات ہے۔''صوفی صاحب نے بڑے استعجاب سے پوچھا ''یہ بات میں نے کہی تھی؟'' قاسمی صاحب نے اثبات میں جواب دیا تو صوفی صاحب بولے ''میں ایسی غلط بات کہہ ہی نہیں سکتا۔کتابت کی غلطی ہو گئی ہوگی۔''

میں نے اپنے غیر معروف لوگوں پر لکھے گئے، خاکوں کے مجموعے کا نام ''بے نشانوں کا نشاں'' رکھا تو اس ضمن میں قاسمی صاحب سے مشورہ طلب کیا۔سن کر مسکرائے اور بولے ''مظہر بھائی! اگر کتاب کا کوئی اچھا نام سوجھے تو جب تک کتاب چھپ نہ جائے، کسی کو بتانا نہیں چاہیے۔'' پھر یہ پرانا قصہ سنایا کہ ''ایک بار میرے افسانوں کا ایک مجموعہ چھپ کر تیار تھا لیکن کوئی اچھا نام نہیں سوجھ رہا تھا۔اتفاق سے انہی دنوں اے۔حمید صاحب آئے اور کہنے لگے کہ میں نے اپنے کہانیوں کے تازہ مجموعے کا نام ''درودیوار'' تجویز کیا ہے اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا: ''بہت اچھا نام ہے۔'' کچھ دیر بعد اے۔حمید صاحب اٹھ کر گئے تو میں فوراً اپنے ناشر کے پاس پہنچا اور کہا کہ میری کتاب کا نام ''درودیوار'' رکھ دو۔کتاب چھپ گئی۔اس کے بعد اے۔حمید صاحب سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے۔قاسمی صاحب! یہ آپ نے کیا کیا؟ میں نے کہا: یہ آپ کو سبق سکھایا گیا ہے کہ اچھے نام کی ایک راز کی طرح حفاظت کرنی چاہیے۔امید ہے آئندہ آپ محتاط رہیں گے۔''

لطائف بیان کرنے میں کمال حاصل تھا۔ان کی صحبت میں بیٹھ کر وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔قتیل شفائی صاحب اور ان کے بعد عطاالحق قاسمی صاحب کی موجودگی میں تو محفل پورے جوبن پر ہوتی۔اس طرح اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے کہا ہے:

ایک ہے چھوٹا قاسمی، ایک بڑی سرکار　　روز جمائیں محفلیں، روز سجے دربار

مجھ پر ان کا لطف و کرم تو ہمیشہ رہا۔ایم۔اے فارسی کے نصاب کی چند کتابیں بازار میں دستیاب نہیں تھیں۔اس وقت کا تذکرہ میں نے ان سے کیا تو انہوں نے اپنے ذاتی مجموعے سے بعض کتابیں مجھے عطا کر دیں۔ان میں ایس۔ایم۔اکرام صاحب کا مرتبہ انتخاب ''ارمغان پاک'' بھی تھا۔اس پر پنسل سے انگریزی میں یہ عبارت درج ہے:

"Passed by D.I.G.,C.I.D.vide letter no.7941 A.I.S.B dated 31-05-1951　Sd."

گویا یہ ان کتابوں میں شامل تھی جو ان کی سیفٹی ایکٹ کے تحت (مئی تا نومبر ۱۹۵۱ء) اسیری کے دوران انہوں نے گھر سے منگوائی تھیں۔

مزید برآں انہوں نے مجھے اجازت دے رکھی تھی کہ ان کی ذاتی کتابوں میں سے جو بھی درکار ہو میں بلا تکلف لے سکتا ہوں۔ میرے پسندیدہ ترین فارسی غزل گو نظیری کا ایران میں مطبوعہ دیوان، صادق نسیم صاحب نے ۲۸۔اگست ۱۹۶۳ء کو کوئٹہ میں انہیں پیش کیا تھا۔ یہ بھی انہوں نے میرے حوالے کر دیا۔ طالب آملی کا ضخیم کلیات میرے ایرانی دوست آقای طاہری شہاب نے مرتب کر کے شائع کر دیا اور اس کا ایک نسخہ مجھے بھی بھیجا۔ لہٰذا میں اس کی تدوین کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ اتفاق سے جنوری ۱۹۶۹ء کے اوائل میں قاسمی صاحب کا پشاور جانا ہوا۔ وہاں ان کے کسی ارادت مند نے ایک نفیس قلمی نسخہ ان کے نذر کیا۔ یہ نظیری اور طالب آملی کے کلام کا طویل انتخاب ہے جو طالب آملی کے عین حیات کیا گیا تھا۔ معطی نے ۹۔جنوری کو اس پر یہ الفاظ لکھے:

''بڑی ہی عقیدت اور خلوص کے ساتھ جناب ندیم کی خدمت میں'' (دستخط ناخواناں ہیں) قاسمی صاحب نے واپس لاہور آ کر چند دن بعد ہی یہ قیمتی نسخہ درج ذیل عبارت لکھ کر مجھے عنایت کر دیا:

''برادر عزیز و مکرم مظہر محمود شیرانی کی نذر۔۔۔۔ کہ یہ گراں بہا مجموعہ ان کی تحویل میں رہے گا تو مجھے اطمینان ہوگا کہ اسے صحیح مقام ملا۔ احمد ندیم ۱۴۔جنوری ۱۹۶۹ء''

اس کے علاوہ وہ میری حوصلہ افزائی کا فریضہ بھی بجا لاتے تھے۔ بعض شخصیات پر میرے تحریر کردہ مضامین انہوں نے ''فنون'' کے مختلف شماروں میں شائع کیے۔ جب یہ ختم ہو گئے تو ۳۰۔نومبر ۱۹۸۱ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''جس کام میں آپ مصروف ہیں وہ یقیناً نہایت اہم ہے۔ وہ مکمل ہو لے تو اس کردار نگاری کی طرف توجہ دیجیے جس کے چند خوبصورت نمونے فنون میں درج ہو چکے ہیں۔''

بعض اوقات وہ اپنے نجی معاملات میں بھی مجھ سے مشورہ طلب کر لیتے تھے جو میں اپنی بساط کے مطابق پیش کر دیتا تھا۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں حکومت پاکستان نے انہیں ستارہ امتیاز دینے کا اعلان کیا۔ وہ فوجی حکومت سے ایوارڈ لینے میں متردد تھے۔ ایک روز میں حاضر خدمت ہوا تو اتفاق سے کوئی اور شخص موجود نہ تھا۔ کہنے لگے ''آپ بڑے موقع سے آئے ہیں۔ ایک اہم معاملے میں آپ سے صلاح لینی ہے۔'' جب اصل بات بتائی تو میں نے تعجب سے پوچھا ''آپ اس بارے مجھ سے مشورہ طلب کر رہے ہیں؟'' بولے ''جی ہاں! آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دیتا ہوں۔'' میں کچھ دیر خاموش رہا پھر ہمت کر کے عرض کیا ''یہ ایوارڈ آپ اپنے ملک کے سربراہ سے ہی وصول کریں گے نا، جس کو برسر اقتدار لانے میں آپ کا کوئی دخل نہ تھا۔ لوگ تو دشمن ملکوں سے بھی انعام حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر آپ انکار کر دیں گے تو اس کے نتائج پر بھی غور کر لیجیے۔ اب وہ جوانی کا دور نہیں ہے جب آپ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے قابل تھے۔ اگر خود پر نہیں تو اپنے گھر والوں، عزیزوں اور محبوں پر رحم کیجیے۔ زندگی میں کبھی ایمان کے تیسرے درجے پر بھی اکتفا کرنی پڑتی ہے۔'' میری گزارشات سن کر بولے ''میرے اہل خانہ کا بھی یہی مشورہ ہے جو آپ نے دیا ہے۔'' غرض انہوں نے ایوارڈ وصول تو کر لیا لیکن طوعاً و کرہاً۔

زندگی کے آخری برسوں میں ندیم صاحب کو دمے کے مرض نے بڑی اذیت دی۔ اس کے باوجود ان کا حوصلہ قابل داد تھا۔ وقفے وقفے سے اسپتال میں داخل ہونا پڑتا جہاں خاص قسم کے انجکشن لگائے جاتے۔ اس سے وقتی طور پر طبیعت سنبھل جاتی اور وہ اپنے

فرائض منصبی ادا کرنے پر مستعد ہو جاتے۔ وہ اپنے بلند اخلاق کے باعث ملاقاتیوں کا اٹھ کر استقبال کرتے تھے۔ میرے ساتھ بھی یہی سلوک مرعی رکھتے۔ آخر آخر میں علالت کے سبب اٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی تو میں ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی لپک کر ان کا ہاتھ تھام لیتا اور اٹھنے نہ دیتا تھا۔ ثقل سماعت بھی لاحق ہو گیا تھا جس سے فون پر گفتگو ممکن نہ رہی۔ ہاں ضرورت پڑنے پر خط لکھ دیتے تھے۔ ''فنون'' کے شمارہ ۱۲۴ میں میرا مضمون ''دیا کہاں گئے وے لوگوا'' چھپا تو اس کا ایک پورا صفحہ غائب تھا۔ اس پر انہوں نے ۳۰ جولائی ۲۰۰۵ء کو مجھے معذرت کا خط لکھا اور رہ جانے والے صفحے کی نقل طلب کی تا کہ آئندہ شمارے میں شائع ہو سکے۔ میں نے خط کا جواب دینے کی بجائے خود حاضری دینا مناسب سمجھا۔ ماہ اگست میں دوبار جانا ہوا لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر ان کا ۳۔ ستمبر کا تحریر کردہ مکتوب ملا۔ لکھا تھا:

''برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون ایک عریضہ بھجوا چکا ہوں جس میں آپ کے کرداری خاکے کے صفحات غلط جڑنے کی معذرت کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر آئندہ شمارے میں وضاحت کرنا چاہیں تو مجھے اپنی تحریر بھجوا دیں۔ اسے ہر صورت میں درج کروں گا۔'' خط کے آخر میں یہ فقرے تھے جنہیں پڑھ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں: ''میری صحت بدستور ہے مگر مقابلہ کیے جا رہا ہوں۔ دیکھئے کب تک؟''

''فنون'' کے اگلے پرچے میں انہوں نے میرے مضمون کا چھوٹ جانے والا حصہ شائع کیا اور ''حرف اوّل'' میں بدیں الفاظ معذرت کی: ''فنون'' شمارہ ۱۲۴ میں ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کی کردار نگاری کے ایک موضوع ''دیا کہاں گئے وے لوگوا'' کی کاپیاں جوڑنے میں پیسٹر سے ایک کوتاہی ہو گئی جس کی وجہ سے متذکرہ مضمون کو گزند پہنچا۔ اس کے لیے ادارہ فنون، قارئین کرام اور ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی سے معذرت کے ساتھ درج ذیل تحریر کے ذریعہ اس فروگذاشت کے ازالے کی کوشش کر رہا ہے۔'' اس کے ذیل میں وہ باقی ماندہ حصہ درج کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ فنون کا صرف ایک اور شمارہ (نمبر ۱۲۶) نکال پائے جو نومبر ۲۰۰۵ سے مارچ ۲۰۰۶ تک کے عرصے پر محیط تھا۔

اپریل سے جولائی ۲۰۰۶ء کے اوائل تک کے تین ماہ امید و بیم کی کیفیت میں گزرے۔ بالآخر ۱۰۔ جولائی کی صبح کو وقت موعود آ پہنچا اور یہ بلبل شیریں مقال اپنی منزل کو پرواز کر گیا۔

ندیم بھائی جان نے پہلی ملاقات سے لے کر دم واپسیں تک مجھے اتنا پیار دیا اور میرے ایسے ناز اٹھائے کہ کوئی حقیقی بڑا بھائی تو کیا شاید باپ بھی بیٹے کے نہ اٹھاتا ہو۔ ان سے میرے نیازمندانہ اور برادرانہ مراسم کا شجر سایہ دار کوئی نصف صدی تک سرسبز و شاداب رہا۔ ان کے جانے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں کھونٹ اندھیرا چھا گیا ہو۔ اس روز جب میں نے آخری بار ان کا چہرہ دیکھا تو بے اختیار امیر خسرو کا وہ دوہا یاد آیا، جو انہوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے وصال کے بعد کہا تھا:

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس　　چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

میرے والد محترم ۔۔ محمد اکرم

عارفہ محمود

جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو ہمارا گھرانہ ایک بھرا پُرا خاندان تھا، ہم آٹھ بہن بھائی اپنی عمروں کے لحاظ سے دوستی، محبت اور پیار کے ایسے قلبی اور صلبی بندھنوں میں جڑے ہوئے تھے کہ کبھی ایک دوسرے سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ بچپن کی معصومیت اور لڑکپن کی شرارتوں سے گزر کر ذمہ دار افراد بننے کی کوششوں میں تھے۔ ہماری امّی نہایت شفیق، عالی ظرف، انتہائی سلیقہ مند، با ذوق اور خوش مزاج ہستی تھیں۔ سارا خاندان ان کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ میرے والد۔۔۔ ان کے لیے لکھتے ہوئے میرا قلم کسی انجانے رعب کی وجہ سے تھرتھرا رہا ہے۔ میرے بچپن کی یادوں میں وہ پورے خاندان کے اوپر ایک بلند اور عظیم ہستی تھی جن کے رعب اور دبدبے سے ایک دنیا کانپتی تھی۔ بلند و بالا قد، انتہائی مناسب اور صحت مند جسم، چہرہ پر کشش، رنگ چمکتا ہوا گندمی، آنکھیں عقابی ایک خاص چمک لیے ہوئے۔ غرض کہ مردانہ ذہانت کی مثالی شخصیت تھے۔ گھر کے رکھ رکھاؤ کے معاملے میں اور لباس کے انتخاب میں بہت با ذوق اور شوقین، ان کے وارڈ روب میں بے شمار ٹھنڈے اور گرم سوٹ ٹنگے ہوئے تھے۔ ٹائیوں کے پلندے کے پلندے ہوتے تھے قمیص کے کالروں کے ڈبے کے ڈبے ہوتے تھے۔ ان دنوں مردانہ قمیضوں کے detached کالروں کا فیشن تھا۔ ایک الماری تھی جس میں ان کی ٹوپیاں، طرح طرح کے ہیٹ اور پگڑیاں، لنگی، ترکی ٹوپی، جناح کیپ pegs پر رکھی رہتی تھیں۔ روزانہ لباس کی مناسبت سے انھیں لیا کرتے تھے۔ صبح نو دس بجے وہ غسلخانہ سے تیار ہو کر نکلتے اور اپنے کمرے میں آتے۔ سر میں یا رڈلے کی ہیئر ویزلین لگاتے تو سارے کمرے میں اسکی بھینی بھینی خوشبو پھیل جاتی۔ پھر وہ زوردار آواز میں میری امّی کو آواز دیتے۔ مریم، میری امی اسی دم حاضر ہو جاتیں۔ پھر وہ ان کے سامنے ذرا جھک کر کھڑے ہو جاتے۔ میری امی ان کی مانگ نکالتیں اور بالوں میں کنگھی کرتیں۔ وہ کبھی شیشے کے آگے کھڑے ہو کر خود کنگھی نہیں کرتے تھے اور ان کا یہ طریقہ اسّی نوے سال کی عمر تک یونہی رہا۔ پھر ان کو ٹائی باندھتیں، کوٹ اور واسکٹ پہناتیں اور خوبصورت سی چین والی گھڑی جیب میں ڈالتیں۔ چین لگاتیں، عینکیں ان کے سپرد کرتیں، پھر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے اور چھوٹے ملازم لڑکے کو آواز دیتے جو آ کر انہیں بوٹ اور جرابیں پہناتا اور پھر کھڑے ہو کر تسمے خود باندھتے۔ میں چونکہ ماں باپ کی سب سے چھوٹی اولاد تھی، اس لیے امّی کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔ میں پاس کھڑی ان کی خوبصورتی، خوش لباسی اور چاہت سے متاثر اور مرعوب ہوتی، اکثر وہ مجھے گود میں اٹھا لیتے اور چہرے پر پیار کرتے تو مجھے ان کی مونچھیں، کلین شیو چہرہ چبھتا ہوا محسوس ہوتا۔ میں خوش بھی بہت ہوتی لیکن گھر آ کر جلدی سے ان کی گود سے اتر جاتی۔ اور یوں وہ تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ کر کچہری چلے جاتے۔ جتنی دیر وہ گھر

میں رہتے، نوکر چاکر سب مؤدب اور سہمے ہوئے رہتے۔ جونہی ان کی گاڑی روانہ ہوتی گھر میں شور شرابہ شروع ہو جاتا۔ ملازم بھاگ دوڑ رہے ہیں، ہمسائے آ رہے ہیں، جا رہے ہیں، صبح کے پہر ہنگامہ عروج پر ہوتا۔ اس لیے بھی کہ ہم سب بہن بھائی گھر پر ہی ہوتے تھے۔ کوئی سکول کالج نہیں جا رہا ہوتا تھا۔ کیونکہ جب تک میرے دادا حیات رہے، یعنی تیس کی دہائی تک، تو وہ لڑکیوں کو سکول بھیجنے کے حق میں نہیں تھے۔ والد صاحب نے ایک کرسچین ٹیچر رکھی ہوئی تھی، آئی وی۔ اس کا نام تھا۔ وہ دن رات ہمارے گھر میں ہی رہتی تھی کھاتی، پیتی، اٹھتی، بیٹھتی، سب کے ساتھ ہی رہنے کے لیے اس کو علیحدہ کمرہ دیا ہوا تھا۔ شام کو ایک لیڈی پروفیسر مسز الیاس آتی تھیں جو اور مضامین پڑھاتی تھیں۔ دادا کے وفات کے بعد بھی سب کی تعلیم گھر پر ہی جاری رہی۔ والد صاحب کے سیاسی اہداف کی وجہ سے میری امی بچوں کو کسی چھوٹے موٹے سکول میں داخل نہیں کروانا چاہتی تھیں اور اگر انگریزی سکولوں میں بچے جاتے تو والد صاحب پر اعتراض ہوتا تھا کہ اپنے بچوں کو انگریزوں کے سکولوں میں پڑھا رہے ہیں۔ میرا بھائی مسعود سینٹ اینتھونی سکول جاتا تھا، تو لوگوں نے بہت برا مانا۔ اس چیز کو مٹانے کے لیے مجھے چھاؤنی کے مڈل اسلامیہ سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس سکول میں میرا بڑا مقام تھا کہ یہ اکرم صاحب کی بیٹی ہے۔ سب بچے ٹاٹوں پر، ڈیسکوں کے آگے بیٹھتے اور میرے لیے ٹیچرز کے برابر کرسی بچھائی جاتی۔ مجھے یہ دل میں بہت برا لگا کرتا تھا۔ یہ تیسری جماعت تھی اور چوتھی جماعت میں میں نے خود انکار کر دیا کہ میں علیحدہ کرسی پر نہیں بیٹھوں گی۔ میری چاروں بڑی بہنوں نے میٹرک تک تعلیم گھر پر ہی پوری کی۔ تقسیم ہند کے بعد کالج جانا شروع کیا اور بڑے بھائی نے آٹھویں جماعت تک گھر پر ہی پڑھا۔ میں پانچویں میں لیڈی میکلیگن سکول لاہور میں چلی گئی جہاں میری بہن سلمیٰ میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔

جب عمر رفتہ کو آواز دیں تو خیالات اور واقعات کی گھنگھور گھٹائیں یوں امڈ امڈ کر آتی ہیں، جیسے ابھی برسنے کو تیار ہوں۔ والد صاحب کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں اگر انصاف سے لکھا جائے تو شائد پوری "قیدِ یاغستان" اور بن جائے۔ ان کی بھرپور زندگی کو دیکھتے ہوئے کئی دفعہ دل چاہا کہ کچھ لکھوں لیکن میرے اپنے اندر نہ وہ صلاحیت تھی اور نہ ہی قابلیت۔ اب ایک ایسی بزرگ ہستی کی خواہش پر جو میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے اور اس حکم کو میں اپنے لیے بڑا اعزاز اور سرمایۂ حیات سمجھتی ہوں، قلم اٹھانے کی جسارت کر رہی ہوں، اللہ تعالیٰ اس بجا آوری میں میرے مددگار ہوں، آمین!

والد محترم کی تاریخ پیدائش ۱۴ ستمبر ۱۸۸۸ ہے۔

ان کے والد یعنی میرے دادا گوجرنوالہ شہر کے بڑے نامی گرامی، عالم، صوفی، طبیب، مفتی، شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی زندگی کے حالات اور فارسی شاعری کے نمونے آج بھی لاہور کے میوزیم کی قلمی کتب کی لائبریری میں "تاریخ قریش" کے عنوان کے تحت اور ڈاکٹر ظہور الدین کی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب" کے ایک باب میں موجود ہیں۔ خاندان کا شجرہ نسب بھی ہمیں وہاں سے ملا۔ والد صاحب نے جب "قیدِ یاغستان" لکھی تو میاں جی (ہمارے دادا) نے ایک کتاب کی پوری کتابت خود اپنے ہاتھ سے کی۔ والد صاحب کو بھی اپنے والدین سے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی۔

والد محترم نے لاہور کے میو سکول آف آرٹس سے (جو آجکل N.C.A کہلاتا ہے) انجینئرنگ میں ڈپلوما لے کر M.E.S میں سروس شروع کی اور پھر اس سروس میں ہی پشاور میں تعیناتی کے دوران ۱۹۱۰ء میں فراریوں کے ہاتھوں گرفتاری کا مشہور زمانہ واقعہ

پیش آیا۔ رہائی کے بعد ان کی تبدیلی فیروز پور شہر میں ہوئی (حالیہ ہندوستان کا شہر) وہاں سے ایک ڈیڑھ سال کے بعد لاہور آ گئے۔ یہاں پر ان کی ملاقات اور دوستی محترم شیخ رحمت اللہ صاحب سے ہوئی۔ ان دنوں تحریک آزادی کا آغاز تھا۔ ان دونوں نے ملّی جذبے کے تحت ملازمتیں چھوڑ کر اپنا ذاتی کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ والد صاحب کی ملازمت چھوڑنے کی یہ بھی وجہ تھی کہ وہ گرفتاری کے بعد محسوس کرتے تھے کہ ملازمت کی پابندیاں اب ان سے برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ محترم شیخ رحمت اللہ صاحب سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ وہ انتہائی باذوق، حلیم اور خوش مزاج انسان تھے۔ دونوں کی دوستی اتنی پرخلوص اور گہری تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ سگے بھائیوں کے رشتے میں ڈھلتی گئی۔ لوگ میرے والد کو بھی شیخ اکرم ہی کہتے تھے حالانکہ وہ ذات کے صدیقی تھے اور آج بھی سب انہیں شیخ اکرم کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ محترم شیخ رحمت اللہ صاحب میرے والد سے بڑے تھے۔ ایک دوسرے کو بھائی جان کہتے تھے دونوں کی محبت اور خلوص بے مثال تھا۔ ایک دوسرے کی عزت دل و جان سے کرتے تھے۔ دونوں خاندانوں کے بھی آپس میں نہایت خلوص اور محبتوں والے تعلقات تھے۔ ساتھ کی خوشیاں، اکٹھا بیٹھنا اٹھنا، ہر وقت کا آنا جانا، دونوں کے بیوی بچوں کے آپس میں بہت محبت اور پیار والے قریبی تعلقات تھے۔ اس زمانہ میں ان محبتوں اور قربتوں کے رشتوں کو نہ کوئی جان سکتا ہے نہ پہچان سکتا ہے۔ دونوں کا کاروبار اکٹھا تھا اور جائداد بھی اکٹھی تھی۔ میرے والد کی جائداد تو کوئی اتنی زیادہ نہ تھی مگر محترم شیخ صاحب بہت بڑی جائداد کے مالک تھے۔ وہ لاہور کی نامور شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ چھاؤنی کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں دونوں کی بہت عزت اور احترام کیا جاتا تھا۔

والد صاحب چونکہ بنیادی طور پر انجینیر تھے اس لیے سارا کام وہی سنبھالتے تھے۔ وہ زیادہ تر عمارتیں بنواتے تھے۔ لاہور چھاؤنی کی بڑی عمارتیں بشمول والٹن ایروڈروم کے انہی کی بنوائی ہوئی تھیں۔ آگے ٹھیکیدار رکھے ہوئے تھے جن سے کام کروایا کرتے تھے۔ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں انہوں نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ میری امی بتاتی تھیں کہ مالی خوشحالی اتنی تھی کہ لوہے کا ایک صندوقچہ تھا، جو سونے کے سکوں سے بھر جاتا تھا۔ پھر الٹ کر سارا لے جاتے۔ اس طرح یہ صندوقچہ کئی دفعہ بھرا اور کئی دفعہ خالی ہوا۔ اسی میں سے میری امی زیور بھی بنواتی تھیں۔ ان دنوں سونا ڈھائی روپے تولہ تھا۔ اور یہ دور والد صاحب کی زندگی کا بھی سنہری دور تھا۔ پرعزم اور پرکشش جوانی، بھرپور صلاحیتیں، قدردان اور محبتیں کرنے والے لوگ، عزت و شہرت انکے قدموں میں تھی۔ لاہور چھاؤنی کے تمام انگریز افسران کی شرافت، لیاقت اور شخصیت کی وجہ سے ان کی بہت عزت و احترام کرتے تھے۔ وہ کنٹونمنٹ کے آنریری مجسٹریٹ میونسپل کمشنر اور کنٹونمنٹ بورڈ کے سینئر ممبر بنے جبکہ ابھی ان کی عمر چھوٹی ہی تھی۔ ۱۹۲۰ یا ۲۱ کا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ انگریز کی ایک خاص صفت یہ تھی وہ آدم شناس قوم تھی اور جس کی عزت کرتے تھے دل سے کرتے تھے۔ والد صاحب کے ان سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس لیے آرمی ہیڈ کوارٹر میں ان کا بلا جھجک آنا جانا رہتا تھا۔ ان کو کبھی کسی نے روکا ٹوکا نہ تھا۔ یہ ان کے لیے بڑا اعزاز تھا کیونکہ اس زمانے میں فوجی تنصیبات اور دفاتر کے قریب کسی ہندوستانی کو پھٹکنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ایک دن اپنے کسی کام کے سلسلے میں آرمی ہیڈ کوارٹر میں کرنل سے ملنے گئے، تو داخلے کے وقت ایک فوجی سپاہی نے انہیں روکا کہ اپنی شناخت کروائیں۔ انہوں نے بتایا کہ میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں، میری کبھی کسی نے شناخت نہیں مانگی۔ اس نے کچھ بدتمیزی سے بات کی تو

والد صاحب نے تڑاخ سے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ بس پھر کیا تھا آرمی ہیڈ کوارٹرز میں زلزلہ سا آ گیا۔ اس زمانے میں ایک انگریز فوجی سپاہی کا مقام آج کل کے کرنل سے کچھ اوپر ہی ہوتا تھا۔ والد صاحب نے کہا کہ میرے ساتھ کوئی اور بدتمیزی نہ کرنا، سیدھا کرنل صاحب کے سامنے لے چلو۔ والد صاحب نے خود مجھے سارا واقعہ سنایا اور ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ دل میں تو میں تھوڑا خوفزدہ تھا کہ ایسی باتوں پر یہ ہندوستانیوں کو گولی سے اڑا دیا کرتے تھے، بہر کیف بتانے لگے کہ جب میں کرنل صاحب کے پاس پہنچا تو اس نے ہنس کر معاملہ ٹال دیا اور فوجی سپاہی اپنا منہ لے کر رہ گیا۔ بعد میں اس کرنل نے والد صاحب سے معذرت کر لی۔ انگریز افسروں کے ساتھ ان کی گہری دوستیاں تھیں۔ اکثر ہمارے گھر ان کی بڑی پر تکلف ضیافتیں ہوا کرتی تھیں۔ جن کے لیے گھر میں اہتمام اور گہما گہمی ہوا کرتی تھی۔ کرنل لٹن جنہوں نے تقسیم کے بعد بھی اسلام آباد بنانے میں اور لاہور میں بھی کئی عمارتیں بنانے میں کافی حصہ لیا ان سے بھی والد صاحب کی بڑی بے تکلف اور گہری دوستی تھی۔ پاکستان بن جانے کے بعد وہ ہمیشہ نئے سال کا خوبصورت کارڈ بھیجتے اور خط کتابت بھی کرتے تھے۔

۱۹۱۸ء کے لگ بھگ اپنی زندگی کا ایک اور واقعہ سنایا کرتے تھے جو بہت مشہور ہوا۔ والد صاحب اپنی گاڑی میں بچوں کو لے کر اپنے بھائی کے ہاں لاہور کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں نیپیئر بیریکس کے قریب (حالیہ طفیل روڈ پر) ایک حادثہ رونما ہوا۔ بیریکس میں سے ایک سکھ ایک انگریز خاتون کو خنجر سے قتل کر کے باہر نکل کر بھاگ رہا تھا۔ انگریزی آرمی کے بہت سے سپاہی اس کے پیچھے بھاگے۔ میرے والد نے بھی بچوں سمیت گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کی اور ایک سپاہی سے بندوق لے کر اس سکھ کے پیچھے بھاگے۔ کافی دیر کے بعد ناکام لوٹے۔ وہ سکھ اس وقت تو نہ پکڑا جا سکا بعد میں شائد پکڑا گیا۔ میری بڑی بہن بتاتی ہیں کہ جونہی والد صاحب بندوق لے کر بھاگے تو آرمی کے دو انگریز سپاہی ہماری گاڑی کے دائیں بائیں اس وقت تک پہرہ دیتے رہے جب تک کہ والد صاحب واپس نہیں آئے۔ اس زمانے میں ساری چھاؤنی خاص کر انگریز افسروں میں والد صاحب کی اس بہادری اور دلیری کا بہت چرچا رہا اور وہ تو پہلے ہی والد صاحب کے بہت مداح تھے۔ جب لوگ ان سے پوچھتے کہ آپ سکھ کے پکڑنے میں ان کی مدد کیوں کرنا چاہتے تھے حالانکہ اس نے تو انگریزوں کی غلامی کے خلاف نفرت کا اظہار کر کے اچھا کام کیا تھا تو وہ بہت خفا ہوتے اور کہتے کہ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم معصوم لوگوں کو قتل کرتے پھریں اور وہ بھی عورتوں کو۔

وہ اپنی بے پناہ متحرک اور پر کشش شخصیت کی وجہ سے لاہور چھاؤنی کے چوٹی کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ اس زمانے میں کنٹونمنٹ کے علاقے میں کسی سول آدمی کو اپنی جائداد بنانے کی اجازت نہ تھی لیکن ان کی دو کوٹھیاں چھاؤنی میں تھیں۔ ایک ۳۳ نمبر کی کوٹھی سیٹ جان روڈ (حال عزیز بھٹی روڈ) پر تھی جو ۱۹۲۳ء میں انہوں نے تین ہزار اور تین سو میں بیچ دی۔ اس وقت سونے کا بھاؤ پانچ روپے تولہ تھا۔ اس کوٹھی کی زمین ۶۰ کنال تھی۔ دوسری کوٹھی ۵۷ نمبر جو آجکل کی عابد مجید روڈ کے قریب تھی۔ پھر سینٹ جان بلڈنگ تھی جسے آجکل راحت بلڈنگ کہتے ہیں۔ ایک موٹر ورکشاپ بھی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں بھائیوں نے مل کر چھاؤنی میں انگریزوں کی فرمائش پر ایک بڑا شاندار سینما گھر بھی بنایا۔ میرے دادا نے ان کی یہ بات بالکل پسند نہ فرمائی۔ بڑا شاندار سینما تھا۔ پرنس آف ویلز جب ہندوستان آیا تو اس نے بھی یہاں فلم دیکھی تھی جس کا بہت چرچا ہوا۔ اس سینما میں صرف انگریزی کی مشہور فلمیں

لگا کرتی تھیں اور صرف گورے ہی سینما دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کے لیے اجازت نہ تھی۔ والد صاحب نے مینیجر رکھا ہوا تھا جو سب کام سنبھالتا تھا۔ جب کبھی لارل اینڈ ہارڈی کی یا بچوں والی فلم لگتی تو والد صاحب ہمیں بھی لے جاتے۔ ہمیں وہاں VIP والی خاطر تواضع ملتی۔ اوپر صوفوں پر بٹھایا جاتا۔ آئس کریم وغیرہ پیش کی جاتی۔ اس زمانے میں اس سینما کا ڈسپلن بھی ناقابل فراموش تھا۔ مجھے یاد ہے کہ سینما ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا۔ تمام سپاہی نچلی سیٹوں پر اور آفیسر اوپر صوفوں پر بیٹھتے۔ دوران فلم اس قدر خاموشی ہوتی کہ ہم بچوں کو سرگوشی تک کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی سرگوشی بھی کرتا تو وہ بہت بڑی بدتمیزی سمجھی جاتی تھی اور سرگوشی کی آواز بھی بہت گونجتی تھی۔ وہاں تو ایسی خاموشی ہوتی کہ ایسا لگتا تھا کہ سارے ہال میں کوئی ہے ہی نہیں۔ کوئی سرسراہٹ یا حرکت بھی معیوب ہوتی تھی۔ جب انٹرول ہوتا، بتیاں جلتیں تو لوگ سگریٹ پینے یا کچھ کھانے پینے کے لیے ہال سے باہر چلے جاتے۔ انٹرول میں بھی وہ آپس میں صرف سرگوشی سے بات کرتے۔ گورے اور ان کی بیویوں کی آہستہ آہستہ آوازیں، ایک دوسرے کے کانوں میں بات چیت، دبے دبے قہقہے، سگریٹوں کی جلتی بجھتی روشنیاں مگر جونہی بتیاں جل جاتیں ایسے جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ مدھم ہو کے ختم ہو جائے۔ یوں لگتا جیسے سارے ہال کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ کمال کا ڈسپلن تھا اس قوم میں۔ ایسے ہی تو نہیں دو سو سال حکومت کر گئے۔ سینما کا نام گلوب سینما تھا۔ تقسیم ہند سے کچھ دیر پہلے اس میں ہفتہ وار اردو فلمیں بھی لگنی شروع ہو گئیں۔ بعد میں اس کا نام افشاں سینما ہو گیا۔ جائیداد کی تقسیم پر یہ سینما محترم شیخ صاحب کے بچوں کو ملا جنہوں نے اسے بطور سینما ختم کر دیا اور آگے بیچ کر اس کا پیسہ کار خیر اور خدمت خلق کے کاموں میں لگایا۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۹۱۸ء کے قریب والد صاحب نے اپنے والدین کے لیے گوجرانولہ شہر کے باہر چھوٹی نہر سے تھوڑے سے فاصلہ پر بڑا خوبصورت فارم ہاؤس بنوایا۔ والدین اس وقت اکیلے تھے۔ سب اولادوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ اپنے اپنے گھروں میں آباد تھے۔ اس زمانے میں اس گھر کو والد صاحب نے اسطرح ڈیزائن اور مزین کیا جس طرح آجکل ۲۰۰۴ کے جدید ترین گھر ہیں۔ بلڈنگ میٹریل سارا امپورٹڈ۔ تمام موڈرن Facilities فلش سسٹم، باتھ ٹب Independent واٹر سپلائی اور سیوریج سسٹم۔ گھر کی اندرونی آرائش بڑی زبردست اور جدید ترین۔ میرے نانا جے پور کے مہاراجہ کے پرسنل فزیشن تھے۔ میری امی جے پور میں ہی پلی بڑھیں۔ جب میکے جاتی تھیں تو طرح طرح کے زیورات لاتی تھیں جو یہاں سب رشتہ داروں کو بطور تحفہ بھی دیئے جاتے تھے اور گھر کی سجاوٹ میں بھی رکھے جاتے تھے۔ ڈرائنگ روم کی خوبصورت گرین اور پیچ کلر سکیم تھی۔ دیواروں پر وال پیپر لگے ہوئے تھے۔ مینٹل پیس پر بڑا سا کلاک لگا تھا۔ کھانے کا کمرہ بھی قابل دید تھا۔ ماربل کا سفید اور کالا فرش۔ واش بیسن، کھڑکیوں اور دروازوں پر پیتل کی بریکٹوں پر خوبصورت پردے۔ اس فارم ہاؤس کے ساتھ ایک پیارا سا باغ بھی تھا۔ باقاعدہ پکی روشیں، ہر قسم کے جدید ترین پھولوں کے پودے، گلاب، موتیا، مرد ہیکس۔ باغ کے مرکز میں ایک تالاب تھا جسکا فوارہ گرمیوں میں شام کو چلا کرتا تھا۔ باغ میں پھلدار درخت بھی تھے جن سے امرود، لیموں، مالٹے وغیرہ اترا کرتے تھے۔ اصل میں اس گھر پر والد صاحب نے اپنی تمام ٹیکنیکل صلاحیتوں کو خوب خوب آزمایا۔ اس گھر کا سارا سلسلہ جب تک ہمارے دادا دادی حیات رہے بڑی شان و شوکت سے چلتا رہا۔ میں جب دس گیارہ سال کی تھی تب تک وہ گھر اسی شان سے قائم تھا۔ جس زمانے میں یہ گھر مکمل ہوا اور دادا دادی اس گھر میں منتقل ہوئے تو آبائی گھر جس میں وہ رہ رہے تھے وہ لڑکیوں کے سکول کے ساتھ تھا۔ وہ اس سکول کو خیرات کر دیا اور

انہوں نے اسے اپنے سکول میں شامل کرلیا۔اس نئے گھر کی دیکھ بھال اور والدین کی خدمت کے لیے والد صاحب نے چار پانچ ملازم بھی رکھے ہوئے تھے جو ہر دم ہمارے دادا دادی کی خدمت گزاری میں لگے رہتے تھے۔اللہ پاک والد صاحب کی اپنے ماں باپ کے لیے اتنی محبت اور خدمت قبول فرمائیں آمین۔پہلے دادا جان کی وفات ہوئی اور پھر دادی جان کی وفات کے بعد یہ گھر بند پڑا رہا۔کئی سال کرائے پر بھی دیا گیا آخر میرے والد نے اونے پونے داموں بیچ دیا۔

انگریزوں کے ساتھ دوستی کے باوجود والد صاحب کے دل میں مسلمانان ہند کی آزادی کی تڑپ اور ان کی زبوں حالی کا مداوا کرنے کا جذبہ موجود تھا۔اسی لیے جب برصغیر میں آزادی کی تحریک کا آغاز ہوا تو انہوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔

سرکاری مشینری کی انتظامی زمہ داریوں کو باحسن نبھانے کے ساتھ ساتھ وہ لاہور چھاؤنی کے انجمن حمائیت اسلام کے صدر اور لاہور چھاؤنی کی مسلم لیگ کے بھی صدر تھے۔اپنے انہی سیاسی اہداف کیوجہ سے انہوں نے چھاؤنی صدر کے علاقہ میں دہلی روڈ پر ایک حویلی نما بڑا سا گھر کرایہ پر لے رکھا تھا جس میں وہ رہتے تھے۔یہ کافی بڑا گھر تھا۔زنان خانہ اور مردانہ علیحدہ علیحدہ بنے ہوئے تھے جو والد صاحب کے مزاج کے مطابق تھے۔لیکن میری امی اس بات پر ان سے ہر وقت خفا رہتی تھیں کہ اچھی بھلی اپنی کوٹھیاں ہونے کے باوجود ہم اس علاقے میں آخر کیوں رہیں۔ان کا میکہ اسوقت برصغیر کے چوٹی کے خاندانوں میں سے ایک تھا۔تمام بھائی اور چاچا اعلیٰ ملازمتوں پر فائز تھے۔پھر ان کی بیٹیاں اب جوان تھیں،انہیں تو Status کا خیال ہوتا تھا۔مگر والد صاحب نے اپنے سیاسی نظریات اور اہداف چونکہ متعین کر رکھے تھے اور انہوں نے الیکشن لڑنا ہوتا تھا اور سیاسی حلقے سارے اس علاقے میں تھے اس لیے وہ اس علاقہ کو چھوڑنے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے۔

تحریک پاکستان کی تمام سرگرمیوں کا مرکز و محور ہمارا گھر ہوتا تھا۔اس گھر کے باہر سڑک کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس پر بڑے بڑے پودوں کے گملے پڑے رہتے تھے۔گرمیوں میں شام کے وقت روزانہ وہاں چھڑکاؤ کر کے ٹیبل فین رکھا جاتا۔بہت ساری کرسیاں لگائی جاتیں۔مغرب کے وقت علاقے کے تمام شرفا اور علما وہاں اکٹھے ہو جاتے۔اس علاقے میں زیادہ تر آبادی متوسط طبقہ اور غریب طبقہ کی تھی۔میرے والد بتاتے تھے کہ متوسط طبقے کے ان لوگوں میں بڑے پڑھے لکھے ایم اے پی ایچ ڈی لوگ بھی تھے اور اپنی سطح کے لحاظ سے غیر معمولی ذہانت اور فطانت کے مالک تھے۔ان کی عقل و علم بڑے سکالرز سے کم نہ تھی۔روزانہ شام کے وقت بڑی پر جوش اور پر عزم محفلیں ہوتی تھیں۔رات گئے تک بحث مباحثے اور قہقہوں کی آوازیں اندر زنان خانے تک آتی رہتی تھیں۔ملازم بھاگ دوڑ کر رہے ہوتے۔شربت اور چائے وغیرہ سے مسلسل آنے والوں کی تواضع جاری رہتی تھی۔میری عمر چونکہ اس وقت ابھی چھوٹی تھی اس لیے میں اکثر گھر کے مردانہ حصے میں بھی چکر لگاتی رہتی تھی اور باہر ہونے والے سارے تماشے دیکھتی رہتی تھی۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ والد صاحب کی سیاسی سرگرمیوں میں تیزی آتی گئی۔انگریزوں سے دوستی کے ساتھ ساتھ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے لیڈر بھی مانے جاتے تھے لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ انہوں نے اپنا تن من دھن مسلمانوں کی کامیابی پر لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔وہ تحریک پاکستان کینٹ کے سرگرم رکن تھے اور تمام Activities انہی کے زیر سرپرستی عمل میں آتی تھیں۔

وہی ساری منصوبہ بندی اور تنظیم کیا کرتے تھے۔ چھاؤنی میں تحریک کے روح رواں وہی ہوتے۔ مسلم لیگ کے بہت بڑے شاندار جلسے اور مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ جن میں اس وقت کے نامور شعلہ بیان مقرر اور شاعر مدعو کیے جاتے تھے۔ ان سب جلسوں میں خواتین کا بھی علیحدہ انتظام ہوتا تھا۔ والد صاحب نے خواتین کی مسلم لیگ کو بھی بہت متحرک رکھا ہوا تھا۔ بیگم جیون خان اور بیگم مرزا اسحاق ان کی اعلیٰ عہدیدار تھیں۔ اکثر والد صاحب سے رہنمائی لینے آتی تھیں اور انکی بھی میٹنگیں ہوتی رہتیں تھیں۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ الیکشن کے آخری دنوں میں بہت بھاری جلسہ ہوا۔ اس میں اس وقت ہندوستان کے جواں سال شاعر ساغر صدیقی جلسہ میں سٹیج پر آئے اور انہوں نے اپنی ایک مشہور نظم پڑھی جس میں بار بار یہ مصرع آتا تھا: ''چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے''۔ ان کے ترنم پر لوگوں کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔ والد صاحب کی وجہ سے ہمارے گھر پر بھی سیاسی اجتماعات کا یہی ماحول ہوتا تھا۔ میری امی کی دوستیاں تمام مسلم لیگی عورتوں سے تھیں اور عورتوں کے تمام جلسوں میں ہم سب اپنی امی کے ساتھ ضرور شریک ہوتی تھیں۔

انجمن حمائیت اسلام کے صدر ہوتے ہوئے انہوں نے چھاؤنی صدر کے علاقے میں ایک ہائی سکول لڑکوں کے لیے بنوایا جو بہت اعلیٰ معیار کا تھا اور تعلیمی میدان میں بہت آگے اور کھیلوں میں بھی اعلیٰ کارکردگی کے لیے مشہور تھا۔ اس سکول کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ مشہور کرکٹر فضل محمود بھی اس کے گراونڈز میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ ایک اسلامیہ مڈل سکول لڑکوں کے لیے بھی قائم کیا۔ جو بعد میں ہائی سکول بن گیا اور آج کل کالج ہے۔ دونوں ادارے آج شان و شوکت سے ترقی کی منزلیں طے کر کے قائم و دائم ہیں۔

چھاؤنی صدر کی جامع مسجد بھی تحریک پاکستان کا زبردست مرکز تھی۔ وہاں کے خطیب محترم حافظ منظور احمد صاحب والد صاحب کے ہی نامزد کردہ تھے۔ ان کی دستار بندی بھی والد صاحب نے کی۔ محترم حافظ صاحب بہت پایہ کے عالم دین اور چھاؤنی کی ایک محبوب ہستی تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد تک انہوں نے خدمت خلق کے بے شمار کارنامے سرانجام دیے۔ آج بھی چھاؤنی صدر کے علاقے میں ان کا قائم کردہ مدرسہ ''جامعہ المنظور الاسلامیہ'' دین کی خدمت کے لیے اپنے اعلیٰ معیار کے لیے مشہور ہے۔ والد صاحب کا اور محترم حافظ صاحب کا تاحیات احترام اور محبت کا رشتہ قائم رہا۔ میرے والد جب ان سے ملتے تو ان سے یہ فرمائش کرتے کہ میرے پلے کچھ نہیں مہربانی سے میری بخشش کے لیے آپ میری ضرور مدد کیجیے گا۔ والد صاحب کا جنازہ بھی محترم حافظ صاحب نے ہی پڑھایا۔ حافظ صاحب سلسلہ قادریہ سے بیعت تھے۔ والد صاحب بھی اسی سلسلے میں بیعت تھے۔ ان کے مرشد چودھری امانت علی ہوشیار پور (ہند) کے ایک گاؤں میں تھے۔ ان کی وفات کے بعد والد صاحب کے ماموں زاد بھائی محمد حسین اہل ایڈوکیٹ ان کے خلیفہ بنے جنہوں نے ''میخانۂ عشق'' کتاب لکھی۔ والد صاحب کے ان سے بڑے پیار اور احترام کے مراسم تھے اور ہم عمری بھی تھی۔ والد صاحب فرماتے تھے کہ مجھ میں روحانیت کی کوئی صلاحیت نہیں، ویسے اولیاء اللہ پر بہت اعتقاد تھا اور ان کی بہت عزت اور احترام کرتے تھے۔ میرے چچا جان ڈاکٹر محمد یوسف شرق پور والے شیر ربانیؒ سے بیعت تھے۔ دونوں بھائی جب ملتے تو اکثر اولیاء اللہ کے کشف، کرامات اور مشاہدات کی باتیں کئی کئی گھنٹے کرتے رہتے۔ والد صاحب نے اپنے سونے کے کمرے میں نماز کے لیے تخت رکھا ہوا تھا اکثر عشا یا فجر کی نماز کے بعد بلند آواز سے باترنم بڑی لے اور جذبے سے مثنوی مولانا روم اور وارث شاہ پڑھا کرتے تھے اور سارے گھر میں ان کی آواز گونجا کرتی تھی۔ سورۃ یوسف بھی زبانی یاد تھی۔ وہ بھی بڑی قرأت سے پڑھا کرتے تھے۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی شروع ہوئی تو تحریک پاکستان نے خوب زور پکڑا۔ والد صاحب کے شب و روز اور تمام توانائیاں تحریک کے لیے ہی وقف تھیں۔ پچھلے تیس سال سے ان کی شخصیت چھاؤنی کے تمام حلقوں پر چھائی ہوئی تھی، وہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے یکساں طور پر ہر دل عزیز لیڈر مانے جاتے تھے۔ چھاؤنی میں بورڈ کے ممبر چننے کے لیے باقاعدہ الیکشن ہوتے تھے۔ والد صاحب پچھلے ستائیس سال سے ہمیشہ بلا مقابلہ منتخب ہوتے تھے۔ ایک دفعہ انہی کی جائداد کے منشی نے اپنا بیٹا کانگرس کی مدد سے مقابلہ پر کھڑا کر دیا تو اس کی ضمانت ضبط ہو گئی۔

لاہور چھاؤنی کے بورڈ کی ممبر شپ کے لیے ۱۹۴۶ء کا الیکشن ایک معرکہ آرا واقعہ تھا۔ الیکشن سے کئی مہینے پہلے ہی لوگوں کا جوش و خروش سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ اس سال یہ الیکشن بالکل سیاسی بنیادوں پر ہو رہا تھا۔ اس الیکشن پر پاکستان کے عالم وجود میں آنے کا بہت انحصار تھا۔ ہمارے گھر پر میٹنگز ساری ساری رات جاری رہتیں۔ والد صاحب تمام طبقوں کے لوگوں سے ملتے اور مشورے کرتے۔ اللہ اللہ کر کے الیکشن کا دن آ ہی گیا۔ چھاؤنی صدر کے سارے علاقے میں زبردست جوش اور سنسنی پائی جاتی تھی۔ ہمارے گھر کے اندر عورتوں کا ہجوم اور باہر مردوں کا ہجوم تھا۔ الیکشن سے ایک رات پہلے جبکہ ہمارے گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا، باہر والد محترم کے پاس ایک اللہ والے بزرگ آئے۔ انہوں نے میرے والد کے سر پر جو گیا رنگ کا ایک بنارسی صافہ باندھا اور ان کی ہتھیلی پر ایک چاندی کا روپیہ رکھا اور دعا دے کر غائب ہو گئے۔ یہ روپیہ اور صافہ میری امی بہت سنبھال کر رکھتی تھیں۔ اپنی آخری عمر میں میری امی نے بزرگوں کے تبرکات میرے سپرد یہ کہہ کر کیے کہ یہ تمہارے دادا اور محمود کے نانا کے تھے اس لیے ان کو تم سنبھال کر رکھو، تو ان چیزوں میں وہ جو گیا بنارسی صافہ بھی تھا جو ابھی تک میرے پاس ہے۔ الیکشن میں سارا دن ووٹ ڈالے جاتے رہے۔ عصر کی نماز کے وقت میرے والد کی شاندار کامیابی کا اعلان ہوا۔ بس پھر کیا کہنا تھا، لوگ آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ سڑک کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور میرے والد کو لوگوں نے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ اس قد کاٹھ کے بندے کو کندھوں پر اٹھانا بھی ایک کام تھا، جلوس کے آگے آگے پٹاخے بھی چھوڑے جا رہے تھے۔ لوگ مسلسل ان کے گلے میں ہار ڈال رہے تھے۔ مشکل سے دس گز جلوس چلتا تو ہار ماتھے تک آ جاتے۔ ان کو اتار کر میرے والد احباب کو پکڑاتے اور جلوس آگے چلتا تو اسی طرح بے شمار ہار ہر پانچ منٹ کے بعد پھول ماتھے تک آ جاتے۔ ساری فضا نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر اور ''بنا کے رہیں گے پاکستان'' کے نعروں سے گونجتی رہی۔

اس شاندار کامیابی پر میرے والد بہت خوش تھے۔ لیکن وہ ملک کے سیاسی حالات سے بہت متفکر بھی تھے۔ اچانک تمام ملک میں خونی فسادات پھوٹ پڑے۔ بہار کے صوبہ سے شروع ہو کر ملک کے تمام حصوں سے وحشتناک اور خوفناک قتل و غارت گری کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ قدرتی طور پر لاہور چھاؤنی کے علاقے نے بھی متاثر ہونا تھا۔ ایک بہت ہی خوفناک حقیقت سے مسلمان بالکل لاعلم تھے اور وہ یہ تھی کہ ہندوؤں نے باقاعدہ پہلے سے مسلمانوں کے قتل عام کا پلان بنایا ہوا تھا اور سارے ہندوستان میں ہندوؤں کو اسلحہ سپلائی کرنے کی پوری منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ چنانچہ وہ اسلحہ ملک کے کونے کونے میں ہندوؤں اور سکھوں کو پہنچایا جا رہا تھا۔ اسی لیے میرے والد کو مسلمان راہنما ہونے کی حیثیت سے سب کچھ سوچنا اور کرنا تھا۔ ساری چھاؤنی میں ان کا اپنا دبدبہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص ان کے سامنے دم نہ مار سکتا تھا۔ لیکن حالات کے ساتھ سب وفاداریاں تبدیل ہو چکی تھیں ان کو خوب اندازہ تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں

کے ان کے لیے کیا خیالات اور جذبات ہونگے ۔ ہمارے گھر کے پچھلی طرف اور مشرق کی طرف ساری آبادیاں ہندوؤں اور سکھوں کی تھیں ۔ ان حالات میں ہمارے والد صاحب کو اپنی فیملی کی بہت فکر تھی ۔ گھر میں چار بیٹیاں جوان اور بیٹے ابھی چھوٹے تھے ۔ ایک سال پہلے میری ایک بڑی بہن کی شادی ہوئی اور وہ اپنے میاں کے ساتھ گورداسپور چلی گئیں، جہاں ان کی پوسٹنگ تھی ۔ مارچ ۱۹۴۶ء کی بات ہے ہماری وہ بہن بھی ہمارے پاس آ گئیں ۔ ۵ مارچ ۱۹۴۷ء کو اللہ تعالیٰ نے میری اس بہن کو چاند سا بیٹا عطا فرمایا ۔ وہ آج کل امریکہ میں ڈاکٹر ہے ۔ ۳۵ سال سے وہیں پر ہے اس کے ماشاءاللہ جوان اور شادی شدہ بچے ہیں ۔ ۴ مارچ کو والد صاحب نے حکم صادر فرمایا کہ باہر ایمبولنس آ گئی ہے بچہ اور ماں اس میں اور ہم سب اپنی گاڑی میں چچا جان کے گھر روانہ ہو جائیں کیونکہ چھاؤنی کے حالات بہت خراب ہو چکے تھے ۔ میرے چچا کا گھر شملہ پہاڑی کے پاس جینر زاینڈ میری سکول کے سامنے واقع تھا ۔ ڈاکٹر محمد یوسف اس وقت کے لاہور کے مشہور ڈاکٹر اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے ۔ ساری فیملی بمع بہن اور بچے کے وہاں شفٹ ہو گئے ۔ خاندان کے وہ لوگ بھی جن کے گھر محفوظ نہیں تھے وہاں جمع ہو رہے تھے ۔ میرے چچا کا لنگر خانہ تو پہلے ہی مشہور تھا ۔ جو مریض باہر سے دکھانے آتے بیوی بچوں سمیت مہینوں ان کے گھر ٹھہرتے ۔ جن میں سے ایک ملک خضر حیات ٹوانہ کی فیملی بھی تھی ۔ چچا کے گھر ایک ہنگامہ تھا ۔ میری ایک تایا زاد بہن بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں ۔ انہوں نے سب پر بڑی پابندی لگا رکھی تھی کہ سب گھنٹیوں پر آیت کریمہ کا وظیفہ پڑھتے رہیں ۔ کوئی ادھر ادھر کی باتیں کرتا تو اسے ٹوکتی تھیں ۔ اس طرح گھر کا ماحول کافی سنجیدہ تھا ۔

ادھر والد صاحب نے اپنا سارا گھر بند کروا دیا ۔ صرف مردانہ حصہ کھلا رکھا اور خود اس گھر کے اوپر کی منزل میں کھلے لان میں آسمان کے نیچے ڈیرہ لگا لیا ۔ سارے چھاؤنی صدر کے علاقے کی فضا سخت زہر آلود تھی اور قتل و غارت شروع ہو چکا تھا ۔ سکھوں نے بہت طوفان مچایا ہوا تھا ۔ ان کا ایک بدنام زمانہ غنڈہ لیڈر جسکا نام سنت سنگھ تھا ہمارے گھر کے پچھواڑے رہتا تھا ۔ لوگ بتاتے تھے کہ والد صاحب تمام وقت رائفل اور پستول لوڈ کر کے اوپر کوٹھے پر ٹہلتے رہتے تھے ۔ ایک تلوار بھی انہوں نے شوقیہ رکھی ہوئی تھی ۔ کسی ہندو سکھ کو ادھر آنے کی جرأت نہ ہوئی ۔ سب مسلمانوں کو تسلی تھی کہ اکرم صاحب موجود ہیں اس لیے ہم اللہ کے فضل سے محفوظ ہیں ۔ والد صاحب کے دبدبے کا یہ عالم تھا کہ جب وہ اوپر کوٹھے پر چلتے تھے تو سارا گھر تھرتھراتا تھا اور اگر وہ زور سے بولتے تو سب کا سانس گلے میں اٹک جاتا تھا ۔

ہمیں اپنے چچا جان کے گھر ٹھہرے ہوئے قریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا ۔ ادھر میرے والد کو احساس تھا کہ والدہ صاحبہ کو صدر میں رہنا سخت ناگوار تھا یوں بھی انہوں نے صدر کینٹ میں رہنے کا اپنا مقصد تو حاصل کر ہی لیا تھا الیکشن جیت کر اب لاہور کینٹ کے فوجی علاقے میں ایک چھوٹی کوٹھی جو دس کنال پر تھی خرید لی ۔ یہ مسٹر گلمور کی تھی، وہ وفات پا چکے تھے ۔ ان کی بیوہ اور دو بہنیں اس میں رہ رہی تھیں ۔ وہ تینوں گھر کے سائیڈ کے حصے میں شفٹ کر گئیں اور باقی گھر انہوں نے خالی کر کے والد صاحب کے سپرد کر دیا ۔ انہوں نے اسکی مرمت اور Renovation شروع کرا دی اور صدر والے گھر سے سارا سامان بھی ادھر پہنچا دیا ۔ اس طرح ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کے بعد ہم نے پھر اس گھر میں قدم نہیں رکھا اور والد صاحب ہر طرح کی سیاسی اور خانگی کاموں کی بھاگ دوڑ میں سرگرم رہے ۔ ایک دن فون پر انہوں نے چچا جان کو بتایا کہ گھر کی مرمت کروانے کے دوران وہ گر پڑے اور ٹانگ کو چوٹ آئی ہے ۔ میرے چچا سخت گھبرائے

اسی وقت کینٹ گئے اوران کو اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئے ایکسرے کروایا تو پتہ چلا نچلی ٹانگ کا فریکچر ہے اوران کی ٹانگ کو پلاسٹر کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد سب والد صاحب کے پاس اپنے دوسرے گھر پہنچ گئے۔اس زمانے میں لاہور کی چھاؤنی ایک نہائیت ہی خوبصورت اور دلکش کالونی تھی انگریزوں کو ہندوستان کی ایک چیز جو بہت پسند تھی وہ یہاں کے درخت تھے اور وہ بھی سب سے زیادہ بھاری بھرکم اور پھیلا ووالے درخت جیسے پیپل اور نیم وغیرہ۔پھلدار درختوں میں آم، جامن، شہتوت۔چنانچہ ساری چھاؤنی اس قدر درختوں میں گھری اور بھری ہوئی ہوتی تھی کہ اب یہ بات مبالغہ لگے گی اگر میں بتاؤں کہ سڑکوں اور گھروں میں درختوں کی وجہ سے اندھیرا چھایا رہتا تھا اور گرمیوں میں بھی دھوپ کو نیچے زمین پر پڑنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔پھران درختوں پر بے انتہا پرندے ہوتے تھے اور چھاؤنی کے علاقے میں پرندوں کے بولنے اور اڑنے پھرنے کا اتنا شور ہوتا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔کوئلیں۔ بلبلیں۔ہدہد۔فاختہ۔مینا۔نیل کنٹھ۔کھٹ بڑھئی اور طرح طرح کے پرندے جن کے نام بھی یاد نہیں اور طرح طرح کی رنگ برنگی چڑیاں بچپن میں خوبصورت نظاروں سے ہم اتنے لطف اندوز ہوتے تھے کہ اب سوچتے ہیں کہ یہ جنت گم گشتہ پھر کبھی نظر نہیں آ سکتی یہ پھولوں پھلوں اور خوشبوؤں کی دنیا تھی۔آج اسی چھاؤنی میں ہم رہ رہے ہیں مگر افسوس کچھ کہنے کو نہیں بچا۔

والد صاحب جب چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو کام کی دیکھ بھال شروع کی۔صبح کچہری بھی جانے لگے لیکن حکومتی سطح پر تمام نظام ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔حالات سخت دگرگوں تھے۔کبھی تو یوں لگتا تھا کہ انگریز ہندوؤں کو ہی ملک کی باگ ڈور پکڑا کر بھاگ جائیں گے۔

مئی، جون ۱۹۴۷ تک ہماری پوری فیملی نے یہ زمانہ بڑی خوشیوں سے گزارا لیکن سیاسی حالات کی وجہ سے میرے والد بہت پریشان رہتے تھے۔حکومتی اداروں کا ٹوٹنا، گھروں کا اجڑنا اور قتل و غارت کا طوفان۔پھر بھی والد صاحب ایک مضبوط چٹان کی طرح تھے۔جو لوگ ان کے پاس مشکلات لے کر آتے، ان کو تسلی دیتے اوران کی رہنمائی کرتے۔والد صاحب کے انگریز دوستوں کی ملک چھوڑنے کی افواہیں بھی سرگرم تھیں لیکن اب آپس میں رابطے والے دن نہیں تھے۔والد صاحب گھر کی تزئین و آرائش میں بھی مصروف رہتے تھے۔اگرچہ اپنے سیاسی حلقے کو چھوڑ کر چھاؤنی کے خالص فوجی علاقے میں آجانے سے، زندگی کے اس ہمہ جہت ہنگامہ خیز اور پرہجوم دور کا تو خاتمہ ہی ہو گیا اوران کا حلقہ احباب بھی بکھر گیا، پھر بھی محفلیں جمتی رہتی تھیں۔شطرنج کے بہت شوقین تھے۔ شطرنجی دوستوں کا ایک خاصہ بڑا حلقہ تھا اور ہمیشہ ہر اتوار کو لازمی طور ظہر یا عصر سے مغرب تک زبردست محفل جمتی۔ان کے شطرنجی دوست جوق در جوق آیا کرتے تھے۔محترم چچا جان یوسف بھی ضرور تشریف لاتے تھے۔ساری زندگی انہوں نے اتوار کو کبھی بھائی کے گھر آنے میں ناغہ نہیں کیا۔وہ بھی شطرنج کے بڑے چمپین تھے۔باہر گھر کے حصے میں ایک طوفان برپا ہوتا تھا۔میرے والد کی اونچا بولنے کی آوازیں۔قہقہے اور لڑائی جھگڑے کے مکالمات سے سارا گھر گونج رہا ہوتا تھا۔چائے اور خورد و نوش کے اہتمام میں میری بہنیں اور ملازم سب مصروف ہوتے تھے۔کیونکہ تو اضح میں ذرا سی بھی کسر رہ جاتی تو سخت برہم ہوتے تھے۔مغرب کی اذان سے ذرا پہلے یہ محفل ختم ہو جاتی تھی۔چچا جان اندر آتے، ہم سب کے پاس آ کر بیٹھتے، باتیں کرتے۔اتنے میں ڈرائنگ روم میں نماز کے لیے

چادریں بچھ جاتیں ۔ چچا جان امامت کرتے اور ہم سب اور ہمارے بچے بھی ان کے پیچھے نماز ادا کرتے ۔ پھر وہ ہماری طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے اور دعا مانگتے ۔ بہت ہی لطف آتا تھا ۔ پھر وہاں بیٹھے بیٹھے کافی گپ شپ ہوتی ۔ اکثر اولیا کے واقعات وغیرہ موضوع ہوتے ۔ نماز کے بعد باہر کافی مریض اکٹھے ہو جاتے ۔ چچا جان ان کا معائنہ کرتے اور نسخے لکھ کر دیتے اور پھر سب کو سلام پیار دیکر گھر روانہ ہو جاتے ۔ شطرنج کے علاوہ والد صاحب شکار کے بھی بہت شوقین تھے ۔ جوانی سے شکار کھیلتے آرہے تھے ۔ بندوقیں اور رائفلیں رکھی ہوتی تھیں ۔ شکاری دوستوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے ۔ ان کے شکاری دوست ہمارے گھر اکثر ہرن اور دوسرے شکار پکا کر اور کچے بھی بھیجتے رہتے تھے ۔ زندہ ہرن بھی ایک دفعہ کسی نے بھیجا اسے ہم بڑے شوق سے پالتے رہے ۔ غازی صاحب ان کے بڑے قریبی شکاری دوست تھے ۔ کبھی کبھی ڈٹل پیرل میں کارتوس بھر کے ہمیں بھی چلانے کی اجازت دیتے تھے ۔ میرا بھائی مسعود جوان کی بندوقیں وغیرہ سنبھالتا تھا، ہم سے ایک ایک کارتوس سے نشانہ لگوایا کرتا ۔ رات کو بندوق اکثر لوڈ کر کے سرہانے رکھتے تھے اور کئی دفعہ ان لوڈ کرنی بھول جاتے تھے تو میری امی اس میں سے کارتوس نکال لیا کرتی تھیں ۔ اسی طرح ایک دفعہ امی جان صبح کارتوس نکال رہی تھیں کہ گھوڑا دب گیا اور بندوق چل گئی ۔ سارے گھر میں زوردار دھماکہ ہوا اور گولی تین کمروں کے دروازوں سے پردوں میں سے سوراخ کرتی ہوئی گزر کر باہر کی طرف نکل گئی ۔ اللہ کا کرم ہوا کسی گھر کے فرد کو نہ لگی ۔ گھر میں ہر کوئی بندوقوں سے متعارف تھا ۔ دو بڑی زبردست قسم کی رائفلیں بھی رکھی ہوئی تھیں ۔ وہ شکار میں اور پہاڑ پر ڈلہوزی جاتے ہوئے ساتھ جاتی تھیں ۔

گرمیوں میں ساری فیملی کو لے کر پہاڑ پر ڈلہوزی چلے جاتے تھے ۔ کیا خوبصورت زمانہ تھا، پہاڑ پر جانے کے لیے ہم سب کے نئے کپڑے بنتے تھے ۔ گرم کوٹ سلتے تھے ۔ ہر ایک کی اپنی چھتری اور اپنا رین کوٹ ہونا ضروری ہوتا تھا ۔ دونوں بھائی یعنی والد صاحب اور محترم شیخ رحمت اللہ صاحب سمیت اپنی فیملیز کے اکٹھے جاتے تھے ۔ اپنی اپنی گاڑیوں پر وہاں خوب سیر سپاٹے میں دن گزرتے ۔ بڑی دعوتیں ہوتیں ۔ دونوں گھروں کا آپس میں آنا جانا لگا رہتا ۔ میرے والد وہاں کبھی کبھی ہمارے ساتھ لوڈو بھی کھیلا کرتے ۔ ہم لوگ کئی کھیلیں monoply وغیرہ ساتھ لے جاتے تھے ۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۴ء میں ۳ جون کو لاہور پہنچے تو پہلی جولائی کو میری پیدائش ہوئی ۔ تقسیم ہند کے بعد ڈلہوزی جانا ختم ہو گیا بلکہ والد صاحب نے وہاں ۲ کنال کا پلاٹ بھی لے رکھا تھا لیکن اس پر گھر بنانے میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی ۔ یہاں تک کہ تقسیم کے بعد لوگوں نے بڑھ چڑھ کر کلیم دئے اور زمینیں آلاٹ کروائیں ۔ ان کو بھی سب نے کہا لیکن انہوں نے کوئی کلیم نہ داخل کروایا بلکہ میو روڈ پر عبداللہ شاہ ہج کی کوٹھی کے ساتھ ایک ۶ کنال کا پلاٹ لے رکھا تھا وہ بھی اونے پونے بیچ دیا کہ لاہور تو بارڈر پر آگیا ہے، پراپرٹی کی قیمتیں گر جائیں گی ۔ اصل میں انہیں پراپرٹی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ میری امی کہا کرتی تھیں کہ بھائی رحمت اللہ انہیں زبردستی جائیداد دلاتے رہتے تھے اور یہ آگے سے بیچ دیا کرتے ۔ ہاں زندگی بڑی ٹھاٹ سے گزاری ۔ کہا کرتے تھے کہ میں نے جب گاڑی خریدی تو لاہور میں مشکل سے تین یا چار گاڑیاں تھیں ۔ ہمیشہ شیورلیٹ گاڑی لیتے تھے ۔ جونہی کوئی نیا ماڈل نکلتا تو فٹافٹ لے لیا کرتے تھے ۔ جب تک گاڑیاں متعارف نہیں ہوئی تھیں تو ایک ہیوی موٹر سائیکل رکھی ہوئی تھی ۔ پھر سائیڈ کار نکلی تو دو سائیڈ کاریں لے لیں اور ایک اپنے بڑے داماد کو دیدی ۔ وہ کسی چیز کو بیچنا بہت معیوب سمجھتے تھے یہی سائیڈ کار ۱۹۷۰ء تک باہر پورچ میں پڑی ہوتی تھی ۔ ہمارے بچے اس پر چڑھ کر کھیلتے رہتے تھے اور کبھی کبھی اس کو چالو کر کے ہمارے

بچوں کو اس پر خود سیر کراتے تھے۔

تیس چالیس کی دہائی تک اپنی ورزش کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے۔ اوپر کی منزل میں ایک کمرہ مختص تھا، جس میں ان کے ورزش کے طرح طرح کے آلات پڑے رہتے تھے۔ چھت سے دو ڈربوں میں لوہے کے رنگ لٹک رہے ہوتے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ لٹکنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک پہلوان بھی شام کو مالش کے لیے باقاعدہ آتا تھا۔

والد صاحب ایک طرف تو انتہائی حساس قسم کے آرٹسٹ تھے۔ ان کی کتاب ''قید یا عشتان'' تو واقعی ان کا کارنامہ تھا اس میں پٹھانوں کی ساری تصویریں خود پنسل ڈرائنگ سے بنائیں۔ ایک اور چھوٹی سی کتاب ''آہ سلمیٰ'' بھی لکھی ہوئی تھی۔ ہماری ایک بہن دس گیارہ سال کی عمر میں فوت ہوگئی تھی، یہ اس کی وفات پر لکھی تھی۔ وہ اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ مگر اس کتاب کو پڑھنے کی اجازت نہیں تھی اور لوہے کی صندوقچی میں تالے میں پڑی رہتی تھی۔ دوسری طرف سائنسی اور تکنیکی صلاحیتوں کی بھی انتہا تھی۔ چھاؤنی کی تمام فوجی اور عسکری عمارات بنوائیں۔ سینما بنوایا۔ کنٹونمنٹ کی ساری Administration ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ باغات لگوائے اور طرح طرح کی آرائش کرواتے رہتے تھے۔ اپنے گھر میں بھی مختلف قسم کے تجربات کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء کے دوران، جب ابھی کسی نے کولر کا نام بھی نہیں سنا تھا، انہوں نے کولر بنوایا ہوا تھا۔ جست کے ڈبے کو خس کی ٹٹیاں لگی ہوتی تھیں۔ اندر ٹیبل فین رکھا ہوتا تھا۔ تمام وقت پانی چکوں پر پڑنے کا بندوبست تھا۔ اور یہ کولر کمرے کی کھڑکی میں برآمدے میں پڑا رہتا تھا گرمیوں کی دوپہر کو چلایا کرتے تھے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں باقاعدہ ڈیزرٹ کولر اینوں والا بنوایا، جسے دیکھنے کے لیے لوگ آیا کرتے تھے۔ اختراع Innovation ان کی شخصیت کا بڑا نمایاں پہلو تھا اس زمانے میں جب گیزر متعارف نہیں ہوئے تھے تو ایک حمام جست کا بنوایا، جسکے باہر Insolation کا انتظام تھا اور اندر Emertion Rod لگی ہوئی تھی۔ بجلی سے چلتا تھا اور ہمیشہ ان کے غسلخانے میں پڑا رہتا تھا سالہا سال تک استعمال کرتے رہے۔ ۱۹۴۳ میں اپنے بھائی یوسف کی کوٹھی بنوائی۔ یہ شملہ پہاڑی کے قریب ڈیوس روڈ پر ۵ نمبر کوٹھی تھی۔ یہ بھی اپنے وقت کی خاص عمارت تھی جس میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو خوب اجاگر کیا۔ عمارت کا نقشہ بھی خاص تھا اور بڑی انوکھی اور جدید چیزیں اس میں متعارف کرائیں۔ گھر کا نام کنعان تھا۔ ۱۹۷۰ تک خوب شان و شوکت سے کھڑا تھا۔ ہسپتال، پھر شادی گھر بنا اور آخر ان کے بیٹے نے بیچ دیا۔ والد صاحب بارش میں سونے کے بڑے شوقین تھے۔ ایک لوہے کا پلنگ چھت پر پڑا رہتا تھا اس پر لوہے کی سلاخوں کا فریم تھا اور اسکی چھت پر سبز ریکسین کا کپڑا چڑھا ہوا تھا، چاروں طرف جھالر لٹک رہی ہوتی تھی۔ برسات میں جب رات کو بارش ہوتی تو وہ اسی میں سوتے تھے۔

۱۹۴۴ میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے والے سال انہوں نے اور کرنل لٹن نے مل کر کراچی میں کشتیوں کا کافی بڑا کام Contract پر لیا اور چند مہینوں کے لیے کراچی چلے گئے۔ گرمیوں کی چھٹیوں کا وقت تھا، ہم سب بچے اور امی جان جے پور اپنے ماموں کے پاس چلے گئے۔ ہم جے پور سے واپس آئے اور وہ کراچی سے۔ ہم سب بیٹوں کے لیے بڑے خوبصورت زیوروں کے چھوٹے چھوٹے ولائتی سیٹ لے کر آئے۔ ہمیں بڑی خوشی اور حیرت ہوئی کہ کیا والد صاحب بھی ایسی شاپنگ کر سکتے ہیں؟ اس زمانے میں عورتوں کا بازار جانا معیوب سمجھا جاتا تھا، کپڑے زیور وغیرہ سب دوکاندار گھر پر بھیج دیا کرتے تھے۔ پھر اس میں سے پسند کر لیے

جاتے ۔ہاں ہم بچوں کو عید پر جوتے دلانے کے لیے انارکلی کرنال شاپ پر لے جاتے اور خوب مہنگے جوتے دلایا کرتے ۔کراچی کی نم آب وہوا سے والد صاحب کو دمے کی شکائت ہوگئی جو کئی سال تو شدید تکلیف دیتی رہی پھر ایک حکیم صاحب کی دیسی دوائی سے کم ہوتی گئی اور پھر ختم ہوگئی ۔یہ دوائی والد صاحب خود بھی بناتے اور لوگوں کو بھی دیتے تھے ۔اکثر لوگ ان سے یہ دوائی لینے آیا کرتے تھے ۔

۱۹۴۴ء کی شروع کی دہائی میں ہم بچوں کو سکول لے جانے کے لیے رئیسی تانگہ رکھا ۔مارواڑی سائیس تھا ۔ہم کینٹ سے لاہور کے سکولوں میں جاتے تھے ۔بھائی مسعود سنٹرل ماڈل سکول میں جاتا تھا ۔سینٹ اینتھنز سکول سے نکال کر والد صاحب نے اسے میٹرک کے لیے ادھر داخل کروادیا تھا ۔میں اور مجھ سے بڑی بہن سلمٰی لیڈی میکلیگن سکول میں پڑھتی تھیں، جو اس زمانے کا بڑا Top کا سکول تھا ۔اس سے دو بڑی بہنیں اسلامیہ کالج فار ویمن میں جاتی تھیں ۔اس طرح ہم سب بچے تانگے میں اکٹھے سکول جاتے تھے ۔بہت لمبا سفر بن جاتا تھا لیکن خوب مزا آتا تھا ۔واپسی پر ہم سائیس سے باگیں لے کر تانگہ بھی چلایا کرتے تھے ۔کھلی صاف سڑکیں کہیں کہیں اگا دگا ٹریفک !

جب پاکستان بننے سے پانچ ماہ پہلے ہم ۲۰ بریلی روڈ والے گھر میں شفٹ ہوئے تو والد صاحب نے ایک اور گاڑی خرید لی یہ سٹیشن ویگن تھی ۔بچے سب بڑے ہوگئے تو ان کو بڑی شیورلٹ دیدی ۔اسوقت میرا بھائی مسعود گورنمنٹ کالج میں F.Sc میں تھا وہ ڈرائیو کرتا تھا اور ہم سب اکٹھے جایا کرتے تھے ۔مسعود سے بڑے میرے بھائی فاروق نے اسی سال انجیرنگ کی تو ان کی پہلی پوسٹنگ فیروزپور شہر میں ہوئی ۔۷ مارچ ۱۹۴۷ کو والد صاحب نے تار دیکر واپس بلا لیا کیونکہ حالات بہت خراب اور پریشان کن تھے ۔اپریل یا مئی میں بھائی فاروق کی پوسٹنگ پاکپتن شریف میں بطور S.D.O ہوگئی ۔اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی ۔یہ بڑے لائق سنجیدہ مگر خوش مزاج اور پروقار شخصیت کے مالک ہیں، محکمہ انہار سے بطور چیف انجینئر ریٹائر ہوئے ہیں ۔جون جولائی میں جب ہم سب بہن بھائیوں کو گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں، تو انہی دنوں میں والد صاحب نے فیصلہ کیا کہ بھائی جان کو شیورلٹ ڈرائیور کے ساتھ بھیج دی جائے کیونکہ انہیں دوروں پر جانا ہوتا تھا، ابھی انہیں تنخواہ ملنی شروع نہیں ہوئی تھی اور وہ پیسے بھی بچوانا چاہتے تھے ۔جب گاڑی بھیجی جا رہی تھی ہم چار بہنوں اور مسعود کا بھی فاروق بھائی جان کے پاس پاکپتن چھٹیاں گزارنے کا پروگرام بن گیا ۔ہمارے وہاں پہنچنے کے پندرہ دن بعد فسادات کا کہرام مچ گیا ۔پاکپتن شہر چونکہ بالکل بارڈر پر تھا اور اس علاقے میں سکھوں کے ایک خاص انتہائی طاقتور اور جنگجو قبیلے کا غلبہ تھا تو یہاں خون کی ندیاں بہہ گئیں ۔بڑی سڑک جو انڈیا کی طرف جاتی تھی اسکے بالکل ساتھ ہی ہماری کوٹھی تھی، یہ محکمہ نہر کی کالونی کی پہلی کوٹھی تھی ۔ہمارے گھر کے سامنے کی طرف نہر تھی ۔کھڑکی کے سامنے کی سڑک سے ہندوؤں اور سکھوں کے قافلے، سامان سے لدے پھندے اور ڈھول بجاتے ہوئے جا رہے ہوتے تھے اور مسلمانوں کے نہتے بدحال قافلے پاکستان میں داخل ہوتے نظر آتے تھے ۔ایک دن ایک ہندو نیزہ بردار ہمارے کوٹھی کے ساتھ ہی کھیتوں میں چھپا بیٹھا تھا ۔ یہ ایک کالا بھجنگ دبلا سا ہندو تھا ۔وہ کھیت میں گھات لگا کر بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا ۔ہاتھ میں لمبا سا بانس تھا جس کے آگے چھری نما چیز لگی ہوئی تھی ۔چہرے پر انتقام اور رعونت کی آگ برس رہی تھی، آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ۔مارے خوف کے مجھے ایک جھرجھری آئی اور میں کھڑکی کے آگے سے ہٹ گئی ۔

اس زمانے کے بعض انتہائی خوفناک مناظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں تو خوف اور دہشت کی ایک لہر سنسناتی ہوئی میرے دل و دماغ سے گزر جاتی ہے میں اس وقت ۱۲ سال کی تھی۔ مجھ سے بڑی میری بہن سلمٰی ۱۵ سال کی تھی۔ دوسری دونوں بڑی بہنیں تو خیر کافی سمجھدار تھیں لیکن ہم دونوں بہنوں کا تو برا حال تھا، ہم تو زندگی میں اپنے ماں باپ سے کبھی علیحدہ ہی نہیں ہوئیں تھیں میں اپنی امی کے ساتھ اتنی Attached تھی کہ کبھی چند گھنٹے بھی ان سے الگ نہیں ہوئی تھی، رات کو بھی ان کے ساتھ سوتی تھی۔ بلکہ آٹھویں جماعت تک میں ان کے ساتھ ہی سوتی تھی۔ سلمٰی ویسے ہی بہت حساس طبیعت کی سوچ میں غلطاں رہنے والی تھی۔ ہم دونوں اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھیں۔ ہمارے بھائی جان بے چارے چھوٹی سی عمر میں چار بہنوں کو ان خطرناک حالات میں سنبھالے بیٹھے تھے۔ حالات انتہائی مخدوش تھے، مسعود بھائی ایک مہینہ رہنے کے بعد واپس لاہور بذریعہ ریل چلا گیا۔ ادھر بھائی جان کو اکٹھی تنخواہیں ملیں تو اپنی سعادت مندی کے تحت والدین کو کچھ پیسے بھجوانا چاہتے تھے، ان حالات میں میری بڑی بہن نے مسعود بھائی کی بنیان کے اندر کپڑا سی کر اس میں نوٹ بند کر دیے۔ اس طرح مسعود بھائی چلا تو گیا لیکن نہ تو ہم اپنے امی ابا کو اطلاع کر سکے کہ مسعود آ رہا ہے اور نہ ہی وہ لاہور پہنچ کر کوئی اطلاع دے سکا کیونکہ حالات ہی بہت خراب تھے۔ تمام ملک میں کوئی کسی قسم کا نظام تھا ہی نہیں۔ دن پر دن گزرتے گئے اور مسعود بھائی کے پہنچنے کی خبر کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ ہم انتہائی اذیت کے دور سے گزر رہے تھے۔ آپس میں بھی کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ سہمے سہمے سے رہتے تھے۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر قتل و خون کی مسلسل خبریں آ رہی تھیں۔ ہم نے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور کر بھی کیا سکتے تھے، نمازوں اور وظیفوں سے دل کو اطمینان ہوتا تھا اور اسی میں مصروف رہتے تھے۔ آس پاس رہنے والے کالونی کے لوگ بہت اچھے تھے۔ ہمارا بہت دھیان رکھتے تھے، اپنے گھر بلا لیتے۔ کبھی کیرم، کبھی تاش وغیرہ کھیلتے تھے لیکن ہمارا دل کسی بات میں نہیں لگتا تھا۔ اگست کا مہینہ تھا مسعود بھائی کو گئے ہوئے کوئی دو ہفتے ہوئے تھے۔ مارے فکر کے ہم سب کا برا حال تھا۔ سب ملنے والوں نے مشورہ کیا اور ہمیں کہا کہ رمضان کا مہینہ ہے اور کل جمعتہ الوداع اور ستائیسواں روزہ ہے۔ بابا فرید گنج شکر کے مزار پر جا کر دعا مانگیں، لازمی قبول ہوگی اور ان شاء اللہ آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی۔ ہم چاروں بہنیں تیار ہو گئیں، دوسرے دن دوپہر کو ان کے ساتھ گاڑی میں ہم مزار مبارک پر چلے گئے۔ بے انتہا گرمی تھی اور لوگوں کا کھوے سے کھوا چھل رہا تھا ہمیں تو اپنی دعا مانگنے کی پڑی تھی۔ نماز پڑھ کے مزار مبارک کے قریب ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اور واپس گھر روانہ ہو گئے۔ تین بجے دوپہر کے قریب ہم گھر پہنچے۔ داخل ہوتے ہی دیکھا کہ کھانے والے میز پر ایک کھلا تار پڑا ہے جو بھائی جان کھول اور پڑھ کر ہمارے لیے رکھ گئے تھے۔ لکھا تھا "Masood reached safely" مارے خوشی اور حیرانی کے ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو یاد آیا کہ آج رات کو تو اعلان ہونا ہے کہ پاکستان بنا ہے کہ نہیں۔ رات کھانے کے بعد ہم سب دھڑکتے دلوں کے ساتھ ریڈیو کے اردگرد بیٹھ گئے کہ دیکھیں ہماری قسمتوں کا کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ پورے بارہ بجے اس وقت کے مشہور اناؤنسر مصطفیٰ علی ہمدانی کی آواز گونجی "یہ ریڈیو پاکستان ہے" اس حسین لمحے کی یاد آج بھی دل کو گرما دیتی ہے۔ کیسے کیسے ارمان اور کیسی کیسی خوشیاں دلوں میں چٹکیاں لے رہی تھیں۔ ایسے جیسے دین دنیا اور آخرت کی تمام نعمتیں اور خوشیاں مل گئی ہوں۔ مسلمانوں کی قربانیاں رنگ لائیں، آخر ہندوستان میں اسلامی ملک ہمیں مل ہی گیا۔ جہاں ہم اپنے دین کے مطابق زندگیاں گزاریں گے۔ جانے کیا کیا مستقبل کے حسین نقشے

آنکھوں میں پھرنے لگے۔ہم سوچ رہے تھے کہ بس اب ہمارے امی ابا بھی موٹر پر آئیں گے اور ہمیں جھٹ پٹ واپس اپنے گھر لے جائیں گے۔لیکن ''ایں خیال است ومحال است وجنون'' اس لمحے کے بعد ایسے جیسے ایک خوفناک عفریت نے پورے برصغیر کو اپنے پنجۂ استبداد میں دبوچ لیا ہو۔ہندوؤں نے تو پہلے سے ہی مسلمانوں کے قتل عام کا سارا پروگرام بنایا ہوا تھا اور گاؤں میں سب ہندوؤں کو اسلحہ پہنچایا جا چکا تھا۔مسلمان بے چارے نہتے قابو آ گئے۔جہاں ان کا بس چلا تو انہوں نے بھی انتقام لینے کی بھرپور کوشش کی لیکن کہاں تک؟ ہر طرف ظلم وستم اور قتل وغارتگری کا بازار گرم تھا۔انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔آہوں سسکیوں اور کراہتے ہوئے بے پناہ ہجوم کی یلغار نے نوزائیدہ مملکت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔لٹے پٹے انسانوں کی زندہ لاشوں کا ایک سیلاب تھا جو پاکستان کی سرحد سے امنڈا چلا آ رہا تھا۔ایسے حالات میں ہم بہن بھائیوں کا پردیس میں محصور ہو کر رہ جانا، ایک ایسا تجربہ اور واقعہ تھا جس کے لیے ہم کسی طرح بھی تیار نہ تھے۔بھائی جان بے چارے ہمیں تسلی اور امید بھی نہیں دلا سکتے تھے لیکن اپنی گھبراہٹ بھی کبھی ظاہر نہیں کرتے تھے۔ان خون آشام دنوں کی یاد سے اب بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔دنوں پر دن گزرتے گئے، ویسے دس بارہ دن کے بعد امی جان یا ابا جان کا کوئی خط ہفتہ بھر پہلے کا لکھا ہوا مل جاتا تھا اور وہ خط ہمدردی تسلی اور پیار سے بھرے ہوتے تھے جن کو پڑھ کر ہم اور اداس ہو جاتے اور روتے رہتے۔

میں اور سلمٰی تو سارا دن جائے نماز پر ہی گزار دیتے، اسی دوران اداسی کی وجہ سے مجھے ناوے درجے کا بخار بھی رہنے لگ گیا۔سلمٰی کا بھی برا حال تھا ان دنوں منٹگمری (حالیہ ساہیوال) میں ہمارے دو قریبی عزیز اقامت پذیر تھے ایک تو میری تایا زاد بہن اور ان کے میاں شیخ نسیم حسن، جو وہاں ان دنوں ایڈووکیٹ تھے اور بعد میں حکومت اور سیاست میں بھی آئے۔دوسرے میرے والد کے تایا زاد چودھری نذیر احمد، وہ بھی وہاں کے چوٹی کے وکیل تھے۔یہ بھی بعد میں وزیر بھی بنے اور انا رنی جنرل پاکستان بھی۔میرے والد نے بڑی مشکل سے ان تک ہماری بدحالی کی خبر پہنچائی کیونکہ ان حالات میں کوئی بھی ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں رکھ سکتا تھا۔تمام نظام درہم برہم تھے۔بڑی مشکلوں سے منٹگمری سے ایک پیغام بھائی جان تک پہنچا کہ D.C منٹگمری راجہ حسن اختر، جو ہمارے دونوں عزیزوں کے قریبی دوست تھے، فلاں تاریخ کو لاہور جا رہے ہیں۔جو بچی بہت اداس اور بیمار ہے اسے اس تاریخ تک منٹگمری پہنچا دیں تو وہ اس کو لاہور لے جائیں گے۔سلمٰی اور میں ہم دونوں بہنیں شروع سے ہی ایک دوسرے سے اتنی attached تھیں کہ علیحدہ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔میرا دل بہت برا ہوا اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتی رہی کہ ہم دونوں اکٹھے ہی جائیں لیکن ابھی تو منٹگمری پہنچنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔بھائی جان نے پروگرام بنایا کہ ہم سب منٹگمری میں اپنی تایا زاد بہن کے ہاں چلے جائیں۔اپنی موٹر پر اکیلے جانے کی نسبت مقامی بس سروس سے اور لوگوں کے ساتھ جانا زیادہ محفوظ تھا۔چنانچہ ہم ایک ٹرانسپورٹ بس میں سوار ہو گئے۔یہ ایک بالکل نیا اور خوفناک قسم کا تجربہ تھا۔ہم بہنیں اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئیں، چند دیہاتی عورتیں اور بھی تھیں۔ساری بس دیہاتی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔بس روانہ ہوئی، تمام لوگ کلمے کا ورد کر رہے تھے، ہمارے پاس بھی دعاؤں کی کتاب اور پنج سورہ تھا ہم نے بھی وہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔سہمی سہمی نظریں ایک دوسرے سے چار ہوتیں تو ہم اور ڈر جاتے۔اچانک چیخ وپکار کا ایک شور سا اٹھا اور ساری بس میں کھلبلی مچ گئی۔پتہ چلا کہ بس کے اوپر بھی بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے سڑک پر آگے ایک نیچا سا درخت آیا تو

ڈرائیور نے ہانک لگائی کہ ''بچ جاؤ''۔ تو سب ڈر کے مارے چیخنے لگے۔کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد دور سے نظر آیا کہ سامنے سڑکوں کا ایک چورستہ ہے اور دوسری سڑک پر سکھوں اور ہندوؤں کا ایک بہت بڑا قافلہ آ رہا تھا اس کے آگے آگے نہنگ سکھوں کا ایک جتھہ تھا جن کے ہاتھوں میں لوہے کے ایسے کڑے (rings) تھے جو بلیڈ کی طرح تیز ہوتے تھے دور سے ایسا نشانہ لگاتے تھے کہ جس کے گلے میں پڑتا گلا کٹ جاتا۔قافلہ نعرے لگاتا اور غل غپاڑہ کرتا ہوا چوک کی طرف بڑھ رہا تھا۔مارے خوف کے تمام بس والوں کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔کلمے کا ورد بلند آواز میں ہونے لگا۔اگر بس اور قافلے کا ٹکراؤ چوک پر ہو گیا تو وہ تو بس کے پرخچے اڑا دیں گے۔ قافلہ چوک سے چند گز کے فاصلے پر تھا کہ ہماری بس شن کر کے چوک سے نکل گئی سب کی جان میں جان آئی اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔آخر کار ہم اپنی تایا زاد بہن کے ہاں پہنچ گئے۔ان دونوں میاں بیوی نے ہماری دل جوئی اور خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہاں پہنچ کر ہمیں بہت سکون ملا۔بھائی فاروق ہمیں وہاں پہنچا کر واپس پاکپتن اپنی نوکری پر چلے گئے۔ایک دو دن کے بعد ہمیں پیغام ملا کہ کل صبح چھوٹی بچی کو تیار کر دیں اور گاڑی میں بس اتنی ہی جگہ ہے چنانچہ دوسرے دن D.C صاحب کی بہت بڑی سی سرکاری گاڑی آ گئی۔آگے راجہ حسن اختر صاحب بیٹھے تھے۔اندر سرکاری ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا، پیچھے ہماری چچی صاحبہ محترمہ بیگم چودھری نذیر احمد اور ایک اور خاتون جو شاید ان کی ملازمہ تھیں بیٹھی تھیں، ڈرائیور نے میرے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور میں پھلانگ کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔الوداع کہنے کے لیے سب ہی گاڑی کے پاس پورچ میں کھڑے تھے۔میں نے ایک حسرت بھری نظر سلمیٰ پر ڈالی۔وہ بھی ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔اچانک چچی جان کی آواز آئی، چلو دوسری بچی کو بھی بٹھا لو۔ہم ذرا سا تنگ ہو جائیں گے۔ مارے خوشی کے ہماری باچھیں کھل گئیں اور سلمیٰ جلدی سے گھس کر کار میں بیٹھ گئی۔سارا سفر ڈر اور خوف کی حالت میں قریباً خاموشی سے ہی گزر گیا۔جب ہم لاہور مال روڈ پر پہنچے تو اس وقت کے جذبات ناقابل بیان ہیں۔ریگل چوک سے کارنیمپل روڈ کی طرف مڑ گئی کیونکہ چچی جان اپنے والد کے گھر جا رہی تھیں (مولوی غلام محی الدین قصوری ان کے والد تھے) کار سے اتر کر ہم اندر چلے گئے۔دل بلیوں اچھل رہا تھا کہ کون سی گھڑی ہو کہ اڑ کے اپنے گھر پہنچ جائیں۔گھر والوں نے کہا کہ دوپہر کا کھانا لگ گیا ہے۔پہلے سب کھانا کھا لیں۔پھر ہمارے گھر جانے کا بندوبست کریں گے۔ہمیں بھلا بھوک کہاں؟ کھانے کے میز پر ہم دونوں بیٹھ گئیں۔کن انکھیوں سے میں اور سلمیٰ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔آخر ہم نے جرأت کر ہی لی اور چچی جان سے کہا کہ ہم گھر فون کر لیں کہ ہمیں کوئی آ کر لے جائے۔انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ہم بھاگ کر فون کے پاس پہنچیں۔فون کی گھنٹی بج رہی تھی یوں لگا جیسے دل دھڑک کر گلے میں آ گیا ہو۔میری امی نے ہیلو کہا۔ہم نے انہیں بتایا کہ ہم ادھر پہنچ گئی ہیں۔انہوں نے کہا ابھی مسعود تمہیں کار پر لینے آتا ہے تم تیار رہو۔ آدھے گھنٹے کے اندر مسعود بھائی ہمیں لینے آ گیا۔اور ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔دوپہر کے دو یا تین بج رہے ہوں گے۔وہ بھی کیا دن تھا زندگی میں۔

اللہ کے فضل و کرم سے ہمیں بہت خوبصورت دن نصیب ہوئے لیکن اس دن کی خوشی اور حسن کے امتزاج کے اتنے گہرے نقش میرے دل و دماغ پر ثبت ہیں کہ آج بھی جب سوچتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پھر سے اس زمانے اور لمحے میں پہنچ گئی ہوں۔آخر کار کینٹ آ گئی، بریلی روڈ (حالیہ ظفر علی روڈ) پر ہم مڑ گئے۔مارے خوشی کے دل دھڑک رہا تھا۔آنکھوں میں آنسو آ رہے

تھے۔ ہمارے گھر کے دو گیٹ تھے۔ ابا جان نے اپنے لیے چھاؤنی کی سب سے چھوٹی کوٹھی، جو دس کنال میں تھی، منتخب کی تھی۔ دونوں گیٹوں کے اوپر گول جنگلا لگا ہوا تھا جس پر پھولوں سے بھری ہوئی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ گاڑی گھر کے گیٹ سے داخل ہوئی اور پورچ میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ ہمارے سامنے ایک روح پرور منظر تھا۔ ہمارا گھر کس قدر خوبصورت لگ رہا تھا۔ آخر ستمبر کا مہینہ تھا۔ برسات کی وجہ سے لان سرسبز گھاس سے دمک رہا تھا۔ جامن، شہتوت، آم، جامن پیپل، انا ناس، سنبل کے درختوں پر پرندے اس قدر چہچہا رہے تھے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ کوئل کوکو کر کے چیخ رہی تھی۔ چیپے بول رہے تھے۔ کھڑ بڑھئی کی ہک ہک کی آوازیں آ رہی تھیں، بلبلیں بول رہی تھیں۔ برسات کی ٹھنڈی مگر بوجھل ہوا سے پودے اور درخت سب جھوم رہے تھے۔ انگریز برصغیر کے درختوں پر اس قدر فدا تھے کہ چپے چپے پر انہوں نے درخت لگائے ہوئے تھے۔ ہمارے اس گھر میں بھی کئی سو کے قریب درخت لگے ہوئے تھے۔ بہر حال میں اور سلمیٰ چھلانگیں لگاتی ہوئی اندر کے برآمدے میں پہنچیں تو سامنے امی جان ہاتھ پھیلائے کھڑی تھیں۔ ''میری بچیاں'' کہہ کر انہوں نے ہمیں سینے سے لگایا۔ اندر کا لان تو انتہائی خوبصورت لگ رہا تھا آخری حد پر لارگٹونیا کے سفید گلابی اور کاسنی پھولوں کے پودے کھڑے تھے۔ مہندی کے پودے نے اپنی بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیلا رکھی تھی۔ انگور کی بیل پر انگوروں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ املی کے درخت کو املی کی پھلیاں لگ رہی تھیں۔ اوپر سے املتاس کے درخت کے پیلے پھولوں کے ہار جھک جھک کر اور جھوم جھوم کر فضا کو اور ابھی سحر انگیز بنا رہے تھے۔ ریڈیو پر لتا منگیشکر کا گانا ''جادو کر گئے کسی کے نیناں'' کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ اس زمانے میں ہم دونوں بہنیں گانوں کی دیوانی ہوا کرتی تھیں۔ میرے والد بھی اپنے کمرے سے نکل کر آئے۔ ہمارے سروں پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ اس دو تین مہینوں کے اذیت ناک دور کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے ایک بہت ہی خوبصورت اور پرسکون دور ہمارے خاندان پر گزرا۔ سب بہن بھائی اکٹھے تھے۔ جس بہن کی شادی ہو چکی تھی وہ بھی گورداسپور سے ہمارے پاس آ گئی تھیں۔ والد صاحب کی شان و شوکت کے عروج کا زمانہ تھا۔ گھر کی اندر باہر کی تزئین پوری ہو چکی تھی۔ ہم سب بہن بھائی اپنے ماں باپ کے زیر سایہ ایسی عیاشی اور بے فکری کی زندگی گزار رہے تھے کہ اگرچہ اس کے بعد پوری زندگی اللہ کے فضل سے بہت ہی اچھی گذری لیکن اس طرح کی عیش اور بے فکری اور فراغت کے دن کبھی نہیں آئے۔ آپس میں بہن بھائیوں کی محبتیں اور قربتیں، اکٹھے مل کر طرح طرح کے شغل، کبھی فوٹوگرافی اور پرنٹنگ ہو رہی ہے، کبھی سارا سارا دن اور ساری ساری رات Monoplay کھیلی جا رہی ہے۔ خوشیوں اور نعمتوں کی فراوانیاں سب والد صاحب کی مرہون منت تھیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے لیکن ان کی شخصیت کی بلندی ایسی تھی کہ ہم ان کے ساتھ کبھی بھی ''فری فرینک'' نہیں ہو سکتے تھے۔ اس زمانے کے معزز اور دیندار گھرانوں کے دستور کے مطابق جب ہمارے والد صاحب گھر میں تشریف لاتے تو ہم سب بیٹیاں یکدم سروں پر دوپٹے لیکر اٹینشن ہو جاتیں۔ عورتوں کے پردے کے بڑے سخت پابند تھے اور کوئی ملازم اندر زنانخانہ کمرے میں نہیں آ سکتا تھا۔ اندر سب عورتیں کام کرتی تھیں یا چھوٹے لڑکے۔ گھر کا ایک سسٹم بنا ہوا تھا اس زمانے کے ملازم بھی بہت پرخلوص اور باادب ہوتے تھے۔ کوئی ملازم ان کے آگے دم نہیں مار سکتا تھا۔ بے چارے سہمے سے رہتے تھے۔ ہم لڑکیوں کو بھی کسی غیر رشتہ دار کے گھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سکول کالج میں کوئی فنکشن ہوتا تو بڑی مشکل سے والدہ کی معرفت کبھی کبھی اجازت ملتی۔ اس پر بھی چائے کے وقت ہمارے اوپر کن اکھیوں سے ضرور نظر ڈالتے کہ کس حلیہ میں جا رہی ہیں۔ اس

پر اس وقت ہمیں بہت غصہ آیا کرتا تھا۔ لیکن اب جب ان باتوں کا شعور آیا تو ان کی سب پابندیاں بالکل بجا لگتی ہیں اور کوئی غصہ نہیں آتا۔ ہمارے ننہال والے سب بڑے روشن خیال لوگ تھے۔ وہاں کہا جاتا تھا کہ اکرم چاچا جی کے گھر چڑیاں تو جا سکتی ہیں لیکن چڑوں کو اجازت نہیں۔

گھر والوں کے لیے ان کی طبیعت میں سخت گیری تھی لیکن باقی سب ملنے والے تو ان سے ایسے مسحور ہوتے تھے کہ ان پر لٹو ہو جاتے تھے وہ بڑے آدم شناس اور انسان دوست تھے۔ جس کسی سے ملتے وہ انکی پر کشش شخصیت سے مرعوب ہو جاتا تھا۔

میٹرک کے بعد مجھے کالج میں داخلہ لینا تھا تو گاڑی میں خود کنیرڈ کالج لے کر گئے۔ میں پیچھے گاڑی میں بیٹھی رہی اور آفس میں جا کر مس منکت رائے پرنسپل سے لمبی گفتگو کرتے رہے۔ آئے تو بتایا کہ تمہارا داخلہ ہو گیا ہے۔ کل فیس داخلہ لے جانا اور یہ پراسپکٹس ہے۔ میں نے جی کہہ کر پراسپکٹس لے لیا۔ اس کو میں نے دیکھا تو جو مضمون فائن آرٹس کا میں نے ضرور لینا تھا وہ کنیرڈ کالج میں تھا ہی نہیں لیکن میری ان سے کوئی بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ گھر آ کر میں نے امی جان سے کہا کہ میں نے تو اس کالج میں نہیں جانا کیونکہ وہاں فائن آرٹس ہے ہی نہیں۔ دوسرے دن مجھے لاہور کالج لے گئے۔ پھر مجھے گاڑی میں بیٹھا کر اندر چلے گئے۔ کافی دیر مسز ہنری لال پرنسپل سے باتیں وغیرہ کرتے رہے۔ گاڑی میں آئے تو بتایا کہ تمہارا داخلہ ہو گیا ہے کل فیس داخل کروا دینا اور ساتھ ہی پراسپکٹس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ گھر جا کر میں نے دیکھا تو جو مضامین میں لینا چاہتی تھی ان کا Combination ہی نہیں تھا۔ پھر میں نے اپنی امی سے منت کی کہ انہیں کہیں کہ مجھے جغرافیہ اور فائن آرٹس کا Combination دلا دیں۔ پھر تیسرے دن مجھے لے کر گئے۔ ہنری لال بڑی ڈسپلن کی پابند اور سخت گیر عورت تھی۔ ان کے ساتھ بڑی لمبی بحث مباحثہ کے بعد اسے منوا کر آئے کہ آپ اس کے ریزلٹ دیکھ لینا یہ دونوں مضمون بہت اچھے کرے گی اس کی ذمہ داری پر اس کو کرنے دیں۔ بڑی لیت ولعل کے بعد مسز ہنری لال مان گئیں اور میں نے دو سال یوں گذارے کہ ایک ہی پیریڈ میں دونوں مضمون ہوتے تھے اور میں ہمیشہ فائن آرٹس کے پیریڈ میں جاتی اور جغرافیہ مس کر دیتی۔ جغرافیہ میں میری پروفیسر ڈاکٹر مس کنیز یوسف تھیں، جو بعد میں اسلام آباد یونیورسٹی کی وائس چانسلر بھی بنیں۔ جب جاتی وہ مجھے تھوڑا سا پڑھا دیتی تھیں۔ بڑی خوش دلی سے۔ بہر حال ریزلٹ بہت اچھا آیا اور دونوں مضمونوں میں میں اول رہی اور انعام حاصل کیے۔ میری بڑی بہن بلقیس کی پینٹنگ غیر معمولی اچھی تھی اکثر ان کی پینٹنگز لے کر اپنا مولا کا احمد کے پاس یا میو سکول آف آرٹس کے پرنسپل کے پاس لے جاتے اور خوب Discuss کر کے آتے۔ یعنی بیٹیوں میں دلچسپی بھی تھی، خیر خواہی بھی تھی لیکن ہم ہمیشہ ان سے ڈر کے رہتے تھے۔ کبھی ان سے کھل کر بات نہیں کی۔ ان کی موجودگی میں ایک رعب اور خوف سا چھایا رہتا تھا کہ کہیں کچھ غلطی نہ ہو جائے صرف میرا بھائی مسعود ان کے ساتھ خوب فری تھا اور ان سے خوب باتیں بھی کرتا تھا اور کاموں میں مشورے بھی دیتا تھا انہیں بھی اس کے ساتھ خاص لگاؤ اور محبت تھی۔

۱۹۲۹ء میں والد صاحب کو زبردست دھچکا لگا کہ ان کے بھائی محترم شیخ رحمت اللہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ لمحہ لمحہ اکٹھے جیئے، پوری زندگی اور جوانی کے بہترین دن ان کے ساتھ اکٹھے گزرے، اکٹھے کاروبار، اکٹھے اٹھنا، بیٹھنا، ان کی وفات سے والد صاحب کی شخصیت میں تبدیلی تو آئی لیکن بہت دل گردے والے آدمی تھے۔ بڑے حوصلے سے اس صدمے میں سے گزرے۔ اس کے بعد ان

کے بچوں سے بہت زیادہ قربت رکھی، ہر وقت ان کے پاس جانا اور ان کا بھی اکثر ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا۔محترم شیخ صاحب کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔چاروں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی۔بڑے داماد خان بہادر انعام اللہ خاں انجینئر تھے۔انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔سیکرٹری رہے۔ریٹائرمنٹ کے بعد مشہور و معروف قران اکیڈمی بنائی اور دین کی بہت خدمت کی۔دوسری بیٹی جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ان کے میاں تقسیم ہند سے پہلے پائلٹ تھے۔ائر کریش میں شہید ہوگئے۔تیسرے داماد جسٹس انوار الحق تھے جو چیف جسٹس پاکستان بھی بنے۔چوتھے داماد ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔اور ان کے اکلوتے بیٹے ذکا اللہ ٹوبیکو کمپنی میں کراچی میں مینیجر تھے۔ان کی شادی والد کی وفات کے بعد ہوئی۔بھائی رحمت اللہ کی وفات کے بعد والد صاحب نے بہت کوشش کی کہ اب جائداد تقسیم ہو جائے اور ان سب کو شرعی حصے دیے جائیں لیکن کئی سالوں تک ان کی اولادوں میں سے کوئی بھی نہیں مانتا تھا کہ جائیداد علیحدہ کریں یا حصے لیں۔سارے بہن بھائی نیک ماں باپ کی اولاد اور بے مثال اور انتہائی قابل تعریف کردار کے مالک لوگ تھے۔آخر برسہا برس کی کوششوں اور اصرار کے بعد میرے والد نے ان کو منایا کہ میری اپنی زندگی کا کچھ پتہ نہیں کب ختم ہو جائے اور جائیداد کی شرعی تقسیم ہوئی اور والد صاحب کو بینٹ جان بلڈنگ اور ساتھ ایک ورکشاپ ملا۔اس تقسیم کے متعلق بھی ایک ناقابل فراموش واقعے کی یاد وابستہ ہے۔وہ یہ کہ تقسیم کے وقت بھائی ذکا اللہ مصر ہو گئے کہ مجھے جائیداد میں سے حصہ نہیں چاہیے۔سب کچھ میری چاروں بہنوں میں تقسیم کر دیجیے۔بہنیں لینے پر راضی نہیں تھیں کہ ہمارا ایک ہی بھائی ہے وہ کیوں نہ شرعی حصہ لے۔ادھر والد صاحب ان سے مصر تھے کہ آپ کو شرعی حصہ لینا تو پڑے گا اس کے بعد آپ اس کو جو دل آئے کیجیے۔بڑی مشکل سے جب وہ حصہ لینے پر مانے تو پھر انہوں نے یہ ضد شروع کر دی کہ میں دوگنا کیوں لوں بہنوں کے برابر ہی لوں گا۔بڑی مشکل سے والد صاحب نے انہیں شرعی حصہ لینے پر آمادہ کیا تو اپنا حصہ لیتے ہی ذکا بھائی نے وہ اپنی بڑی بہن جو بیوہ تھیں ان کے نام کر دیا۔وہ تھی کینٹ میں وہاں پر بہت بڑی شاندار ان کے والد کی رہائشی کوٹھی جس کی زمین ۲۰ کنال تھی۔اب یہ بہن اکیلی تو اس میں نہیں رہ سکتی تھیں بس اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ بیکو کمپنی والے دونوں بھائیوں میں سے چھوٹے بھائی ایئر ایڈمرل صدیق نے یہ کوٹھی خرید لی اور وہ مسئلہ ختم ہو گیا۔لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں ایسے بھائی موجود تھے جو اپنا جائیداد کا حصہ بہنوں کو دینے کی بجائے اپنے پاس رکھنے میں زیادہ خوشی محسوس کرتے تھے۔اسی طرح اس خاندان کی Nobility کی بے شمار مثالیں ہیں۔

دن بڑے مزے میں گزر رہے تھے۔تقسیم ہند اور ہندوؤں اور سکھوں کے چلے جانے کے بعد والد صاحب کو تحریک پاکستان میں بھرپور اور پرخلوص خدمات انجام دینے کی وجہ سے چھاؤنی میں ایک بلند اور مقدس ہستی کا مقام حاصل ہو چکا تھا۔لوگ ان کی بے انتہا عزت اور محبت کرتے تھے۔سرکاری عہدوں پر جتنے ایگزیکٹو افیسر اور M.E.O آتے ان کے ساتھ ان کے بڑے گہرے پیار محبت والے تعلقات ہوتے تھے۔وہ سب ان سے چھاؤنی کے معاملات میں رہنمائی لیا کرتے تھے۔محترم ملک سردار خاں، محترم درانی صاحب، محترم رضوی صاحب اور محترم خان مجید صاحب سے بہت ہی برادرانہ اور قربت کے تعلقات تھے۔ہم بھی والد صاحب کے اس مقام سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے تھے۔چھاؤنی کی سڑکوں پر یوں سفر کرتے تھے جیسے ہماری جاگیر ہو، جگہ جگہ لوگ جھک جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔

اگست ۱۹۵۱ء میں ملک کے حالات مخدوش ہو گئے، وہ یوں کہ ہندوستان کے ارادے کچھ زیادہ ہی خطرناک ہو گئے جس کے جواب میں مرحوم لیاقت علی خاں صاحب نے اپنا مشہور معروف مکا دکھایا تھا۔خطرہ تھا کہ بھارت شائد حملہ کر دے۔والد صاحب بہت پریشان تھے، چھاؤنی میں رہائش ہونے کی وجہ سے جنگ سے زیادہ متاثر ہونے کا خطرہ تھا۔ہم چاروں بہنوں کی شادیاں ابھی نہیں ہوئی تھیں اور جو شادی شدہ تھیں وہ بھی تقسیم ہند کی وجہ سے والد کے پاس ہی تھیں۔والد صاحب تھے تو بڑے شیر اور دلیر انسان لیکن جواں بیٹوں کی وجہ سے ہمیشہ گھبرا جاتے تھے،ان دنوں ہمارے پھوپھی زاد انجینئرنگ پاس کر کے ہیڈ رسول میں تعینات تھے۔ والد صاحب نے ان سے بات کر کے ہم سب کو ہیڈ رسول بھجوا دیا۔گھر والوں نے بہت اصرار کیا کہ آپ بھی چلیں، آپ کیوں یہاں خطرے میں بیٹھے رہیں۔پیچھے گھر سنبھالنے کے لیے کافی ملازم ہیں لیکن اس بات کو وہ اپنے لیے بہت معیوب سمجھتے تھے کہ خطرہ ہو تو وہ بجائے مقابلہ کرنے کے فرار ہو جائیں۔ہم قریباً مہینہ ہیڈ رسول اور والد صاحب پیچھے بندوقیں پستولیں بھر کے ہر وقت تیار رہتے تھے اور رات کو باقاعدہ سارے گھر کا گشت کرتے رہتے تھے۔آخر معاملہ ٹھنڈا ہو گیا اور ہندوستان کا حوصلہ نہ پڑا کہ حملہ کرے اور ہم خیریت سے واپس گھر آ گئے۔اور کاروبار زندگی پھر اپنی اسی نہج پر رواں دواں ہو گیا۔لیکن دن سدا ایک جیسے تو نہیں رہتے، میرے بھائی مسعود نے B.Sc کرنے کے بعد زبردست خواہش ظاہر کی کہ میں ائیر فورس میں جانا چاہتا ہوں۔سارے گھر والے سخت مخالف تھے، امی تو ویسے ہی یہ سمجھتی تھیں کہ جو بچہ نالائق ہو اسے فوج میں بھیج دیا جاتا ہے۔پھر اپنے جگر گوشے کو وہ کیسے بھیجتیں؟ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔مگر جو مشیت ایزدی ہو اس کے آگے کون دم مار سکتا ہے۔مسعود نے والد صاحب کو منا لیا اور انہوں نے میری امی کو منا لیا کہ جونہی یہ پاس آؤٹ ہو گا ہم اسے میڈیکلی اَن فٹ کروا کے نکلوا لیں گے۔چنانچہ بڑے بھائی تو سروس کے سلسلے میں پہلے ہی ماں باپ کے گھر سے جا چکے تھے یہ بھائی بھی رسالپور ٹریننگ کے لیے چلا گیا۔وہ تو گھر کا ایک روشن چراغ تھا سارے گھر کی رونق، والد صاحب سے بے حد قربت، ملازموں سے بے انتہا دوستیاں، بچوں کے ساتھ خوب کھیلنا۔کہنے کو تو وہ دو لفظ کہہ کر چلے گئے لیکن ان کے چہرے پر جیسے لکھا ہوا تھا کہ کوئی بہت ہی منحوس خبر ہے۔آپ لوگ تیار ہو جائیں۔بہنوں کے ساتھ ہر وقت مصروف رہنا اور کوئی نہ کوئی شغل بنائے رکھنا، کبھی فوٹو گرافی، کبھی سائنسی تجربے، کبھی کیرم۔شکار کا بہت شوقین تھا، اکثر تو اسکے شکار کے Trip ہی چلتے رہتے تھے۔وہ کیا گیا کہ سارا گھر ہی سونا ہو گیا۔ہر ایک کو اس کی واپسی کا انتظار تھا، بچوں اور ملازموں سے لے کر ہمسایوں، رشتہ داروں اور دوستوں تک سب اس کے منتظر رہتے تھے۔وہ اکثر بڑے پیارے پیارے خط بھیجتا رہتا تھا، اپنی ٹریننگ بڑے اعزاز سے مکمل کی۔بہت سارے انعام لے کر لاہور چھاؤنی اپنے گھر آیا اور رونقیں پھر لوٹ آئیں، خوب مصروفیت، قہقہے، دوستوں کی طرف آنا جانا، گھر کی زندگی پھر لوٹ آئی مگر اس کے پاس چھٹیوں کے بہت تھوڑے دن تھے اس کی پوسٹنگ ماری پور کراچی ہو گئی تھی۔وہ Top کے ہیڈ پائیلٹس میں سے تھا جن کو انہوں نے لڑاکا بمبار طیاروں پر تعینات کیا تھا۔وہ خوش تو بہت تھا لیکن کچھ سنجیدہ سا ہو گیا تھا۔سب نے سوچا کہ لڑکپن سے نکل کر سمجھداری کی عمر میں داخل ہو رہا ہے۔مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس کے جانے میں ایک دو دن رہ گئے تھے، باہر سے اندر گھر میں داخل ہوا تو چہرا بڑا اترا ہوا سا تھا۔ادھر ادھر کی باتیں کر کے کہنے لگا ابھی ابھی ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا، مجھے یہاں سڑک پر ایک آدمی ملا، میں تو اسے نہیں جانتا تھا مجھے دیکھ کر کہنے لگا ''ہائیں میں نے تو سنا تھا کہ تمہارا کریش ہو گیا ہے'' یہ کہہ کر اس کا چہرہ اتر گیا۔ہم سب نے سنی ان سنی کر دی۔بہر حال وہ گھر سے بڑی اچھی طرح مل کر، پیار کر کے، سلام کر کے، دعائیں لے کر رخصت ہوا۔میرے میاں جو میرے پھوپھی زاد بھی ہیں ان دنوں ہماری طرف آئے ہوئے تھے۔انہوں نے چلتے چلتے اس کی آخری تصویریں وردی میں کھینچیں۔وہ

تصویریں ابھی تک ہمارے پاس ہیں۔ ماری پور جا کر خط لکھتا رہا کہ مجھے انہوں نے بمبار فیوری پر تعینات کیا ہے میں نے سولو فلائٹ بھی ۲۹۰۰ تک کی ہے۔ یعنی مونٹ ایورسٹ تک اونچی۔ ماں باپ اب اس کو ائر فورس سے اَن فٹ کرانے کی کوششوں میں تھے۔ ظفر اللہ چودھری صاحب جو ان دنوں وزیر خارجہ تھے ان کے ساتھ میرے ننھال کے بڑی قریبی تعلقات تھے، ان سے کہلوایا کہ اسے میڈیکل سے اَن فٹ کرا دیں، لیکن امر ربی کچھ اور تھا۔ ایک دن شام مغرب کے وقت، نومبر کی ۹ تاریخ تھی، والد صاحب تخت پر پیشانی کے عالم میں آئے اور بتایا کہ میں بھائی جان کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں مسعود کا پتہ کرنے۔ تمام رات میری امی ہم سب بہنیں تڑپتے رہے۔ دعائیں، التجائیں، واسطے، منتیں، سب کچھ ہوتا رہا لیکن ہوا وہی جو اللہ تعالیٰ کا حکم تھا۔ صبح دونوں بھائی میرے والد اور میرے چچا آئے۔ والد صاحب گھر کے اندر داخل نہیں ہوئے، بھائی کو اندر بھیجا، وہ اندر آئے اور میری امی کو صرف اتنا کہا ''بہن اللہ کی چیز تھی اللہ لے گیا'' اور یہ کہہ کر باہر بھائی کے پاس چلے گئے۔ ایک طوفان تھا جو اٹھا اور پھر تھمنے میں نہیں آیا۔ ہمسائے عزیز رشتہ دار گھر کے اندر باہر لوگ ہی لوگ تھے۔ ہم سب تو ہوش و حواس ہی کھو چکے تھے۔ عصر کے وقت مسعود کی میت سلیوٹ وغیرہ کے بعد گھر بھیجی گئی۔ بکس کھولنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ سولو فلائٹ پر تھا، بلندی پر جا کر فضا میں اس کے جہاز کو آگ لگ گئی، جو سب لوگوں نے دیکھی اور جہاز منگھوپیر میں گر گیا۔ کہتے تھے کہ یہ فیوری اور ٹمپسٹ بمبار طیارے امریکہ نے دیے ہی ایسے تھے جن کو فضا میں ایک خاص بلندی پر جا کر خود ہی آگ لگ جاتی تھی اور یہ تمام طیارے ہمارے بہترین پائلٹوں کے جان لیوا ثابت ہوئے جن میں صدر سکندر مرزا کا بیٹا اور ہمارا ایک اور قریبی عزیز کا انتہائی قیمتی بیٹا سلیم بھی شامل تھے اور کئی ماؤں کے لال شہادت کا درجہ پا گئے۔

جیسے ہی میت گھر آئی اور قبرستان جانے کی تیاری تھی کہ آندھی کا بڑا زوردار طوفان اٹھا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا، ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے لان کی enterance پر دو سرو کے درخت تھے۔ ایک لمبا، ایک چھوٹا، لمبے والا سرو گر کر زمین بوس ہو گیا جنازے کا جلوس ایک میل لمبا تھا۔ لوگ پیدل چھاؤنی کے گرجے سے چلے اور لال کرتی قبرستان جا کر دفن کیا۔ والد صاحب نے قبر کے لیے خاص کتبہ بنوایا۔

ایک سال تو ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں کہاں اور کیسے گزر گیا، والد اور والدہ افسوس کرنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ والد باہر مردانے میں ہوتے۔ ذرا اندر آتے، پھر باہر چلے جاتے۔ میں ان دنوں لاہور کالج میں فرسٹ ائیر میں تھی، نہ کالج گئی نہ امتحان دیا۔ آخر کب تک، سال ضائع کر کے پھر فرسٹ ائیر سے پڑھائی شروع کی۔ وقت ہی سب سے بڑی مرہم ہے، ہم جو سمجھتے تھے کہ جیسے دنیا ہی ختم ہو گئی ہو، نہیں، سب کچھ ویسے ہی چل رہا تھا۔ ہم ہی سو گئے تھے، کھو گئے تھے، آہستہ آہستہ سب کی زندگیاں نارمل ہونے لگ گئیں۔ کبھی والد صاحب میری امی کو آواز دیتے، مریم ادھر آؤ خود اپنے پلنگ کے درمیان چارزانو ہو کر بیٹھ جاتے۔ امی جان کو سامنے بیٹھا لیتے پھر روندھے ہوئے گلے سے قدرے روتے ہوئے یہ شعر پڑھتے۔

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں
زلف کی رخسار کی باتیں کریں

مریم آؤ مسعود کی باتیں کریں میں نے زندگی میں ان کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے لیکن یہ شعر پڑھتے ہوئے وہ رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتے جاتے۔ مسعود کے حادثے کے ڈیڑھ دو مہینے کے بعد ذکا بھائی کی شادی تھی۔ چار بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے

انہوں نے بڑے چاہ سے شادی کرنی تھی مگر اس حادثے میں ہماری ہر طرح سے دلجوئی کی اور دکھ بانٹا۔

مسعود کی شہادت کا واقعہ ۹ نومبر ۱۹۵۱ء کو ہوا۔ اس سے ایک ماہ پہلے خاں لیاقت علی خان صاحب کی شہادت ہوئی تھی۔ پاکستان بنے تین چار سال کا عرصہ گزر چکا تھا، لوگ آہستہ آہستہ settle down ہو رہے تھے اور اپنے کلیمز دے کر جائدادیں حاصل کر رہے تھے اور جو مقامی لوگ تھے انہوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کے ہاتھ جو چیز بھی لگی ہندوؤں کے گھر یا دکانیں، کاروبار وغیرہ اس پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے۔ شریف اور خاندانی چاہے وہ مہاجر تھے یا مقامی گھاٹے میں رہے اور چالاک اور عامی لوگوں نے خوب ہاتھ رنگے اور اپنی نسلیں سنواریں۔

مسعود کے حادثے کے بعد بے چارے والد صاحب میں نہ وہ دم خم رہا نہ ولولہ اور جوش لیکن زندگی کی گاڑی تو چلانی ہی تھی ہم پانچ بہن بھائیوں کی شادیاں بڑے ٹھیک طریقے سے خوشیوں سے کیں۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد پاکستان کا جو کلچر بنا والد صاحب اس میں فٹ نہ ہو سکے۔ لوگوں کو لوٹ مار، بے ایمانی اور رشوت کا چسکا لگ چکا تھا۔ ساری قوم اللہ رسولؐ کے ساتھ کیے گئے قول کو بھول کر اپنی اقدار کو بھول کر، مادہ پرستی کی دنیا میں کھو چکی تھی۔ والد صاحب کے لیے یہ حالات بڑے مایوس کن تھے۔ میری امی سے بڑی بے چارگی اور حیرت سے یہ بات کرتے تھے کہ جس سے کوئی کام کی بات کرو تو پہلے رشوت مانگتا ہے۔ ان دنوں رشوت کا لفظ اپنی زبان سے ادا کرنا بھی بڑا معیوب تھا۔ ساری زندگی والد صاحب نے بطور انجینئر ہی کام کیا اور چھاؤنی کی تمام بڑی بڑی عمارتیں انہیں کی بنوائی ہوئی تھیں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں میو ہسپتال لاہور کا ایک کافی بڑا extention wing کا پراجیکٹ تھا جو آپ نے بنوایا (آج بھی وہ موجود ہے) لیکن کام کرنے والے ٹھیکیدار وغیرہ نے مل ملا کر سب پیسہ کھا پی چھوڑا اور والد صاحب کو بڑا خسارہ ہوا۔ والد صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو کچھ عجیب سا تھا، یوں تو جو شخص ان کے سامنے آتا اس کو اندر باہر سے پہچان جاتے تھے لیکن بعض لوگوں پر وہ ایسا اندھا اعتماد کرتے تھے کہ آخیر تک پہچان نہ پاتے تھے مثلاً جائداد کی دیکھ بھال کے لیے جو منشی رکھتے تھے، وہ انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹتے تھے لیکن ان کو بالکل پتہ نہیں چلتا تھا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک انہوں نے جو منشی رکھا ہوا تھا منشی اسحاق اس کے متعلق سب انہیں بتاتے رہتے تھے کہ یہ شخص دیانت سے آپ کا کام نہیں کر رہا لیکن وہ بالکل ماننے کو تیار نہیں تھے۔ یہاں تک کہ اس شخص نے انہی کے پیسوں سے شاندار گھر بنوایا اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہنے لگا۔ والد صاحب کی کمزوری کو جانتا تھا اور خوب لوٹتا رہا۔ بیٹے کو وکالت پڑھائی اور پھر ۱۹۴۵ء میں والد صاحب کے مقابلے میں الیکشن میں کھڑا کر دیا اگرچہ اس میں اس کی ضمانت ہی ضبط ہو گئی۔ پھر بھی والد صاحب منشی اسحاق کو کسی طرح بھی برا بھلا کہنے کو تیار نہ تھے۔ جائداد کے کام سے تو اسے ہٹا دیا لیکن وہ تو شطرنجوں کی پارٹی میں بھی ہوتا تھا اور باقاعدہ شطرنج کھیلنے کے لیے آتا رہتا تھا۔ اسی طرح بہت سی اور بھی مثالیں ہیں خاص طور پر جن کو منشی رکھتے تھے، وہ تو خوب خوب ان کا پیسہ لوٹتے تھے لیکن انہیں بالکل پتہ نہیں چلتا تھا۔ آخر وہ مالی طور پر اتنے بہتر ہو جاتے تھے کہ خود یہ ان کا کام چھوڑ دیتے تھے۔ میری امی اس بات پر بہت کڑھتی رہتی تھیں، اگر ان کے خلاف کوئی بات ان سے کہہ دیتا تو ہنس کر ٹال دیتے اور کئی دفعہ بہت برا مانتے۔ اسی طرح میو ہسپتال کی عمارت کا سارا خسارہ اپنے سر لے لیا اور ٹھیکیدار کو پوری رقم ادا کر دی۔ والد صاحب ابھی تک اپنے معمولات میں خوب مصروف رہتے تھے۔ بورڈ کے دفتر جانا، کچہری جانا، گھر پر سائلوں کے مسائل حل کرنا ہر اتوار کو شطرنج پارٹی جمانا،

چچا جان کا آنا اور ہلہ گلہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ہم سب شادی شدہ بہنیں گرمیوں کی چھٹیوں میں دو دو مہینے بچیوں سمیت آ کر رہتے اور ماں باپ کے گھر سے خوب خوب لطف اندوز ہوتے۔

انڈیا کے ساتھ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں گھر والوں کو محفوظ جگہوں پر بھجوا دیا اور خود حسب دستور ملازموں سمیت اسلحہ بند ہو کر اڈہ بنا کر اپنے گھر میں ہی جمے رہے۔اس جنگ میں لاہور کی چھاؤنی عین زد میں تھی۔اسوقت ان کی عمر ۸۰ سال سے اوپر ہی تھی، ہمارے والد کے گھر رات کو دروازوں کے پٹ بھی ساری رات کھلے رہتے تھے۔لوگ کہتے تھے کہ اکرم صاحب کے گھر رات کو قدم رکھ کر اپنی جان گنوانی ہے۔ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ تمام زندگی ان کو نیند نہیں آئی، یہ نہیں معلوم کہ یہ انہیں پٹھانوں سے گرفتاری کے بعد شروع ہوا کہ پہلے سے تھا، ساری رات گھر کے باہر ٹہلتے رہتے۔اکثر لوڈڈ بندوق ہاتھ میں ہوتی۔پھر رات کو بڑے اہتمام اور جوش وخروش سے خود کافی یا چائے بناتے اور پینے کے وقت میری امی کو آواز دیتے کہ آؤ تم بھی چائے پی لو۔وہ بے چاری ان کی ساری رات کی activity سے بیزار پڑی ہوتی تھیں۔چائے تو کیا پیتیں، وہ اپنے کمرے میں جا کر سو جاتیں۔نیند کے لیے بے چارے کئی حیلے کرتے رہتے، دوپہر کو جب آرام کے لیے لیٹتے تو ہم بچوں کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ ان کے سر کے بالوں کو پانی لگا کر ہم کنگھی کرتے رہتے۔گھنٹہ گھنٹہ بھر ہم کنگھی کرتے۔جب لگتا کہ سو گئے ہیں تو ہم دبے پاؤں بھاگنے لگتے۔اسی وقت آنکھیں کھول کر کہتے ''اچھا جا رہے ہو''۔ہم پہ اوس پڑ جاتی اور چار و ناچار پھر کنگھی لے کر کرنے لگتے کبھی کبھی ناخن بھی اتر واتے لیکن کسی طرح بھی ان کو نیند نہیں آتی تھی دوپہر کو کچہری سے آتے تو اکثر دوپہر کا کھانا اپنے کمرے میں یا سردیوں میں باہر دھوپ میں کھاتے۔کھانے کے متعلق بہت particular تھے ذرا کھانا اچھا نہ ہوا تو ناراض ہو جاتے۔کھانے کے ساتھ کا ٹا pork ہونا، بہت ضروری ہوتا تھا۔ اگر نہ رکھا ہوتا تو ایک دم غصہ آ جاتا۔کھانے کے بعد ایک بڑی ساری آرام کرسی پر لیٹ جاتے۔انہوں نے طرح طرح کی آرام کرسیاں بنوائی ہوئی تھیں۔گھر میں جگہ جگہ پڑی ہوتی تھیں۔اس پر لیٹ جاتے اور کوئی آدھ پون گھنٹہ نیند آ جاتی، خوب زور زور سے خراٹے لیتے۔بس یہی ان کی گھنٹوں کی ساری نیند ہوتی۔ایک طرف تو لوگوں پر اندھا اعتماد بھی کرتے تھے دوسری طرف اگر کوئی غلط کام کرتا تو اس کو بھی چھوڑتے نہیں تھے۔سینٹ جان بلڈنگ (حالیہ راحت بلڈنگ) کے اینگلن روڈ (حالیہ سرور روڈ) کے کونے میں ایک جگہ خالی تھی، وہاں پر ایک قصائی جسے پہلوان کہتے تھے، ان سے کئی برسوں سے اجازت مانگ رہا تھا کہ ایک تخت رکھ کر میں گوشت بیچا کروں لیکن یہ اجازت نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ بڑا غنڈہ ٹائپ کا شخص تھا۔بہر حال کافی عرصہ منت سماجت پر انہوں نے اجازت دیدی۔کچھ سالوں میں اس نے وہاں کھوکھا بنا لیا اور پھر آہستہ آہستہ دوکان کی شکل دیدی والد صاحب سے پوچھے بغیر۔انہوں نے اس کی سرزنش کی تو اس نے ڈھٹائی دکھانی شروع کر دی اور والد صاحب کے ساتھ غنڈوں والا رویہ دکھانے لگا۔والد صاحب نے اس پر مقدمہ کر دیا اور مقدمے کی پیشیاں ہوتی رہتی تھیں، اس پر اپنے وکیل محسن صاحب کو بھیج دیا کرتے تھے۔مقدمہ کافی لمبا ہو گیا۔اصل میں اس پر ترس کھا کر اسے سزا نہیں دلوا رہے تھے۔وہ بھی بیوقوفوں کی طرح اڑا ہوا تھا۔آخر خود مقدمہ کی پیشی پر گئے اسے ۵ سال کی قید ہو گئی اور کاروبار بھی ختم ہو گیا۔پانچ سال کے بعد جب رہائی ہوئی تو ہمیں سب کو بہت فکر تھی کہ وہ تو رہا ہوتے ہی چاقو لے کر والد صاحب سے بدلہ لینے آ جائے گا۔مگر رہا ہو کر وہ سیدھا والد صاحب کے پاس آیا اور آتے ہی قدموں پر سر رکھ دیا اور کہتا رہا کہ مجھے معاف کر دیں۔یہ

ان کی شخصیت کا خاص پہلو تھا کہ لوگ مسمرائز ہو جاتے تھے۔ پہلوان کو انہوں نے معاف کر دیا اور دوکان کی اجازت بھی دیدی جو آج تک اس کے بیٹے چلا رہے ہیں۔

میو ہسپتال کی عمارت کے پراجیکٹ میں جو خسارہ ہوا اس میں وہ قرض دار بھی ہو گئے تھے یہ ان کی زندگی کا ایک بالکل انہونا اور تکلیف دہ تجربہ تھا جس کا وہ کبھی کسی سے ذکر بھی نہیں کرتے تھے۔ آخر انہوں نے یہ سوچا کہ گھر کے اردگرد جو خالی زمین ہے اسے پلاٹ بنا کر بیچ دیا جائے۔ یہ ایک بہت مشکل اور جذبات اور انا کو ٹھیس پہنچانے والا فیصلہ تھا لیکن انہوں نے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا اور اس کا ذکر چچا جان سے کیا۔ انہوں نے والد صاحب کو مشورہ دیا کہ غیروں کے ہاتھ بیچ کر آپ بہت تنگ ہوں گے اور بیگانے لوگ گھر کے بیچ میں آ کر بیٹھ جائیں گے تو دل کو بہت تکلیف ہوگی، اس لیے بہتر ہے آپ اپنی اولادوں میں سے پوچھیں، اگر کوئی لے لے تو آپ کو تو خوشی ہوگی اور قرض بھی اتر جائے گا۔ مگر والد صاحب منکر تھے کہ میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ میں اولادوں کو بیچوں۔ بہر حال چچا جان نے یہ بات ہم لوگوں کو خاموشی سے convey کی۔ ۱۹۶۷ء کی بات ہے اس زمانے میں چھاؤنی میں زمین کا ریٹ ۸۰۰۰ روپے فی کنال تھا۔ ۴ کنال زمین میرے بہنوئی (منجھلے) نے خرید لی اور دو کنال ہم نے۔ اس وقت ہم دو کنال کے پیسے نہیں دے سکے، صرف ایک کنال کے دیے اور ۲ سال بعد دوسرے کنال کے دیے۔ میرے بہنوئی نے چار کنال پر اپنی کوٹھی بنوائی جو بطور انجینئر کے میرے میاں نے بنوائی۔ یہ ۱۹۷۲ کی بات ہے۔ چار سال بعد ہم نے بھی اپنے دو کنال پر گھر بنا لیا۔ میری دو بڑی بہنیں بیوہ تھیں، والد صاحب نے اپنے گھر کے پچھلے حصے میں ان دونوں کی رہائش کے لیے Independent Portions بنوا دیے تھے۔ وہ دونوں وہاں رہتی تھیں اور کھانا پینا والد صاحب کے ساتھ ہی تھا۔

۱۹۷۲ء میں ہمارے انتہائی پیارے چچا جان ڈاکٹر یوسف کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب کو ان کے ساتھ اور ان کو والد صاحب کے ساتھ عشق تھا۔ ساری زندگی لمحہ لمحہ دونوں اکٹھے جیے۔ آخری وقت بھی چچا جان نے والد صاحب کو بلوایا کہ میرے بھائی جان کو بلوا دیجیے۔ ہم سب ہی چلے گئے۔ والد صاحب نے جا کر پلنگ کے ساتھ کرسی ڈلوائی اور بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئے۔ دونوں گل و بلبل کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آہستہ آہستہ ان کی سانسیں ختم ہو گئیں۔..... مسعود کی شہادت کے بعد والد صاحب کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ ہر وقت دونوں گھروں اور بھائیوں کا آپس میں جانا آنا لگا رہتا تھا۔ وہ ختم ہوا اور شطرنج کی محفلیں سب ختم ہو گئیں۔ دونوں بھائی جب مل کر بیٹھتے تو بچپن کی بہت باتیں کرتے۔ ماں باپ کو انتہائی محبت اور احترام سے یاد کرتے اور گھنٹوں بچپن کی باتیں کرتے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ہم سب کن اکھیوں سے انہیں دیکھتے کہ یہ کیسے بچوں کی طرح ہنس رہے ہیں۔

اس وقت والد صاحب کی عمر ۸۰ سال سے اوپر ہی تھی لیکن وہ بالکل صحت مند اور چاک و چوبند تھے اکثر ڈرائیور کو پیچھے بیٹھا کر گاڑی خود ہی چلایا کرتے تھے۔ مگر دوسری طرف اس بات کے لیے بھی بالکل تیار تھے کہ اب کسی لمحے میرا بھی وقت ختم ہو سکتا ہے۔ اسکے لیے پورے بندوبست کر رکھے تھے۔ اپنی میت کے لیے لکڑی کا بڑا مضبوط اور زبردست بکس بنوایا ہوا تھا۔ وہ ہر ایک سٹور میں رکھا رہتا تھا اور اس سٹور کا تالا ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ خود اس کو کھلوا کر دیکھتے رہتے ہوں۔ کیونکہ ان کی فوتیدگی پر جب وہ نکالا تو

بالکل ایسے کورا اور صاف تھا جیسے ابھی بن کر آیا ہو۔ ادھر قبرستان میں میرے بھائی مسعود کی قبر کے ساتھ اپنی قبر بنوائی ہوئی تھی۔ اوپر درخت لگوائے ہوئے تھے۔ پاس سیمنٹ کی رحل بنی ہوئی تھی۔ قرآن پاک رکھا ہوا تھا۔ پڑھنے کے لیے کتبہ لگا ہوا تھا جس پر آیت کریمہ کندہ تھی۔..... چوکیدار کا باقاعدہ ماہانہ لگایا ہوا تھا کہ وہ ان کی قبر کی خاص دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہ ہر مہینے پیسے لینے آیا کرتا تھا گھر پر وہ بتاتا تھا کہ اکثر قبرستان آ کر قبر میں لیٹا کرتے تھے۔

والد صاحب کا سونے کا کمرہ کافی حد تک ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک بڑا سا پلنگ، سرہانے کی دونوں طرف بیڈ سائیڈ ٹیبل، جن پر لیمپ اور مطالعے والی کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں کتابوں والی خوبصورت سی گھومنے والی الماری پڑی ہوتی تھی۔ شبلی نعمانی کی ساری کتابیں، علامہ اقبال کے پورے کلام کے خوبصورت سیٹ، شاہنامہ اسلام (حفیظ جالندھری صاحب سے تو کافی دوستی تھی) اولیاء اللہ کی کتب، مرزا غالب، حالی، اقبال اور انگلش کے بہت ساری شکار وغیرہ کی کتابیں۔ یہ الماری مینٹل پیس کے ساتھ ایک کونے میں پڑی ہوتی تھی۔ مینٹل پیس کے دوسری طرف کونے میں نماز والا تخت پڑا ہوتا تھا جس پر وہ اکثر فجر کے بعد پنج سورۃ بلند آواز میں پڑھا کرتے تھے اور اسی پر بیٹھ کر عشاء کے بعد اپنی پسندیدہ شاعری بلند آواز میں ترنم سے پڑھا کرتے۔ کمرے کا ایک دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا اور دوسرا ڈائننگ روم میں۔ کمرے کے تیسرے کونے میں ان کا انتہائی خوبصورت اور شاندار رائٹنگ ٹیبل اور کرسی رکھی ہوتی تھی۔ یہ ایک نادر قسم کا میز تھا۔ چوتھے کونے میں ایک الماری نما میز ہوتا تھا اس میں ان کا چائے اور کافی کا سامان، الیکٹرک کیٹل، الیکٹرک ٹوسٹر، کافی پرکولیٹر، ایک بڑا خوبصورت سا بٹر کپ اور کراکری کا تھوڑا سامان۔ اس میز کی دیکھ بھال اور رات کی روزانہ تازہ ڈبل روٹی اور دودھ رکھنا ہم بہنوں کی ذمہ داری ہوتی تھی جو اکثر ہم چھوٹے ملازم لڑکے کے سپرد کر دیتے تھے۔ وہ چیزوں کی ذمہ داری رکھتا اور صبح سارے میلے برتن نکالتا اور میز صاف کرتا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر کئی سینریز اور بہت ساری فوٹوگرافی کی تصویریں لگی رہتی تھیں جن کو بدلتے بھی رہتے تھے۔ اگلی پرانی ہو جاتیں تو کوئی اور لگا لیتے۔ ۱۹۶۴ء میں جب انہوں نے اپنا ایک تاریخی دورہ قید والے علاقے کا کیا تو وہاں کی بہت سی تصویریں لائے جو بڑی کروا کے اور فریم کروا کے اپنے کمرے کی دیواروں پر لگائیں۔

۱۹۷۵ء میں والد صاحب نے سینٹ جان بلڈنگ (راحت بلڈنگ) بیچ دینے کا سوچا۔ باری باری سے ہم سب بہن بھائیوں کے گھر آئے اور پوچھا کہ میں بیچ دوں۔ آپ لوگوں کو تو کوئی اعتراض نہیں۔ ہم سب نے بیک زبان یہی عرض کیا کہ آپ کی چیز ہے جیسے آپکا دل چاہے کیجیے اور دامادوں نے کہا کہ ہمارا تو کوئی تعلق ہی نہیں آپ کی چیز ہے جیسے مرضی آئے کریں۔ بلڈنگ کا واحد خریدار راحت بیکری کا مالک غلام نبی تھا جو برسوں سے والد صاحب کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ میرے ہاتھوں بیچ دیں۔ اس کے ساتھ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ ۱۹۴۰ء کی بات ہے میرے چچا جان میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے ان کے ہمسایہ میں سردار بہادر خان کا گھر تھا جو اس وقت کے مشہور نومسلم تھے اور بڑے امیر کبیر آدمی تھے۔ غلام نبی ان کے بچے کھلایا کرتا تھا۔ اس کی دوستی میرے چچا کے ڈرائیور سے بہت تھی۔ جو یوپی کا رہنے والا تھا اور سید ذات کا تھا۔ اس کا بھائی ہمارے ہاں ملازم تھا ان کو میرے والد نے ہمارے دادا کی خدمت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ سب لاہور ہمارے پاس آ گئے۔ یہ سارے بہت شریف اور وضع دار لوگ تھے۔ ہم سب آج

تک ان کی بڑی عزت کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے ہمارے بزرگوں کی بہت خدمت کی۔غلام نبی کئی سال میرے والد کو اس ڈرائیور کے ذریعہ سفارش کرواتا رہا کہ بلڈنگ کے باہر کونے میں مجھے ایک کھوکھا بنانے کی اجازت دے دیں میں دکانداروں کو چائے سپلائی کیا کروں گا۔کئی سال تو میرے والد نہیں مانے، آخر اسے اجازت دے دی اور اس نے چھوٹا سا چائے پانی کا کھوکھا وہاں بنا لیا۔آہستہ آہستہ اس نے بلڈنگ میں سے ایک دوکان کرایہ پر لے لی، پھر دوسری بھی لے لی۔غلام نبی کے بہت سارے بھائی تھے۔لاہور کے قریب ہی کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔سب نے مل کر خوب محنت کی اس وقت لاہور میں کوئی کام کی بیکری نہیں تھی۔شیزان نے بھی نیا نیا کام شروع کیا تھا۔اللہ پاک نے ان پر دولت کی بارش کر دی۔چند برس میں کروڑ پتی ہو گئے۔کئی سال کی منتوں کے بعد اس نے والد صاحب کو منا لیا اور اونے پونے میں سینٹ جان بلڈنگ خرید لی۔بلڈنگ کے پیچھے بہت سارا رقبہ مکانات مسجد اور کافی نفع بخش چیزیں شامل تھیں۔سو غلام نبی ۱۹۷۶ میں بلڈنگ ۱۴ لاکھ میں خرید لی اس زمانے کے لحاظ سے بھی کافی سستی بک گئی۔کافی مہینوں کی سوچ بچار کے بعد والد صاحب نے اپنی زندگی ہی میں ہمیں سب کو شرعی حصے دینے کا فیصلہ کیا قریباً سوا سوا لاکھ بیٹیوں کو اور ڈھائی لاکھ بیٹے کو دیا۔اور شہید بیٹے کے نام کا گلاب دیوی ٹی بی ہسپتال میں ایک فیملی یونٹ بنوایا۔شریعت کا یہاں تک خیال رکھا کہ کچھ رقم خاندان کی دو یتیم بچیوں کے لیے مجھے دی کہ وہ بڑی ہوں تو ان کو دے دینا۔میں نے ان کے دو چھوٹے چھوٹے سونے کے سیٹ بنوا کر رکھ لیے اور ان کی شادیوں پر والد صاحب کی طرف سے ان کو دے دیے۔والد صاحب نے باقی ماندہ تھوڑی سی رقم اپنے لیے اپنے پاس رکھی۔داماد وں نے ان کو تھوڑا منع بھی کیا کہ حصے نہ دیں رقم اپنے پاس ہی رکھیں لیکن وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ان رقوم سے ہم سب کو بہت فائدہ ہوا اور اس زمانے میں ہمارے دو دو کنال کے گھر اتنے پیسے میں بن گئے۔

اکتوبر ۱۹۷۷ء میں میری تیسری بہن کے میاں کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ہمارے سارے خاندان میں وہ بہت قد آور شاندار اور محبوب شخصیت تھے۔عزیز الرحمٰن نام تھا اور بالکل اسم بامسمّٰی تھے۔جب نیشنل بنک وجود میں آیا تب سے ہی وہ مختلف جگہوں پر مینیجر کے فرائض انجام دیتے رہے۔اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ریٹائر ہونے پر سیکرٹری سٹاک ایکسچینج تھے کہ آفس میں بیٹھے بیٹھے ہارٹ فیل ہو گیا۔سارا خاندان سوگوار ہو گیا۔والد صاحب کو ان سے خاص دلی لگاؤ تھا۔اپنے ہر قسم کے خانگی اور مالی مشورے ان سے کیا کرتے تھے۔ان کے جانے سے اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرتے تھے اور اس بات کا اکثر ذکر بھی کرتے تھے۔میری ان بہن کے تین میں سے دو بچے ایک بیٹا بیٹی اس وقت پاکستان سے باہر تھے۔ایک بیٹی بہاولپور میں تھی، اس کے میاں وہاں میڈیکل کالج میں سرجری کے پروفیسر تھے۔میری بہن کے لیے اکیلے اتنے بڑے گھر میں گارڈن ٹاؤن میں رہنا ممکن نہیں تھا۔یہاں والد صاحب کے گھر کے بالکل قریب نئے فلیٹ بن رہے تھے انہوں نے ایک فلیٹ خرید لیا اور وہ بھی ماں باپ کے بالکل قریب آ گئیں۔ہماری اس بہن نے ماں باپ کی وفات تک ان کی بہت خدمت کی۔اپنی زندگی ان دونوں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ہمارے اکلوتے بھائی نے بھی ماں باپ کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر اپنا گھر بنا لیا تھا۔میری بہن سلمٰی نے بھی عابد مجید روڈ پر گھر بنا لیا ہوا تھا اس کے میاں بھی ڈاکٹر تھے۔اس طرح اللہ پاک نے بڑھاپے میں ان کی ساری اولاد کو ان کے اردگرد اس طرح لا بسایا کہ درمیان میں وہ محور و مرکز تھے اور ہم سب ہر وقت ان کے وجود سے ہر طرح فیضیاب بھی ہوتے تھے اور ہر طرح سے ہر وقت ان کے خدمت گزار بھی

ہوتے تھے۔ یہ ان پر اور ہم سب بہن بھائیوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہوا جو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ الحمدللہ عید پر اور خوشی کے موقع پر ہم سب ان کے گھر میں ہی اکٹھے ہوتے تھے۔ ہم ماشاءاللہ پچیس تیس ان کے اولادیں ہر وقت ان کے اردگرد ہی ہوتے تھے۔ وہ ہم سب سے لطف اندوز ہوتے اور ہم اور ہمارے بچوں کو ان کی وہ رونقیں اور محبتیں اب یاد آتی ہیں تو دل بھر آتا ہے۔

اس وقت والد صاحب کی عمر نوّے سال کے قریب ہو رہی تھی۔ صحت تندرستی اور ذہنی لحاظ سے بالکل تندرست تھے ماشاءاللہ، لیکن اب انہوں نے زیادہ تر گھر پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھار ڈرائیور کے ساتھ گاڑی پر کہیں نکلتے لیکن بہت کم۔ ان کے سب ہم عمر اور ہم عصر اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اتنی متحرک اور نفیس زندگی گزارنے کے بعد ایک دم سے بے کار ہو جانا تو انسان کے لیے زہر قاتل ہی ہوتا ہے۔ بہر حال میری امی بالکل صحت مند اور چاک و چوبند تھیں وہ ان کے ساتھ ہر وقت مصروف رہتیں۔ ان کے ہر طرح کے کام اور ضروریات حصہ پورا کرتیں جس سے ان کی گھر بیٹھے بھی تشنگی رہتی۔ کبھی کبھی کچھ لکھتے پڑھتے بھی تھے۔

۱۹۸۱ء کی بات ہے میری امی کھانے کمرے کے ساتھ پینٹری میں ہاتھ دھو رہی تھیں کہ نیچے فرش پر گر گئیں اور کولھے کی ہڈی کا جوڑ ٹوٹ گیا۔ ان کی عمر بھی اس وقت ۸۰ سے اوپر ہی تھی۔ وہ ایک ایسی ہستی تھیں کہ گھر کا سارا نظام انہی سے چل رہا تھا۔ سارا خاندان ان کے اردگرد گھوم رہا تھا۔ بڑی پیاری شخصیت تھیں۔ والد صاحب کی تمام دیکھ بھال وہ ایسے کرتی تھیں جیسے ہاتھ بندھی غلام ہوں۔ ان کے اس طرح جانے سے سارا خاندان ہل کے رہ گیا۔ وہ نو دس سال بستر پر رہیں ملازم پرانے اور مخلص تھے گھر کو ایسے تیسے کر کے چلاتی رہیں۔ ہم سب بھی قریب ہی ہوتے تھے جتنی ہو سکتی تھی ماں باپ کے گھر کی دیکھ بھال اور نگہداشت میں شامل رہتے تھے۔ امّی کے معذور ہو جانے کی وجہ سے سب سے زیادہ ذمّہ والد صاحب پر پڑی۔ میری بڑی بہنوں نے ہر طرح ان کی خدمت گزاری اور دلداری کی ذمہ داری اٹھائی لیکن والد صاحب تو بس پھر بیٹھ ہی گئے۔ اس سے پہلے کبھی کبھار ڈرائیور کے ساتھ رشتہ داروں کے ہاں چلے جایا کرتے تھے۔ وہ بالکل ہی چھوڑ دیا، مطالعہ بھی ختم۔ ڈرائنگ روم میں بڑے صوفے کے کونے میں بیٹھے رہتے تھے۔ انہیں ملنے والے پوتے، نواسے آتے جاتے رہتے۔ ایک دفعہ اس زمانے کے مشہور صحافی م۔ش ملنے آئے تو بہت خوشی سے باہر لان میں کرسیاں ڈلوائیں اور ان سے باتیں کرتے رہے۔ اسی طرح برس بیت گئے۔ خود کہتے تھے کہ میں enxiety کا مریض ہوں۔ اور کسی سکالر کا مقولہ بتاتے کہ وہ کہتا ہے کہ یہ مرض کینسر سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بظاہر تو سکون اور آرام سے سارا دن صوفے پر بیٹھے رہتے لیکن چہرے پر اضطراب کی پرچھائیاں نمایاں رہتیں۔

رفتہ رفتہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹنا شروع کر دیا اور پھر اٹھ کر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا:

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اس ختمِ عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

یوں لگتا تھا کہ اپنی زندگی کی طوالت سے بیزار اور نڈھال ہو گئے ہوں کبھی کبھی اپنے اندر کے اضطراب کو باہر نکالنے کے لیے کسی نہ کسی کو بلند آوازوں میں پکارنا شروع کر دیتے۔ کبھی اپنے فوت شدہ بزرگوں کو، کبھی بھائی رحمت اللہ کے بچوں کو، کبھی میری امی کو، جو اب اٹھ کر ان سے ملنے بھی نہیں آ سکتی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر ہوتیں اور یہ اپنے کمرے میں۔ شروع شروع میں تو ہم کسی وقت ان کو ایک

دوسرے سے ملواتے تھے لیکن پھر وہ بھی ممکن نہ رہا۔ والد صاحب کے دوست احباب بہن بھائیوں سب کی وفات ہو چکی تھی۔ زیادہ وقت تو بظاہر پرسکون ہی رہتے تھے لیکن تنہائی ان کے اندر کے اضطراب کو دم بدم بڑھا رہی تھی۔ ہم اور ہمارے بچے اس بات کا بہت دھیان رکھتے تھے کہ وہ کسی وقت بھی اکیلے نہ ہوں اور باری باری ان کے پاس بیٹھتے تھے اور باتیں وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے اردگرد میں دلچسپی لینی بھی چھوڑ دی۔ ان کی رات بڑی تکلیف میں گزرتی۔ ہم سب باری باری رات کو ان کے پاس رہتے اور سب باقاعدہ ڈیوٹیاں دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب کبھی میں ان کے پاس رات کو ہوتی تو اگر ماضی کی ان کی یادوں کو میں کریدتی تو ایک دم ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آجاتی اور بڑے ہوش وحواس سے اور جوش اور جذبے سے ماضی کی باتیں سناتے اس وقت میرا بہت دل چاہتا کہ کسی طرح ان کی باتیں ریکارڈ کرلوں لیکن افسوس سستی کی۔ ایک ٹومی کو تھپڑ مارنے والا قصہ بھی مجھے خود انہوں نے سنایا۔ پھر میں نے پوچھا سنا ہے کہ ہمارے پرنانا نے جب King Edward میڈیکل کالج کھلا ہی تھا تو وہاں سے میڈیکل کیا تو بیسویں صدی میں وہ ساری باتیں سنائیں کہ کیسے وہ کالج ایک عمارت میں جہاں آجکل انارکلی ہے وہاں سے شروع کیا گیا اور کیسے پڑھائی ہوتی تھی۔ میڈیم اردو تھا لیکن Terminology ساری انگریزی میں ہوتی تھی۔ بہت تفصیل سے بتاتے رہے۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ دیکھ بھال کے معاملے میں بڑے خوش نصیب تھے کہ ہم سب تو پاس ہوتے ہی تھے لیکن ان کو سنبھالنے کے لیے ایک کشمیری بچہ جو اب جوان لڑکا تھا جس کا نام حمید تھا وہ ان کی بہت ہی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا تھا۔ انتہائی محبت سے ان نہلانا روزانہ کپڑے تبدیل کروانے باتھ روم لے جانا، لانا، کھانا کھلانا، ان کا بستر ٹھیک رکھنا، غرض ہر طرح کی ضروریات ہر وقت بجالانی۔ پھر ان کی وقت بے وقت کی مزاج کی درشتی کو بخوشی برداشت کرنا۔ کئی برس تک اسی خندہ پیشانی سے وہ خدمت کرتا رہا یہاں تک کہ آخری غسل بھی دیا۔ قبر میں بھی اتارا۔ اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر عطا فرمائیں۔ ہم سب اس کے بہت احسان مند ہیں۔ آج کل وہ واپڈا میں ملازم ہے۔ بال بچے دار ہے۔

وقت اسی طرح ہمارے درمیان سے پھسلتا رہا اور ہم سب کو آگے دھکیلتا گیا۔ ہمارے بچے بھی ماشاءاللہ جوان ہو گئے۔ میری بڑی بیٹی کی شادی والد صاحب کے بڑے جانی دوست شیخ محمد افضل کے بیٹے سے ان کی زندگی ہی میں ہوئی۔ شادی میں بڑی خوشی سے شامل ہوئے۔ میرا بیٹا M.B.B.S کر کے میو ہسپتال میں اللہ کے فضل سے میڈیکل آفیسر لگا ہوا تھا، والد صاحب کی صحت کی دیکھ بھال میرے محترم بہنوئی ڈاکٹر اسدالرحمٰن اور میرا یہ بیٹا ہی کرتے تھے۔ بیٹے نے کہہ رکھا تھا کہ اگر آپ دیکھیں کہ ابو جی کو ذرا سا بھی نزلہ زکام شروع ہے تو میرے سے پوچھنے کا انتظار بھی نہیں کرنا اور یہ کیپسول ان کو دینے شروع کر دینے ہیں اور ہم ایسے ہی کرتے۔ اس طرح وہ تھوڑے بہت بیمار ہو کر ٹھیک ہو جایا کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۹۰ء کی بات ہے صبح آٹھ بجے والد صاحب کے گھر سے ملازم آیا کہ جلدی آئیں، ان کے سانس کی آواز بہت اونچی آرہی ہے۔ دو قدم کا فاصلہ تھا میں اور میرا بیٹا ایک منٹ میں ان کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے سانس کی خرخراہٹ کافی تشویشناک تھی۔ میں ان کے سرہانے بیٹھ گئی اور بیٹا عارف پلنگ پر بیٹھ کر کبھی سینے پر مالش کرتا کبھی ان کو کروٹ دلانے کی کوشش کرتا اور ساتھ ساتھ بلند آواز میں انہیں کہتا جاتا ''ابو جی کھانسی کریں، ابو جی کھانسیں، ابو جی بلغم نکالیں'' ان کا سر میرے بازو پر تھا اور میں بڑے غور سے ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے جیسے ہم ان کو آوازیں دیتے

اور بلاتے تھے ان کے چہرے اور سارے جسم کا انداز ایسے تھا جیسے کہہ رہے ہوں خدارا مجھے ڈسٹرب نہ کرو مجھے بہت لذت آ رہی ہے۔ وہ چہرے پر ہر وقت جو کرب اور تکلیف کا تاثر ہوتا تھا وہ سرے سے غائب تھا اور ایک عجیب سرور کی سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ میرا بیٹا ان کے سینے پر ہلکے مکے بھی مار رہا تھا اور سانس دلانے کی کوشش بھی کر رہا تھا اور ابو جی ابو جی اونچی آواز میں بلا رہا تھا لیکن ابو جی کو تو پتہ نہیں کیا نظر آ رہا تھا کہ وہ اس کی لذت میں مگن تھے۔ ہار کر میں نے کہا "بیٹا چھوڑ دو ان کو جانے دو" وہ پلنگ پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور والد صاحب کی آنکھوں کی چمکیلی پتلیاں پتھرا گئیں۔ لیکن چہرہ طمانیت اور خوشی سے دمک رہا تھا۔ میرے بیٹے نے مجھے بانہوں میں لے لیا اور ہم دونوں ماں بیٹا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

اتنے میں اردگرد کے کمروں سے سب لوگ اور ملازم آ گئے۔ کسی نے پکڑ کر ان کے سر کے گرد کپڑا باندھ دیا۔ اور پھر وہی ماتم والے گھر کا نظارہ۔ لوگوں کا ہجوم کفن دفن کا بندوبست۔ ان کے سب کام بڑی آسانی سے ہو گئے، ان کی ہستی اور مقام کے مطابق ٹھیک ٹھاک ہوتے چلے گئے۔ وہ بکس پچھلے پندرہ سال سے بند پڑا تھا نکلوایا تو بالکل صاف ستھرا اور کورا تھا۔ پوتوں نواسوں اور اس بچے حمید نے مل کر نہلایا اور آخری سفر کے لیے ان کو میت والے پلنگ پر ڈال دیا۔ چہرے کے اردگرد گلاب کے پھولوں کے ہاروں نے ان کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ نزع کے وقت جو سرور اور لذت کا تاثر ان کے چہرے پر تھا، اب سکون اور اطمنانیت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ظہر کے وقت مرد جنازہ اٹھانے کے لیے اندر آئے اور کلمہ شہادت کے ساتھ چارپائی زمین سے اٹھالی گئی۔ میرے سینے سے ایک ہوک چیخ کی طرح نکل گئی۔ اباجی اور میں وہیں زمین پر بیٹھ گئی میری بھانجی صبیحہ نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

گھر کے قریب عابد مجید روڈ پر مسجد النور میں جنازہ پڑھایا گیا۔ والد صاحب کے سارے عمر کے دوست اور میرے استاد مکرم محترم حافظ منظور احمد صاحب نے جنازہ پڑھایا اور پھر قافلہ اپنے سالار کو لے کر لال کرتی کے قبرستان کی طرف چل پڑا۔ ادھر صدر کی تمام مسجدوں میں والد صاحب کی وفات کا اعلان ہو چکا تھا۔ وہاں صدر کی بڑی جامع مسجد میں دونوں چورستوں کے درمیان سڑک پر لوگوں کا ہجوم جنازے کے لیے منتظر جمع تھا۔ وہاں پہنچتے ہی صفیں درست ہو گئیں اور صدر کے لوگوں نے اپنے محسن اور مربی کو نماز جنازہ پڑھ کے خراج عقیدت و تحسین پیش کیا۔ محترم حافظ منظور صاحب ساتھ ہی قبرستان گئے اور پوری دوستی نبھائی۔ وہاں والد صاحب کی آخری آرامگاہ برسوں سے ہاتھ پھیلائے چشم براہ تھی۔ بیٹے، دامادوں، پوتوں، نواسوں اور محبت کرنے والوں نے مل کر قبر میں اتارا اور پھر قبر پر مٹی ڈالی۔ کتبے پر کئی سال پہلے کی لکھی قرآن پاک کی آیت فرما رہی تھی:

رَبِّ اَدخِلنِی مُدخَلَ صِدقٍ وَّ اَخرِجنِیْ مُخرَجَ صِدقٍ وَّجعَل لِّی مِنْ لَّدُنکَ سُلطَانًا نَّصِیرًا.

اور وہ واقعی اس میں داخل ہو گئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
(آمین)

مکتوبات

مختار الدین احمد بنام مشفق خواجہ

محبی جناب مشفق خواجہ صاحب السلام علیکم

دو مکرمت نامے (۲۶/ ۴، ۸/ ۵) ۱۶/ کو موصول ہوئے۔ اب کی بار آپ نے بہت انتظار کرایا۔ اتنا کہ آپ کی طرف سے تردد پیدا ہو گیا تھا، لیکن اچھا ہوا کہ اس دوران میں کتاب نما (مئی) میں آپ کا کالم چھپ گیا۔ اس سے آپ کی طرف کی خیر و عافیت معلوم ہو گئی۔ اب آپ کے خطوط آئے تو ان سے معلوم ہوا کہ آپ سیر و سیاحت میں مشغول رہے۔

۲۳/ مارچ کو جشن جمہوریت کی مختصر کارروائی ٹی وی پر دیکھی تھی، ۲۴/ کو ذرا تفصیل سے یہ پروگرام دکھایا گیا۔ قومی اور ثقافتی پروگرام ممکن ہے وہاں کے شائقین نے پسند کیا ہو لیکن مقامی رنگ اس قدر گہرا تھا کہ میری دلچسپی کا ندرہا۔ ہاں فریدہ خانم کا نغمہ پسند آیا لیکن وہ غزل تک اپنے کو محدود رکھتیں تو اچھا ہوتا۔ میری دلچسپی کا پروگرام تو یہ تھا کہ آپ جیسے احباب کو صدر مملکت سے انعام لیتے ہوئے دیکھا۔ اس رات ڈائری میں میں نے لکھا ہے: ''جمیل جالبی کو ہلال پاکستان ملا''۔ (جمیل الدین عالی نے پھر کالم لکھا ہو تو عجب نہیں)۔ مشفق خواجہ اور وحید قریشی کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی تفویض ہوا۔ خواجہ صاحب شروانی میں ملبوس نظر آئے، تعجب نہیں اسی موقع کے لیے انہوں نے سلائی ہو، ورنہ میں نے تو کبھی انہیں شروانی میں ملبوس نہیں دیکھا۔ اچھے لگ رہے تھے۔ تہنیت کا خط لکھوں گا۔ لاہور کے مصور اسلم کمال (طفیل مرحوم کے دوست) کو بھی کوئی انعام ملا ہے، میں ٹھیک سے سن نہیں سکا، جاوید سے پوچھوں گا''۔

اچھا ہوا آپ جہلم جا کر قدوائی صاحب سے مل آئے۔ کیا انھوں نے خطوط لکھنے بند کر دیے ہیں، وہ تو بہت تفصیلی خطوط لکھا کرتے تھے۔ آپ کی اطلاع پر میں نے ان کی بیگم کی وفات پر تعزیت کا خط انہیں لکھا تھا، جواب نہیں آیا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کی علالت کا حال سن کر تردد ہوا، خدا انہیں جلد صحت مند کرے۔ ''قومی زبان'' کا مالک رام نمبر آج کی ڈاک سے بھی نہیں آیا، آئے گا تو آپ کے احباب میں تقسیم کرا دوں گا۔ مطمئن رہیں۔

اردو اور ''قومی زبان'' کے مطلوبہ شماروں کی فہرست پھر بھیجتا ہوں: رسالہ ''اردو'' ۱۹۹۱ء کے بعد کے شمارے اب تک کے جلد ۶۷ (۱۹۹۱) کا شمارہ ۴ مرسلہ پیکٹ میں نہیں تھا، وہ بھی مطلوب ہے۔ ''قومی زبان'' اگست ۱۹۹۲ء تک کے شمارے آ چکے ہیں ان کے بعد کے اب تک کے شمارے مطلوب ہیں۔

انجمن سے قطع تعلق تو ہرگز نہ کیجیے۔ مولوی صاحب کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ حالات بہتر ہوتے تو کوئی حرج نہیں تھا

لیکن اس وقت جب کشتی منجدھار میں ہے۔آپ جیسا ناخدا الگ ہو گیا تو کیا ہو گا۔

عرشی مرحوم کے خطوط بھیجیے اور قاضی صاحب کے بھی اگر کچھ اور مل جائیں۔'نیا دور' میں شائع شدہ اگر عرشی کے خطوط بنام مسعود حسن رضوی کے عکس میں نے طلب کیے ہیں جنھیں اکبر حیدری نے شائع کیے ہیں تو وہ اب نہ بھیجیے۔'نیا دور' (خاص نمبر مارچ ۱۹۸۵) اپنے کتب خانے ہی میں مل گیا ہے لیکن اگر میں نے دوسرے خطوط کے عکس منگوائے ہوں تو وہ ضرور روانہ کیجیے۔

''غالب آگہی'' (قدرت نقوی) ضرور ارسال کیجیے۔قریشی صاحب نے یہ کتاب کیا آج تک بزم اقبال اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کی سیکڑوں مطبوعات میں سے ایک کتاب بھی کبھی نہیں بھیجی۔ میں نے ایک آدھ بار لکھا بھی، جواب نہ آیا تو میں بھی خاموش ہو گیا۔اصل یہ کہ ڈاک کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ایک بار لاہور میں ان کے دفتر گیا تھا تو اپنے رسالے کے تین شمارے انھوں نے مرحمت فرمائے تھے۔اس کے بعد پچھلے سال کا سالنامہ آیا تھا جس میں خواجہ صاحب کے خطوط بنام اسلوب احمد انصاری چھپے تھے۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ یہ شمارہ آپ نے بھجوایا ہو گا، اس سے کہ اس کے بعد پھر اس رسالے کا کوئی نمبر نہیں آیا۔

وحید قریشی صاحب کے اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر ہونے کی خبر سے بہت خوشی ہوئی۔وہ بڑے فعال آدمی ہیں، جتنی کتابیں انھوں نے ان دو اداروں سے مختصر سی مدت میں شائع کی ہیں کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔اقبال اکیڈمی بڑا ادارہ ہے، مالی وسائل کی کمی نہیں، اب انگریزی اردو رسائل کے ساتھ وہ اچھی کتابیں بڑی تعداد میں شائع کر سکیں گے۔اسلم صاحب اور غلام حسین ذوالفقار صاحب کے نئے عہدے انہیں مبارک ہوں۔خدا کرے کچھ اچھی کتابیں وہ جلد شائع کریں۔آپ نے اطلاع دی ہے کہ صدارتی اعزاز کے ساتھ وحید قریشی صاحب کو پچاس ہزار یا ۵۱ ہزار روپے ملے ہیں۔وہ یہ روپے کیا کریں گے ان سے کہیے کچھ اور روپے ملا کر وہ عالمی سفر کا رعایتی ٹکٹ خرید کر دنیا کی سیر کو نکل جائیں۔ایران تو وہ ہو ہی آئے ہیں۔ڈاکٹر نذیر احمد صاحب یہاں سے گئے تھے ان سے ان کی خیریت معلوم ہوئی اور لاہور کے سفر کا حال بھی۔

محمد حبیب خاں صاحب نے اطلاع دی تھی کہ ''آجکل'' (اپریل) انہوں نے آپ کو بھیج دیا ہے۔''نقد و نظر'' میں اسلوب صاحب کا مضمون چھپا تھا وہ آپ کو مل چکا ہے۔۱۶/اپریل یکشنبہ کے قومی آواز کے ادبی حصے میں مالک رام پر میرا مضمون چھپا تھا اس کا تراشہ میں نے ڈاک سے بھیج دیا ہے۔ ۲۵/۴ کے آپ کے خطوں میں اس کا ذکر نہیں کیا 'دائرے' اب بھی نکل رہا ہے' دو ایک سال سے نہیں آیا۔ڈاک کا محصول اس قدر بڑھ گیا ہے وہ لوگ کیا کریں؟ بہر حال اس کا گوشہ مالک رام ضرور نکلوایئے۔مالک رام کے کچھ خطوط بھی ضرور چھپوایئے۔آپ جتنے خط کہیں مالک رام صاحب کے اس میں اشاعت کے لیے بھجوا دوں۔دس بیس پچیس؟

جمیل جالبی کے دوبارہ تقرر پر بہت مسرت ہوئی۔اپنے پہلے ٹرم میں انہوں نے بہت مفید کام کیے اور خاص تعداد میں کتابیں اور کتابچے شائع کیے۔اب امید ہے وہ اپنے ادبی پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکیں گے۔وہ آپ کے اورینٹل کالج والے عزیز زاہد عامر صاحب اب کہاں ہیں کیا کرتے ہیں۔جالبی صاحب نے اگر 'دیوان سوز' کے دونوں مطبوعہ نسخے انہیں نہیں بھیجے تو انہی کے پاس محفوظ ہوں گے۔مکاتیب ظفر علی خاں انہوں نے شائع کیے؟ آپ کا رسالہ 'غالب' کراچی عرصے سے نہیں شائع ہوا' یا شائع ہوا مجھ تک نہیں پہنچا۔

کل ہم لوگ سرور صاحب سے ملنے گئے تھے۔عبدالحق کے خطوط کی اشاعت میں تو شاید ابھی دیر ہو، رشید صاحب کے کوئی ڈیڑھ سو خطوط ہوں گے، سو صفحوں کی کتابت ہو گئی ہے۔ دو ماہ میں چھپ جانا چاہیے۔

نعیم الرحمٰن صاحب کے خاندان کے اصحاب کا کوئی خط/تحریر میرے پاس نہیں لیکن منصور صاحب کو اطلاع دیجیے کہ رسالہ ترقی (حیدرآباد) کے ۱۹۳۳ کے ۱۲ شمارے اکبر حیدری کاشمیری کو ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں ملے ہیں۔ تین شماروں میں جمیل الرحمٰن کا مضمون ابوالعلاء المعری پر چھپا ہے، اگر جمیل الرحمٰن ان کے خاندان کے مشہور جمیل الرحمٰن ہیں تو یہ اطلاع ان کے دلچسپی کا باعث ہوگی۔ ہاں صاحب شجاع احمد زیبا کا حال آپ نے نہیں لکھا، وہیں ہیں یا بچوں کے پاس امریکہ چلے گئے ہیں۔ ہاشمی فرید آبادی پر ان کا کام کہاں تک پہنچا؟ ہاشمی مرحوم کا مضمون 'دسویں صدی: تلاطم ہند میں' 'ترقی'' کے جلد اوّل نمبر ایک میں چھپا ہے آپ کے پاس نہ ہو تو ادارہ ادبیات یا حیدری صاحب کو لکھیے۔ ان کا مضمون ہماری زبان (۱۵ مئی) میں چھپا ہے۔

آپ نے دوبارہ کالم نویسی شروع کر دی اس سے مجھے تو بہت خوشی ہوئی۔ اظہار جذبات کے لیے کوئی وسیلہ تو ہونا ہی چاہیے لیکن ایک کام کیجیے 'تکبیر' ضرور بھجوانا شروع کیجیے، آپ نے خط میں اسے بھیجنے کا ایک طرح سے وعدہ کیا ہے، لیکن میں پھر بھی لکھ رہا ہوں تا کہ آپ کی کوششیں تیز ہو جائیں اور اس کے ساتھ ہی ۲۳ مارچ سے اب تک کالموں کی زیراکس کاپی بھی بنوا کر بھیج دیجیے۔ غضب خدا کا آپ کا مارچ سے یہ کالم چھپ رہا ہے اور وہاں کے دوستوں میں سے کسی نے مجھے اس کی اطلاع نہیں دی ''کتاب نما'' نہ دیکھتا تو اب بھی اس اہم خبر سے بے خبر رہتا۔

آپ نے 'شہاب ثاقب' بھیجنے کا وعدہ کیا ہے ضرور بھیجیے۔ یہ میرے کام کی چیز ہوگی۔ خالد صاحب کی شادی خانہ آبادی کی خبر سے خوشی ہوئی۔ اس عمر میں رفیق زندگی کی ضرورت و اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ دعا ہے کہ خوش اور مطمئن رہیں۔

ابوسفیان اصلاحی آپ سے ملے ہوں گے، ان کی واپسی کوئی ایک مہینے میں غالباً بذریعہ ٹرین ہوگی۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ کراچی سے روانگی کے وقت وہ آپ سے ضرور ملیں وہ آپ کے خطوط کے ساتھ کچھ کتابیں بھی ضرور لا سکیں گے کہ ان کی واپسی بھی غالباً خشکی کے راستے سے ہوگی۔ وہ ایک ہفتہ لاہور رہ کر یہاں آئیں گے۔ ویسے وہ اپنی کتابوں سے لدے پھندے ہی یہاں آتے ہیں۔

اس خط کا جواب لکھتے وقت ۳ فروری کے خط کے ساتھ ایک دو پہلے کے خطوط بھی سامنے رکھ لیجیے تو مزید کرم ہو۔ عید کی تہنیت قبول فرمائیے۔

واسلام

مختار الدین احمد

مسعود احمد برکاتی صاحب کی علالت کی خبر ملی تھی، خیریت جوئی کا خط لکھ دیا تھا۔ یقین ہے اب وہ بالکل تندرست ہوں گے۔

علی گڑھ

۲۵ رفروری ر ۱۹۹۷ء

شفیق مکرم السلام علیکم

مکرمت نامہ مورخہ ۷ جنوری مجھے ۱۴ کو مل گیا تھا۔ آپ کا خط جب دو تین بار نہ پڑھ لوں تشفی نہیں ہوتی۔ کئی کئی دن کے وقفے سے پڑھتا رہا۔ درمیان میں رمضان کے معمولات، عید کی مشغولیات، اس کی چہل پہل، ملاقاتیں رہیں اور پھر یہاں کی شیش ٹھنڈک کی لہر کہ قلم پکڑنا دشوار۔ درمیان میں کام اور خطوط جمع ہوتے رہے، ان سبھوں سے فارغ ہو کر آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ کل ہی نو دس خط پاکستان بھیجے ہیں ایک رجسٹری شدہ لفافہ میں جس پر بتیس روپے خرچ ہوئے ہیں خدا کرے خیر سے مکتوب الیھم تک پہنچ جائیں۔ ڈاکٹر صدیقی مرحوم ایسے موقع پر مکتوب الیھوں لکھتے تھے، میں بھی ان کی اتباع میں کبھی لکھ دیتا ہوں لیکن طبیعت اس کی طرف مائل نہیں۔ 'مکتوب الیھم' ہی ٹھیک ہے۔

۳ نومبر کو اگر میں نے آپ کو خط لکھا ہے تو ۳ کو ''خطوط رشید'' کے ساتھ روانہ ہوا ہوگا۔ اس پیکٹ میں تذکرہ ''ریاض الوفاق'' پر میرے مضمون کا تراشہ بھی تھا۔ خط کی نقل اسی وقت رکھتا ہوں جب طویل اور ضروری خط ہو اور کوئی آدمی ایسا موجود ہو جو بازار جا کر زیراکس بنوا کر لے آئے ورنہ عام طور پر کوشش ہوتی ہے کہ جلد خط ختم کر کے پوسٹ کرا دوں۔ ہاں ۲۹ نومبر کو فریدہ سلمہا کی ملنے والی ایک لڑکی کراچی جا رہی تھی اس کی معرفت ایک خط بھیجا تھا وہ آپ کو براہ راست ملا ہوگا یا فاروقی صاحب نے لاہور سے بھجوایا ہوگا۔

اقبال رشید صاحب کے ذریعے 'نظارہ' کے عکس آپ کو مل گئے، خوشی ہوئی کہ اب آپ کی فائل مکمل ہو گئی۔ سرور صاحب سے ملا انہیں خطوط رشید کا تبصرہ مل گیا وہ افسوس کر رہے تھے کہ ان کے ناشر نے اب تک کتاب آپ لوگوں کو نہیں بھجوائی۔ اب یقین ہے پہنچ گئی ہوگی اور ذوالفقار مصطفیٰ صاحب اپنا نسخہ آپ سے لے گئے ہوں گے اگرچہ ابھی تک ان کا خط نہیں آیا ہے۔ لطف اللہ صاحب کا خط آ گیا ہے، نئی تصنیف میں مصروف ہیں۔

انجمن سے 'قومی زبان' کے بارہ شمارے دسمبر ۱۹۹۶ تک آ گئے ہیں، اردو کا کوئی شمارہ نہیں آیا، پچھلے سال کے چاروں شمارے بھجوا دیجیے۔

عبدالغنی شمس صاحب کا جواب نہیں آیا، اپنی سوانح حیات مختصر طور پر ہی لکھ دیتے تو اچھا تھا، میرے پاس دو صفحوں میں اپنے حالات لکھ کر بھیجے ہیں، وہ محفوظ ہیں۔

رفاقت علی شاہد صاحب کا خط آیا تھا، میں نے جواب دے دیا ہے بلکہ فاروقی صاحب کے ایک مضمون 'گلدستہ بہار' کی عکسی نقل بھی بھیج دی ہے۔

آپ کے لکھنے کے باوجود اسلم صاحب تو تذکرہ شعرائے امرت سر نہ بھیج سکے اب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو متوجہ کیجیے۔

نواب امیر حسن خاں لعل کاکوروی (م ۱۲۶۴ھ) معاصر غالب کے حالات مطلوب ہیں۔ بھوپالی تذکرے پیش نظر ہیں، ان کی کتاب 'پنج نگین' کی جو غالب کی 'پنج آہنگ' کے بقول شخصے جواب میں لکھی گئی تھی، تلاش ہے۔ کاکوری کے کتب خانے

میں بھی نہیں ملی ۔بسمل پر میں نے اپنا مضمون ایوان غالب دہلی کے جلسے میں پڑھا تھا، جمیل جالبی صاحب نے پسند کیا تھا اور اسٹیج پر آ کر مضمون اور مضمون نگار کی ایسی تعریف کی کہ مضمون نگار شرمندہ ہوا، انھوں نے نساخ کے فارسی تذکرے سے بسمل کے حالات و اشعار بھیجنے کا وعدہ کیا تھا لیکن کسی وجہ سے اب تک نہ بھیج سکے ۔زحمت نہ ہو تو ذرا انھیں ٹیلی فون کر دیجیے ۔ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اب مضمون کے لیے تقاضہ کر رہے ہیں ۔خط تو معلوم نہیں ان تک کب پہنچے، کل میں نے انہیں لکھا ہے ۔

جعفری نمبر کے شمارے ملے، تقسیم کرا دیے گئے ۔بعض اصحاب کو خود جا کر پہنچا دیے ۔تعریف سبھوں نے کی لیکن شاید ہی کسی کو رسید اور رائے بھیجنے کی توفیق ہو ۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو ''شعر شور انگیز'' پر ۵ لاکھ کا بد لا فاؤنڈیشن کا انعام ملا ہے ۔خوشی ہوئی ۔ہندوستان ٹائمس (یکم فروری) کا تراشا بھیج رہا ہوں ۔

مہر الٰہی صاحب کا خط بابت خطوط بنام مقتدیٰ خاں شروانی اور مرزا رسوا کے رسالہ 'اشراق' (لکھنو ۱۸۸۴ء) کے دو صفحات کا عکس بھیج رہا ہوں ۔

جھنڈیر کے کتب خانے پھر جائیے، کئی دن قیام کیجیے اور ایک مفید پُر معلومات نوٹ تیار کر کے شائع کیجیے ۔انھیں متوجہ کیجیے کہ فوٹو اسٹیٹ بنانے کی ایک دو اچھی مشینیں بھی خرید لیں تا کہ وہ نقول بھی فراہم کر سکیں ۔مارچ/اپریل میں جائیں تو اپنے تاثرات پر مشتمل ایک خط وہیں سے مجھے لکھیں ۔پھر کسی موقع سے ضیاء اللہ کھوکھر کا کتب خانہ بھی دیکھیے ۔آپ کبھی کراچی میں ''درس کتب خانے'' بھی گئے؟ وہاں اخبار 'دیدۂ سکندری' (رام پور) کی مکمل فائل محفوظ ہے ۔چند شماروں میں والد مرحوم کا مضمون ہیئت و ریاضی کے سلسلے میں چھپا تھا، مجھے عکسی نقل مل گئی ہے رام پور سے لیکن ایک دو شمارہ وہاں بھی موجود نہیں ۔پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب قادری کو زحمت دی تھی لیکن درس خاندان کے اصحاب وعدوں کے باوجود مطلوبہ مضمون کے عکس فراہم نہ کر سکے ۔اگر ان دو کتب خانوں میں اس اخبار کی فائل ہو تو دیکھیے گا ۔

آپ نے لاہور میں احمد ندیم قاسمی کی ۸۰ ویں سالگرہ کی تقریب کا حال لکھ کر معلومات میں اضافہ کیا ۔وہ واقعی اس اعزاز کے مستحق تھے جو انھیں بخشا گیا ۔قطر کی تقریب کے کئی گھنٹوں کی فلم جشن قاسمی وسرور اور ایک فلم ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کی میرے پاس آئی اور میں گھنٹوں اسے دیکھتا رہا ۔مشتاق احمد یوسفی صاحب کا خطبہ بڑے معرکے کا تھا ۔

مجھے لطف اللہ خاں صاحب کی ۸۰ ویں سالگرہ کا حال ایسے دلچسپ انداز میں آپ نے لکھا ہے کہ محسوس ہوتا رہا کہ میں بنفس نفیس اس جشن میں شریک ہوں اور چائے، لنچ اور ڈنر سے آپ لوگوں کے ساتھ شادکام ہو رہا ہوں ۔خدا مبارک کرے اور خان صاحب کو طویل عمر صحت و آرام کے ساتھ عطا فرمائے ۔

محمد الدین غریب ریاضیات و ہیئت کے ماہروں میں تھے اور غالباً ڈاکٹر ضیاء الدین کے شاگرد و تربیت یافتہ ۔افسوس کہ ان کے بارے میں کوئی اطلاع علی گڑھ میں نہیں ملی ۔ان سے والد صاحب مرحوم و مغفور (مولانا ظفر الدین قادری) سے علمی تحریری مباحثہ ہوا تھا جو اخبار 'دبدبۂ سکندری' میں چھپا تھا ۔یہ غالباً امرتسر کے تھے ۔علی گڑھ سے پنجاب چلے گئے تھے، وہیں وفات پائی ۔حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب نے ان کے بارے میں مختصر حالات لکھ بھیجے تھے ۔ان کے حالات ''شمیم ولایت'' از ابو مظہر چشتی صابری (لاہور ۱۹۹۳) ص ۵۱۴ میں ملتے ہیں ۔ولادت در فتح آباد ضلع امرتسر ۔مولانا محمد عالم آسی سے اکتساب علم کیا ۔

امرتسر سے 'کشاف' جاری کیا جو روحانیت پر بھی مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ 'دائمی جنتری' کے موجد ہیں۔ شاعری میں مولوی عطاء اللہ بخاری اور غلام میر حسین کاشمیری، مولانا غریب کے شاگرد ہیں۔ یہ منجم، جفار، رمال بھی تھے۔ تاریخ وفات ۳ جولائی ۱۹۳۱ء۔ رسالہ کشاف کی تلاش کیجیے۔ گلدستوں میں شاید ہی ان کا ذکر ملے اور بھائی میرزا یعقوب بیگ نامی دھلوی کا ذکر قدیم گلدستوں میں کیا ملے گا۔ یہ حال کے آدمی ہیں، میرے استاد تھے۔ مجھے ۱۹۴۳ - ۱۹۴۴ میں منطق پڑھاتے تھے۔ کہتے تھے کہ غالب سے ان کا خاندانی تعلق ہے۔ ان کے خاندان میں جو بیگ صاحبان ملتے ہیں ان میں سے کسی سے ان کا نسبی تعلق ہوگا۔ یہاں عماد الملک روڈ پر رہتے تھے۔ میں ان کے پاس حاضر ہوتا رہا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد بلکہ غالباً متقاعد ہونے کے بعد وہ علی گڑھ سے دہلی چلے گئے ہوں گے اور ممکن ہے وہاں سے اور آگے بڑھ گئے ہوں۔ حمزہ فاروقی یا کسی سے کہیے اخبارات میں شاید ان کی وفات پر ان کا ذکر چھپا ہو۔ مجھے ان کا سال وفات معلوم نہ ہو سکا۔

میری دلچسپی یہ ہے کہ انھوں نے (شاید سب سے پہلے) 'دستنبو' کا اردو میں ترجمہ کیا یا اس کا خلاصہ اردو میں لکھا۔ یہ کام خواجہ حسن نظامی صاحب کی فرمایش پر انہوں نے کیا تھا۔ اس کے کم از کم تین ایڈیشن نکلے ہیں۔ آج اس کے ایک نسخے کا پتہ نہیں چلتا۔ آپ کہیں نوٹ کر لیں اور پنجاب کے کتب خانے جائیں تو اس کتاب کا خیال رکھیں۔ یہ ملا واحدی کے ہم سبق تھے اور ان کے دوستوں میں تھے۔ ان کی خودنوشت سوانح حیات میں جو رسالہ ''تحریر'' دہلی میں چھپی تھی، بیگ صاحب کا ذکر ملتا ہے۔ آپ کی نگاہ سے گزرا ہوگا۔

حسب وعدہ ملاک رام صاحب کے پچیس تیس خط 'غالب' کے موجودہ شمارے کے لیے بھیج دوں گا۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ مرتبہ شمیم جہاں شائع ہو گیا ہے۔ مرتبہ کو میں نے لکھا تھا کہ اس کا ایک نسخہ آپ کو ضرور بھیجیں، بھیجا ہوگا۔

نعیم الرحمٰن مرحوم سے ملاقات یاد نہیں، الہ آباد جب بھی گیا ڈاکٹر صدیقی کے یہاں مقیم ہوا، جتنا وقت ملا انھیں کے ساتھ گزارا۔ نعیم صاحب سے ملاقات کا موقع نہیں ملا۔

ہاں یاد تو آتا ہے کہ عبدالرزاق قریشی صاحب کی ایک کتاب شخصیات کے بارے میں چھپی تھی، کہیں تبصرہ دیکھا تھا، اگر آپ کو اب بھی حاصل نہیں ہوئی تو لکھیے گا، تلاش کر کے بھجوا دوں گا۔

آپ نے ۸ جنوری کے کرم نامے میں کچھ کتابیں بھیجنے کا ذکر کیا ہے، منتظر ہوں۔ سید حسنین واپس آنے والے ہیں، لیکن وہ خود نذر و روتحائف سے لدے پھندے ہوں گے، ساری کتابیں کس طرح لا سکیں گے۔

ایک ..... ریکارڈ بات یہ کہ ابھی رات کو دس بجے بلوچستان کے اردو شاعر عطا شاہ پر PTV کا پروگرام سن رہا تھا، احمد فراز ان کے بارے میں اپنے تاثرات نشر کر رہے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے بدرجہ اتم کو بدرجہ اُتم کہا خدا کرے میری سماعت کی خطا ہو لیکن خواجہ صاحب یہ پھر بھی غنیمت ہے ان گنہ گار کانوں نے تو ایک صاحب کو بدرجہ اُتم بھی کہتے ہوئے سنا ہے (بروزن بُرجَم) اس طویل سمع خراشی کے لیے معافی چاہتا ہوں، اتنی دیر میں تو آپ اپنا کالم لکھ لیتے۔

والسلام

مختار الدین احمد

علی گڑھ

۲۷/۵/ ۱۹۰۱

یکشنبہ

مشفق خواجہ صاحب مکرم ومحترم السلام علیکم

مکتوبات (مورخہ ۱۷، ۱۸، ۲۳ مئی) کتابوں کا پیکٹ اور خطوط سید مرتضی حسین بلگرامی صاحب کی معرفت موصول ہوئے۔انھیں پاکر، دیکھ کر اور پڑھ کر مسرور ہوا۔ یہ سب چیزیں کل ۲۶ کی دوپہر کو پہنچیں۔آپ کا مفصل خط پڑھ کر جسم وجان میں طاقت اور روح میں بالیدگی پیدا ہوئی۔

''میرے زمانے کی دلّی''، ''سائل دہلوی''، غالب کے فارسی خطوط''، ''اردو کی ادبی تاریخیں'' اور ''سورج'' کے تینوں شمارے رات پڑھ گیا۔'انشاء' کا شمارہ جو آپ کا بھیجا ہوا تھا کل ہی دیکھ گیا تھا۔دن کے کھانے کے بعد بستر پر لیٹ کر ڈاک دیکھنے لگا تو اس میں رفیق احمد خاں صاحب کا مرسلہ پیکٹ بھی تھا۔کھولا تو 'انشاء' کے دس بارہ نسخے تھے جو علی گڑھ اور دوسرے مقامات کے اصحاب کے لیے تھے۔لکھا تھا کہ ڈاک کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں اس لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔اس پیکٹ پر سات ساڑھے سات سو خرچ ہوئے تھے۔ایک رسالہ کی دس بارہ کاپیوں پر ایسی خطیر رقم خرچ ہونے لگی تو لوگ کتابیں رسالے کس طرح بھیج سکیں گے۔

میں نے فوراً انتظام کیا کہ ان کا مرسلہ شمارہ اور ان کے خطوط لوگوں تک جلد پہنچ جائیں۔خدا کرے ان کے مکتوب الیھم نجم الاسلام صاحب پر کچھ لکھ کر اڈیٹر کو بھیج سکیں۔میں رفیق احمد صاحب سے واقف نہیں موجودہ شمارہ کے بعد بھی وہ کوئی ضخیم نمبر شائع کر سکیں گے۔ان کا زیادہ زور تو اس وقت مردم کے خطوط کی جمع آوری اور اشاعت پر ہے۔میرے پاس ان کے پچیس تیس خط تو ضرور ہوں گے۔آپ کی رائے کیا ہے کیا انھیں بھیج دوں؟ خدا کرے وہ ایک ضخیم مکتوبات نمبر شائع کر سکیں۔

''قومی زبان'' کا معاملہ یہ تھا کہ جنوری کے بعد کوئی شمارہ نہیں آیا۔تشویش تھی۔کل کی ڈاک سے فروری کے شمارے کا پیکٹ موصول ہوا تو خیال ہوا کہ کسی وجہ سے تاخیر ہو گئی ہے اور اب مارچ، اپریل، مئی کے شمارے چھپ رہے ہوں گے۔اب آپ کے مرسلہ پیکٹ سے مئی کے شمارے کا ایک نسخہ نکلا تو تشویش ہوئی۔مارچ اپریل کے شمارے کیا ہوئے۔شاید وہ پریس میں ہوں۔اگر چھپ گئے ہوں اور انجمن نے بھیجے ہیں تو یہاں نہیں پہنچے۔مجھے فروری تک کے شمارے مل گئے ہیں۔یہ آخری شمارہ کل ہی میں نے تقسیم کرا دیا۔مارچ، اپریل، مئی کے پرچوں کا انتظار رہے گا۔مئی کے شمارے سے معلوم ہوا کہ نجم الاسلام مرحوم پر میرا مضمون چھپ اور ڈاکٹر چودھری کا ڈاکٹر صدیقی پر مضمون آپ کو مل گیا تھا۔خلاف معمول ان مضامین کی رسید نہیں آئی تھی، اس لیے تردد تھا۔

فاضل زیدی صاحب کا حال معلوم ہوا۔

ڈاک کے خرچ میں اضافہ یہاں بھی ہوا ہے۔کارڈ ۲۵ پیسے کی جگہ ۵۰ پیسے میں ملے گا، لفافہ پر تین روپے کے بجائے چار روپے کے ٹکٹ لگیں گے۔ہر اضافی ۲۰ گرام پر ۴/ کا اضافہ ہوگا۔پارسل ۵۰۰ گرام تک ۱۲/ کی جگہ اب ۱۶/ میں جائے گا۔ہر اضافی ۵۰۰ گرام پر ۱۵/ فاضل۔رجسٹریشن فیس ۱۴/ کی جگہ ۱۷/ ہو گئی ہے۔یعنی کوئی خط اگر اب ہم

ہندوستان کے کسی مقام کو رجسٹری سے بھیجیں گے تو ۔/ ۱۷ کی جگہ اب ۔/ ۲۲ خرچ کرنے ہوں گے ۔لیکن آپ کے یہاں ڈاک خرچ میں اضافے کا حال سن کر تو ہوش اڑ گئے ۔ہمیں دو آسانیاں ہیں، خاصا کام تو ہم کارڈ سے چلا لیں گے اگر چہ اس میں سو فیصدی اضافہ ہو گیا ہے (آپ کے یہاں کارڈ لکھنا شاید معیوب سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ نظیر صدیقی مرحوم نے مجھے تاثر دیا تھا) پھر ہندوستان میں INLAND ہے اس کی قیمت ۔/ ۲ ہے ۔پورے خط کا مضمون اس پر لکھا جا سکتا ہے، ہمارے لیڈروں کو ہماری غربت کا خیال رہا، اس لیے انلینڈ کی قیمت نہیں بڑھائی ۔ وہی دو روپے رکھی ۔کارڈ کی قیمت ضرور بڑھی لیکن حکومت بھی کیا کرے ۔ایک کارڈ پر سنا ہے سوا چار یا ساڑھے چار روپے خرچ بیٹھتا ہے ۔حکومت پچیس پیسے اور پچاس پیسے ہی میں دیتی ہے ۔ سارا گھاٹا وہ پورا کرتی ہے ۔

آپ نے اپنے دوستوں کے نام خطوط بڑے وقت پر بھیجے ۔ نئے نرخ کا اطلاق یکم جون سے ہوگا ۔ میں نے فوراً سو روپے کے ٹکٹ منگوا لیے ۔خطوط پڑھتا گیا لفافہ بند کرتا گیا اور ٹکٹ تین روپے کے چسپاں کرتا گیا ۔شام ہو گئی ڈاک کا وقت نکل گیا ۔خیال ہوا کہ آپ کے دوستوں کو آپ کے خطوط جلد مل جائیں، آج شنبہ کی ڈاک سے یہ خطوط نہیں گئے تو اب پرسوں دوشنبہ کو جائیں گے ۔میں نے گاڑی نکلوائی اور ریلوے اسٹیشن جا کر سات بجے شام کو سارے خطوط پوسٹ کر دیے ۔

مقامی خطوط عصر سے پہلے لوگوں کو بھجوا دیے ۔اصغر عباس صاحب کو خط کے ساتھ ان کی کتاب پر تو روھیلہ والی بھی بھجوا دی ۔شنبہ کو رجسٹری دودھ پور کے ڈاک گھر میں ایک بجے بند ہو جاتی ہے ۔اس وقت دو بج رہے تھے، میں نے حنیف نقوی کے نام کا لفافہ رجسٹری کے لیے جنرل پوسٹ آفس بھیجا ۔جہاں تین بجے تک رجسٹری ہوتی ہے ۔رجسٹری ہو گئی ۔آپ نے رشید حسن خاں کو مضمون کا عکس ۔/ ۹۴ میں بھیجا ۔آپ مجھے بھیج دیتے تو یہ رجسٹرڈ پیکٹ بھی ۔/ ۱۹ میں پہنچ جاتا ۔

اب کچھ کام کی باتیں ۔

آپ نے کچھ کام میرے لیے تجویز کیے ہیں ۔ ۱۔معربات پر مختصر دیباچہ لکھ دوں گا ۔جب اصل کتاب کے مطبوعہ اوراق مل جائیں ۔مظہر محمود شیرانی سے کہیے چھپتے ہی بھیج دیں ۔

طبع ایران جسے شاہد محمدی نے ایڈٹ کیا ہے میں نے شعبہ عربی و اسلامیات کے کتب خانے سے نکلوا کر ڈاکٹر صدیقی کے حوالے کیا تھا ۔اختلاف نسخ اگر ہوئے تو انھوں نے درج کر دیے ہوں گے ۔

۲/ بہت اچھا، ڈاکٹر صدیقی کے مکتوبات مرتب کر دوں گا ۔آپ ان کے خطوط ضرور بھیجیے ۔آمنہ خاتون کے مجموعے 'گلہائے صد رنگ' کے عکس کے لیے میں نے کتب خانہ خدا بخش کو لکھا تھا ۔بیدار صاحب عکس بھجوا نہ سکے ورنہ آپ کے گمشدہ اوراق کے عکس آپ کو ضرور بھیجتا ۔اب بھی فکر میں رہوں گا ۔آپ بھی خیال رکھیں ۔مجھے رشید صاحب کے خطوط کے ساتھ اب ڈاکٹر صدیقی کے خطوط کی بھی ضرورت ہے ۔

۳/ گیان چند صاحب نے واقعی بہت محنت کی اور جلد کام ختم کر لیا ۔انھوں نے مسودے کی ایک نقل یہاں عزیز برنی صاحب کو بھوپال بھجوا دی ہے جو اس کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن شائع کریں گے ۔مقدمے میں انھوں نے لکھا ہے کہ مختار الدین کی نظر سے

کتاب نہیں گزری ہے۔اس طرح انھوں نے شاید مجھے معترضین کے حملوں سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ترتیب اور مقدمہ وغیرہ کی نقل انھوں نے بھیج دی ہے۔میں بھی مسودہ چھپنے سے پہلے ندیکھوں تو اچھا ہے۔ویسے میں انھیں بار بار لکھتا رہتا ہوں کہ کتاب معروضی ہونی چاہیے۔انھوں نے قاضی صاحب کی تعریف کی ہے لیکن انھیں جا بجا اپنی تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔بعض جگہ تو شبہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے انتقام لے رہے ہیں۔یہ بات میں صرف آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں ممکن ہے میرا تاثر صحیح نہ ہو۔جب آپ انھیں لکھیں تو اس کی نقل مجھے ضرور بھیجیں۔میری ان کی بعض معاملات میں طویل خط و کتابت ہوئی ہے لیکن وہ میرے نقطۂ نظر سے متفق ہوئے ہوں، اس کی توقع بہت کم ہے۔

۴/ رشید صاحب کا مطبوعہ خط ملا۔شکریہ

۵/ یہ پڑھ کر کہ آپ 'غالب' موجودہ شمارے کی ضخامت کا رسالہ ہر دوسرے ماہ شائع کر سکتے ہیں۔بہت خوشی ہوئی۔خدا آپ (کو) خوش اور مطمئن رکھے اور صحت مند بنائے۔کاش آپ کو اچھے کارکن اور فعال معاون ملتے۔کتنی چیزیں اور کیسی کیسی چیزیں آپ شائع کرتے اور اردو لٹریچر کو مالا مال کرتے۔مناسب ہے آپ ادارۂ یادگار غالب پر پوری توجہ کیجیے۔

۶/ حکیم غلام غوث پر مختصر نوٹ لکھ کر بھیج دوں گا۔میں ان سے واقف ہوں۔بریلی میں ایک دو بار ۱۹۴۳ء میں ان سے ملا بھی ہوں۔وہ ریاضی و ہیئت میں والد مرحوم کے ہم سبق تھے۔فاضل بریلوی کے شاگرد تھے۔

۷/ غالب پر میرے مضامین کا مجموعہ آپ فوراً چھاپ سکتے ہیں۔اس سے خوشی ہوئی۔کتنے مضامین مناسب ہوں گے۔اس میں تو کچھ کرنا نہیں ہے مطبوعہ مضامین کے عکس آپ کو بھیج دینا ہے۔

۸/ ہاں بھائی سید صاحب کے لیے کچھ کیجیے۔ان کی علالت کا حال سن کر اور افسوس ہوا۔میں نے انھیں بھی سمجھایا تھا اور ان کے معاصروں کو بھی لکھا تھا لیکن آخر الذکر اصحاب کو میری بات کچھ پسند نہیں آئی، اور وہ صاحب جو دور بیٹھے ہیں انھیں کون سمجھا سکتا ہے! بہر حال ان کے لاہوری معاصرین اب قصہ ختم کریں۔

۹/ نجم الاسلام صاحب اور نظیر صدیقی صاحب کی وفات کا کس قدر صدمہ ہوا کیا لکھوں۔دونوں میرے بڑے اچھے دوست تھے۔اور اپنی اپنی جگہ دونوں کی بڑی اہمیت تھی۔نظیر کچھ معصوم اور مظلوم سے تھے اس لیے ان کے لیے بہت دل دکھتا ہے۔آپ سے وہ بہت قریب تھے اور میں نے متعدد بار دیکھا کہ وہ آپ کی بات کا برا نہیں مانتے تھے۔ان کے لیے ضرور کچھ کیجیے، میں کاموں میں بہت گھرا ہوا ہوں لیکن آپ نے اگر نظیر صدیقی نمبر شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تو مضمون لکھوں گا یعنی وہ کروں گا جو ان کی زندگی میں نہیں کیا۔وہ بہت لکھتے رہے کہ فلاں مجموعے کے لیے کچھ بھیجیے۔میں نے دوسروں سے مضامین بھجوائے لیکن خود کچھ نہیں لکھا۔کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر ہم لوگوں سے رخصت ہو جائیں گے۔

ان کے نام کے ہزار خطوط آپ کو خوب ملے ان سے حسب موقع کام لیجیے۔ایسے خطوط کا چھوٹا سا مجموعہ انھوں نے شائع کیا تھا، مجھ سے کہتے تھے ایک مجموعہ اور چھاپوں گا۔اس کا انھیں موقع نہیں ملا۔انہوں نے مجھے ان کے لیے دعائے مغفرت کے لیے لکھا ہے۔میں نے جب سے ان کی وفات کی خبر سنی ہے روزانہ نماز فجر کے بعد ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتا ہوں۔خدا

ان پر اپنی رحمت ورضوان کے پھول برسائے اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

۱۰/ سید ظفیر الحسن کی صحت کی خرابی کا حال معلوم ہوا۔ یہ تو بڑے تردد کی خبر ہے۔ مولیٰ تعالیٰ شفائے عاجلہ وکاملہ عطا فرمائے۔ آپ انہیں دیکھنے ضرور جائیں انھیں میرا بھی سلام کہیں۔ خدا کرے وہ آپ کو پہچان لیں اور مجھے بھی نہ بھولے ہوں۔ آپ نے ان کی یا ان کے کسی ادارے کی چھپوائی ہوئی کسی کتاب کے بھجوانے کا وعدہ کیا تھا۔

۱۱/ ڈاکٹر صدیقی کے مضامین کے دوسرے حصے کی بابت شاہد علی خاں صاحب سے پوچھوں گا، رشید حسن خاں صاحب سے بھی دریافت کروں گا۔ یہ بات ڈاکٹر ضیاء الحق چودھری صاحب (لکھنو) کے علم میں نہیں ہے۔ زہیر مرحوم کے صاحبزادے کراچی ہی میں ہوں گے وہ صحیح صورت حال سے واقف ہوں گے۔ آپ نے چودھری صاحب کا مضمون ڈاکٹر عبدالستار صدیقی چھاپ دیا خوب کیا۔ انہیں آپ کا مرسلہ شمارہ ملے گا تو بہت خوش ہوں گے۔ ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ میں ایک مضمون ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی مرحوم پر بھی لکھوا رہا ہوں جن سے وہ قریب رہے ہیں۔ یہ سائنس کے آدمی ہیں اس لیے اردو میں لکھنے میں بہت تکلف کرتے ہیں۔ غالب پر ڈاکٹر صدیقی کا ایک چھوٹا سا مجموعہ تو تیار ہو ہی جائے گا۔ کچھ مضامین آپ کے پاس ہوں گے کچھ میرے پاس ہیں۔ میں مختصر سا دیباچہ لکھ دوں گا کتاب جلد چھپ جائے گی۔

بشارت فروغ صاحب کوئی کتاب آپ کے لیے بھیجیں گے تو آپ کو روانہ کر دوں گا۔ اس بہانے میں بھی پڑھ لوں گا۔ آپ مولانا آزاد لائبریری کو یا یہاں کسی اور کو کوئی کتاب بھیجیں تو مجھے بھیجیں۔ میں ایک نظر ڈال کر کتاب بھجوا دوں گا۔ فی الحال آپ کو ایک کتاب بھیج رہا ہوں۔ آپ ادیب سہیل صاحب سے کہیے کہ اس پر تبصرہ لکھ کر شائع کر دیں۔ وہ مصنف سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ''سورج'' کے شمارے دلچسپی سے پڑھے اس سے پہلے اس کے مطالعے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ موقع ہو تو کبھی کبھی بھیجتے رہیے۔ 'میرے زمانے کی دلی' رات ختم کر ڈالی۔ بہت اچھی کتاب ہے۔ ملا واحدی کا کیا کہنا۔ میں ان کے ایک دوست رہم سبق مرزا یعقوب بیگ نامی دہلوی کے حالات کے تلاش میں ہوں۔ خودنوشت میں جسے مالک رام صاحب نے 'تحریر' میں چھاپا تھا نامی صاحب کا مختصر ذکر ملتا ہے۔

اور کتابیں جو آپ نے میرے لیے حاصل کی ہیں بھیج دیجیے۔ کیا عجب پوسٹل چارجز اور بڑھ جائیں۔ خوشی ہوئی کہ آپ آیندہ سال یہاں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اھلاً وسہلاً ومرحبا۔

آنا ہو تو آ جاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم۔

والسلام

مخلص مختار الدین احمد

مکتوبات

مشفق خواجہ بنام مختار الدین

۳ ڈی ۔۹/ ۳۱، ناظم آباد
کراچی ۔ ۷۴۶۰۰

محترمی و مکرمی ۔سلام مسنون ۔

نومبر میں آپ کے دو گرامی نامے ملے اور دسمبر میں ایک ۔دسمبر کا خط آپ نے ۱۹/ کو لکھا تھا جو میری سال گرہ کا دن ہے ۔حیرت ہے کہ جو دن مجھے یاد نہیں رہتا ہے، اسے آپ یاد رکھتے ہیں ۔ میں خوش قسمت ہوں کہ آپ میرے حال پر اس حد تک مہربان ہیں ۔اب کے ۱۹/ دسمبر کی صبح کو پہلا فون دہلی سے نارنگ ساقی صاحب کا آیا ۔انھوں نے جنم دن کی مبارک باد دی ۔ حیرت ہوئی کہ انہیں اس کا کیسے علم ہوا ۔انھوں نے بتایا کہ رسالہ ''شاعر'' بمبئی میں دسمبر میں پیدا ہونے والے ادیبوں کے نام شائع ہوئے ہیں ۔فلم ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے، لیکن بیچارے ادیبوں کو ان فضولیات سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ۔بہر حال یہ فائدہ تو پہنچا کہ نارنگ ساقی صاحب سے ''ملاقات'' ہو گئی ۔شام کو عبدالوہاب خاں سلیم صاحب نے ایک کوریر سروس کے ذریعے گلدستہ بھجوایا ۔سلیم صاحب کمال کے آدمی ہیں ۔ایسے محبت کرنے والے اس دنیا میں کم ہوں گے ۔

ڈاکٹر انور معظم اور جیلانی بانو جو اکتوبر کے شروع میں اچانک حیدر آباد دکن واپس چلے گئے تھے دسمبر کے وسط میں دوبارہ کراچی آ گئے ۔ان کی وجہ سے اور پھر ڈاکٹر خلیق انجم کی وجہ سے یہاں بڑی چہل پہل رہی ۔ان تینوں سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں ۔ڈاکٹر خلیق انجم آج صبح واپس چلے گئے ۔ڈاکٹر انور معظم کل واپس جائیں گے ۔آج رات ایک دعوت میں ان سے ملاقات ہو گئی تو یہ خط ان کے حوالے کروں گا کہ حیدر آباد پہنچتے ہی اسے پوسٹ کر دیں ۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کتابوں کے دونوں پیکٹ بحفاظت آپ تک پہنچ گئے ۔یہ کام ایک ایسے نوجوان نے انجام دیا ہے جس کی عمر بمشکل سولہ برس ہو گی ۔وہ بہترین کھانا پکاتا ہے ۔کتابوں کی دیکھ بھال کرتا ہے ۔جب کام کرتا ہوں تو مطلوبہ کتابیں نکال کر دیتا ہے ۔اگر کوئی ڈکشنری مانگوں تو کہتا ہے کون سا لفظ دیکھنا ہے، ممکن ہے میں بتا دوں، ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت نہ رہے ۔میں نے اسے بتایا کہ آپ نے اس کے بنائے ہوئے پیکٹوں کی تعریف کی ہے تو وہ بہت خوش ہوا ۔

آپ نے وقتاً فوقتاً جتنے بھی خط دوسروں کے نام بھیجے تھے، وہ فوراً پوسٹ کر دیے البتہ یہ احتیاط کی کہ سب کے

فوٹو اسٹیٹ بنوا لیے کہ اگر کوئی خط خدانخواستہ ضائع ہو جائے تو اس کی تلافی ہو سکے۔

ڈاکٹر صدیقی کے خطوط کی تلاش کا کام جاری ہے۔ سہیل (ابن زہیر صدیقی) بہت مصروف ہیں۔ کئی بار آنے کا وعدہ کر چکے ہیں، مگر نہیں آئے۔ بہر حال امید ہے کہ اس مہینے ان سے ضرور ملاقات ہو جائے گی۔ فی الحال صدیقی صاحب کے دو خط دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ۔ مطبوعہ خط ''اصطلاحات غالب'' از نظم طباطبائی مرتبہ عبدالرزاق راشد میں ہے۔ غیر مطبوعہ خط مولوی عمران مسافر صاحب کے نام ہے۔ افسوس کہ عمران کا ۲۵ رنومبر ۲۰۰۴ء کو انتقال ہو گیا۔ تین چار سال قبل انھوں نے اپنے نام کے ادیبوں کے تمام خطوط مجھے دے دیے تھے۔ ان میں ایک خط ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا اور تین خط قاضی عبدالودود کے ہیں۔ یہ چاروں خط میں آپ کو کتابوں کے پیکٹ کے ساتھ بھیجوں گا۔ عمران صاحب سے میرے ۴۵۔ ۴۰ برس کے تعلقات تھے۔ جب یہ بمبئی میں تھے تو خط و کتابت تھی۔ کراچی آ گئے تو ملاقاتیں ہونے لگیں۔ تیس برس تک وہ ہر سنیچر کے دن میرے ہاں آتے تھے اور دو تین گھنٹے میرے ساتھ گزارتے تھے۔ مجھ سے بات چیت کم ہوتی تھی، نئی کتابوں کے دیکھنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ بہت محبت کرنے والے انسان تھے۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ شہاب الدین دُسنوی صاحب کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ اچھا خاصا کتب خانہ ان کے پاس تھا جو دوستوں میں تقسیم کر دیا تھا افسوس کہ اس کتاب خانے میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو میرے پاس نہ ہو، ورنہ کچھ چیزیں میں بھی لے لیتا۔ مجھے انھوں نے دو چیزیں دیں۔ ادیبوں کے خطوط اور مختلف ملکوں کے سکے۔ انھیں سکے جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔

آپ اپنے مضامین ''متعلقہ غالب'' کی فوٹو اسٹیٹ ارسال فرمایئے، میں خود انھیں دو حصوں میں تقسیم کر کے آپ کو اطلاع دوں گا اور آپ ان کے لیے الگ الگ دیباچے لکھ دیجیے۔ اس کام میں تاخیر نہ کیجیے۔ میں چاہتا ہوں کہ کمپوزنگ فوراً شروع کر دی جائے۔ بعد میں کمپوزنگ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

شمس منیری کے متعدد مضامین رسالہ معاصر میں مل گئے ہیں۔ معاصر کے خاصے شمارے بیدل لائبریری میں ہیں، مگر بعض نہیں ہیں، اب میں خدا بخش لائبریری کو لکھوں گا اور باقی ماندہ مضامین کی نقلیں منگواؤں گا۔ حافظ صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع ہونے کا امکان ہے۔ حافظ صاحب کے آپ سے تعلقات تھے۔ آپ کو جو کچھ ان کے بارے میں یاد ہو، ایک مضمون کی صورت میں قلم بند فرما دیجیے۔ اسے میں ''قومی زبان'' میں شائع کرا دوں گا۔

ڈاکٹر نظام الدین کا لطیفہ آپ نے خوب لکھا، لیکن یہ ان کے کسی بدخواہ کی اختراع ہے۔ وہ بڑے عالم آدمی تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ادارہ معارف اسلامیہ کے اجلاس میں یہ لاہور آئے تھے تو ہمارے گھر پر ان کا قیام رہا تھا۔ والد صاحب کے روزنامچے میں اس کی تفصیل ہے۔ روزنامچے میں ان کے بارے میں ایک حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں، ان کے کوائف نہیں مل رہے۔ ڈاکٹر انور معظم صاحب سے کہا، انھوں نے حیدر آباد میں کئی لوگوں سے معلوم کیا مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اب آپ ہی زحمت کیجیے۔ ایک چند سطری نوٹ لکھ بھیجیے۔ میں آپ کے حوالے سے درج کر دوں گا۔ والد صاحب کا روزنامچہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔

ادھر نثار احمد فاروقی صاحب کی وفات کا بے حد افسوس ہوا۔ بڑی محبت کے آدمی تھے۔ ستمبر میں دوحہ قطر کا ادبی انعام

لینے گئے تو وہاں سے میرے لیے اپنی دو تازہ کتابیں (۱) مقالات فاروقی اور (۲) حضرت شیخ صدرالدین محمد یعقوب چہندہ شہید ایک صاحب کے ذریعے ارسال کی تھیں۔ میری بیماری کے دوران بڑی محبت کے خط لکھے تھے۔ آخری ملاقات ان سے ۲۰۰۰ء میں ہوئی تھی جب وہ اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے تھے۔

اب میری دو فرمائشیں:

۱۔ رسالہ ''غالب'' میں میں نے ایک بحث ''مہملات غالب'' شائع کی تھی۔ اسے کتابی صورت میں لانے کا پروگرام ہے۔ اس بحث پر ایک دیباچہ آپ کو لکھنا ہے۔ دیباچے میں آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ مہملات غالب کی بحث کی افادیت کیا ہے۔ یہ محض قلمی ورزش ہے یا کوئی اہم مسئلہ۔ بحث میں حصہ لینے والوں سے کوائف کے سلسلے میں جو کمیاں رہ گئی ہیں، ان کو بھی پورا کر دیجیے۔

۲۔ رسالہ ''فکر و نظر'' علی گڑھ کے خاص شمارے جو ''ناموران علی گڑھ'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں، ان میں سے تین میرے پاس ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ پہلا کارواں شمارہ جنوری تا ستمبر ۱۹۸۵ء

۲۔ تیسرا کارواں۔ جلد اول۔ شمارہ جنوری ۱۹۸۷ء تا جولائی ۱۹۸۸ء

۳۔ تیسرا کارواں۔ جلد دوم۔ شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء

ان کے علاوہ جو شمارے شائع ہوئے ہیں، مجھے ان کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں آپ میری مدد کیجیے۔ باقی باتیں میں اگلے خط میں لکھوں گا جو کتابوں کے پیکٹ کے ساتھ بھیجوں گا۔

آمنہ خیریت سے ہیں۔ آپ کو اور بیگم صاحبہ کو سلام لکھوا رہی ہیں۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

بخدمت گرامی
ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب
علی گڑھ

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۳۔۱۔ ۲۰۰۵ء

نیّر مسعود کے افسانوں میں کافکائی رنگ

سفیر حیدر نقوی

نیّر مسعود نے اپنے افسانوں میں شعوری یا لاشعوری طور پر کافکا کے اثرات قبول کیے ہیں۔ کافکا کے ساتھ ان کی طبعی اور ہم آہنگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے کافکا کی کہانیوں کے تراجم کیے جو ''کافکا کے افسانے'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے دیباچے میں نیّر مسعود نے ایک بڑا معنی خیز جملہ لکھا ہے کہ ''کافکا کی تحریر پڑھ کر اسے (انسان کو) اپنی دنیا بدلی بدلی معلوم ہوتی ہے''۔[1]

وارث علوی نے کافکا اور نیّر مسعود کے افسانوں میں اس قدر مماثلت محسوس کی کہ اپنے مضمون ''اجتہادات روایت کی روشنی میں'' یہاں تک کہہ دیا:

''کافکا کی طرز کے واحد بہترین افسانہ نگار ہمارے ہاں نیّر مسعود ہیں''۔[2]

ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے وارث علوی کی تائید میں کہا ہے کہ دوسرے اردو افسانہ نگاروں پر ''جس چیز کو کافکا کا اثر سمجھا جاتا ہے۔ وہ کافکا کی تفہیم کے اثرات ہیں اس کے افسانوی طریق کار سے حقیقی معنوں میں فائدہ نیّر مسعود نے ہی اٹھایا ہے۔ وہ اسے ''قطعی اور آخری معنی کی تلاش کی حوصلہ شکنی'' اور ''ذہن کو مسلسل معنی آفرینی کی خلش میں مبتلا رکھنا'' کہتے ہیں۔ کافکا کے اس ہنر کی طرف محمد حسن عسکری صاحب پہلے ہی یوں اشارہ کر چکے ہیں کہ کافکا کا سروکار تو ''جوہر کی سچائیوں'' سے ہے مگر انہیں وہ روزمرہ زندگی کی تفصیلات کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ نیّر مسعود نے کافکا کے اس ہنر سے معنویت کو پا لیا ہے۔ یوں تو ان کے روحانی مسائل کافکا سے بہت مختلف ہیں اور ان کا افسانوی دائرہ بھی کافکا کے مقابلے میں بہت کم رقبہ گھیرتا ہے مگر یا یسے کی جزئیات پر ان کی دسترس اور پھر ان جزئیات کو کسی مگھم بھید بھری دنیا میں بدل دینے کی صلاحیت کے معاصرین میں بہت کم نظر آتی ہے''۔[3]

نیّر مسعود کے بقول جب انہوں نے افسانہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت تک کافکا کو نہیں پڑھا تھا لیکن صادق ہدایت اور کافکا کے مترجم ہونے کی وجہ سے، بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ وہ صادق ہدایت اور کافکا سے متاثر ہیں۔

''لوگوں کو میری کہانیوں کے بارے میں یہ خیال رہا کہ یہ کہیں سے ترجمے ہیں۔ اس وجہ سے مجھے اور ڈر لگا رہتا ہے۔ مگر خیر اب تک کوئی چوری پکڑی تو نہیں گئی اب بھی اپنے خواب دیکھتا ہوں اور ان پر لکھتا ہوں''۔[4]

''یا اپنے خواب دیکھنا'' اور ان پر لکھنا لاشعوری طور پر انہیں کافکائی طرز کے بہت قریب لے آتا ہے۔ معمولی تبدیلی کے ساتھ نیّر مسعود کے کئی افسانے ان کے خوابوں کی سرگزشت ہیں۔ مثلاً ''نصرت''، ''مراسلہ''، ''سلطان مظفر کا واقعہ''، ''طاؤس چمن کی مینا''، ''اکلٹ میوزیم'' وغیرہ۔

نیر مسعود کے یہاں خواب ناکردہ جرم کے 'کافکائی احساس' کا باعث بھی بنتے ہیں۔ گویا ان کے افسانوں کے علاوہ، ان کے مزاج کی سطح پر بھی کافکائیت نظر آتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''یہ خیال رہتا ہے کہ میں بڑی گناہ کی زندگی گزار رہا ہوں، جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جیسے آپ ریزرویشن کرا کے اسٹیشن جائیں اور وہاں پہنچ کے آپ کو معلوم ہو کہ ٹکٹ تو گھر پر ہی رہ گیا ہے اس طرح مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ مجھے پتہ نہیں اور بہت بڑی غلطی کر رکھی ہے۔ میں نے، ایک خواب ہے جو سال میں دو تین مرتبہ ضرور دیکھتا ہوں، اس میں یہ ہے کہ میں ساری زندگی شراب بہت پیتا ہوں پوری پوری بوتلیں اور اب یہ خیال آ رہا ہے کہ ہم کو نہیں پینا چاہیے تھی اور ایک افسوس ہے کہ کیوں خواہ مخواہ پیتے رہے، کیا ضرورت تھی۔ دوسرا خواب اس سے بھی عجیب دیکھتا ہوں کہ میری شادی نہیں ہوئی ہے یعنی یہ جو میری بیوی ہیں، میں نے ان سے شادی نہیں کی ہے۔ اب بیوی ہماری مذہبی، روزہ نماز کی پابند، پرانے گھرانے کی لڑکی، تو خواب میں مجھے یہ افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے ایسی شریف لڑکی کی زندگی خراب کی۔ اگر دو بول پڑھوا لیتے تو کیا حرج تھا۔ سب سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے شادی کی ہے لیکن حقیقت میں نہیں کی۔ اب اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ کچھ ہوگا نفسیاتی معاملہ..... جب اس خواب سے آنکھ کھلتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ بڑی خوشی ہو کہ کم بخت یہ خواب تھا، حقیقت نہیں تھی قریب قریب ایک دن ویسا ہی صدمہ سا رہتا ہے کہ ہم یہ بہت غلط کام کرتے رہے''۔[۵]

نیر مسعود بچپن میں، Samnambulism، کے مریض تھے۔ اپنی بیماری کے متعلق ان کا اپنا بیان بڑا دلچسپ ہے جس میں احساس جرم کی فضا، کافکا کے ''مقدمہ'' کا وہ باب یاد دلاتی ہے جہاں جوزف K اپنے ماضی کا از سر نو جائزہ لینے بیٹھ جاتا ہے کہ شاید جرم کی نشاندہی ہو جائے۔ بقول نیر مسعود:

''بڑے ہونے کے بعد ایک آدھ بار میں نے دیکھا کہ آنکھ جو کھلی تو صحن میں کھڑا ہوں۔ پھر ایک آدھ بار میرے عزیزوں نے بتایا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ سوتے میں جا کے کوئی قتل وغیرہ کر آتا ہوں۔ یہ وحشت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اگر معلوم ہوا کہ کل رات میں سوتے میں چلا تھا تو پھر دو تین دن تک اخبار بہت غور سے دیکھتا تھا کہ کہیں کوئی پراسرار قتل تو نہیں ہو گیا ہے۔۔۔ اس طرح (افسانہ) ''مراسلہ'' جس خواب پر مبنی تھا، وہ یہ تھا کہ اس گھر میں گیا ہوں جو پرانے خیال کے لوگوں کا گھر ہے اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ تھوڑا ٹھہر جاؤ آج کسی بچے کی سالگرہ ہے اس میں شریک ہو کے جانا، میرے پاس اس بچے کو دینے کے لئے کوئی تحفہ نہیں ہے تو میں ٹال کر آ جاتا ہوں مجھ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سالگرہ کو ویڈیو فلم بنانے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے تو خواب میں مجھ کو ایک 'Shock' سا ہوا کہ اس پرانے خیال کے لوگوں کے اس گھر میں یہ ویڈیو فلمنگ وغیرہ بڑی بے جوڑ سی چیز معلوم ہو رہی ہے مگر افسانے میں اس چیز کا کوئی ذکر نہیں کیا.....''۔[۶]

اپنی کہانی ''نصرت'' کے متعلق نیر مسعود کہتے ہیں کہ انہوں نے شب خون میں چھپنے کے لیے جب یہ کہانی شمس الرحمٰن فاروقی کو دی تو انہیں بتایا کہ کہیں سے ترجمہ کی ہے اور مصنف کا فرضی نام ''رویا تیج'' بتایا۔ رویا خواب کو کہتے ہیں اور 'تیج' کپڑے کی

بنائی کو ''گویا خواب میں بنا ہوا کپڑا''۔ وجہ یہ تھی کہ ''ایک خواب میں نے دیکھا تھا، اسے کہانی کے روپ میں لکھا تھا۔ تو اس لحاظ سے یہ نام ٹھیک تھا''۔ [۷]

نصرت کا ماخذ نہ صرف خواب ہے بلکہ نیر مسعود کے ہاں کافکا کی طرح کئی کہانیوں کے پس پردہ بچپن کی واردات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ ''نصرت'' کے دو جملے حسب ذیل ہیں:

(ا) ''بدکار عورت کا قصہ مجھے اب یاد نہیں لیکن اس وقت مجھے اس میں بڑی دلچسپی تھی''۔

(اا) ''دراصل مجھے اس پورے معاملے میں دلچسپی ہی اس خیال سے تھی کہ میں ایک بدکار عورت کو دیکھوں''۔ [۸]

سکول کے زمانے میں ایک مرتبہ نیر مسعود کو اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک بدکار عورت کے پاس جانے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اس نے شاہ صاحب کو ایک باعزت گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باعث آئندہ ایسی جگہ آنے سے منع کر دیا تھا۔

کافکا کے یہاں بھی سماجی معنویت کا ظہور ذاتی اور انفرادی واردات کی تہہ سے ہوتا ہے۔ اور یہ باپ کا جبر ''کایا کلپ'' اور ''فیصلہ'' میں دو مختلف صورتوں میں سامنے آیا ہے ''مقدمہ'' میں ریاستی جبر کی صورت میں اور ''قلعہ'' میں مابعد الطبیعیاتی جبر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ انفرادی واردات کا یہ کرشمہ نیر مسعود کے یہاں ''تحویل''، ''شیشہ گھاٹ''، ''بائی کے ماتم دار''، ''بادنما''، ''بڑا کوڑا گھر'' وغیرہ میں نمایاں ہے۔

ایک اور اہم افسانہ ''سیمیا'' میں واحد متکلم کردار کو، گھر کی ہر چیز پر ناشناس ہاتھوں کا لمس محسوس ہوتا ہے ''سیاہ کپڑوں پر کوئلے کے نشان والے'' دو آدمیوں سے کافکا کے ''مقدمہ'' میں جوزف K کے کمرے میں بلا اجازت گھسنے والے دو سرکاری اہلکاروں کی جانب دھیان جاتا ہے۔ ''سیمیا'' میں جملہ ''میں پرانا نووارد ہوں'' اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ انسان کا مقدر اجنبیت سے عبارت ہے۔ اس دائمی اجنبیت کا سراغ ''قلعہ'' سے بہت شاید کسی تخلیق میں پایا جائے۔

''مسکن'' کی صورتحال بعض مقامات پر کافکا کی شاہکار کہانی ''ایک دیہاتی معالج''، جو کہ مسیحاؤں کی بے بسی اور انسان کے ناقابل علاج روگ کو بیان کرتی ہے، کی یاد دلاتی ہے۔

> ''مجھے پورے احاطے میں چھوٹی چھوٹی زرد پتیاں بکھری نظر آئیں میں نے اوپر دیکھا احاطے کے بڑے حصے کو جو پرانا درخت گھیرے ہوئے تھا اس کی پتیاں مسلسل گر رہی تھیں''۔ [۹]
>
> ''بار بار مجھے احساس ہوا کہ میری گویائی ایک نقص ہے اور وہ مریض کسی ایسی راہ پر جس سے میں واقف نہیں، مجھ سے بہت آگے چل رہا ہے''۔ [۱۰]

''رے خاندان کے آثار'' میں ایک ''موہوم عورت'' کی تلاش بالآخر کامیاب ٹھہرتی ہے اور ایک تماشا کھڑا ہو جاتا ہے کہ ''تین چار دن سے کچھ نامعلوم لوگ خود کو ڈاک کے محکمے کا آدمی ظاہر کر کے (ایک موہوم عورت کا پتا معلوم کرنے کے بہانے) شہر کے عیسائی گھرانوں کے بارے میں خفیہ معلومات اکٹھی کرتے پھر رہے ہیں یہ ایک امن پسند اقلیت کے خلاف کوئی بہت گہری سازش ہے جس کے سرغنہ کا پتا لگانے میں اخبار کے نمائندے سرگرم ہیں'' بقول شمیم حنفی ''گویا بات کو بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بن جاتا ہے اور ایک سیدھی سادی تلاش عجیب و غریب سلسلۂ واقعات کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ [۱۱]'' کافکا کا ''مقدمہ'' رائی کا پہاڑ بننے کی داستان ہے۔

کافکا کے موضوع، (خصوصاً ''مقدمہ'' کی صورتِ حال اور انجام) خوف، دہشت، عدم تحفظ کے احساس اور اسلوب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ''مارگیز'' کا ایک طویل اقتباس دیکھیے:

''اس سے پہلے جس جگہ تھا وہاں اژدہے بہت تھے۔ ہلاک کرنے والی چیزوں سے دلچسپی ہونے کی وجہ سے میں اژدہوں کو دیکھتا پھرتا تھا۔ میں ہمیشہ اس تاک میں رہتا تھا کہ اژدہے کو شکار کرتے دیکھوں اور میں نے یہ منظر بہت دیکھا، یہاں تک کہ اژدہے اور اس کے شکار کا رشتہ میری سمجھ میں آنے لگا۔ تم بھی جانتے ہو گے کہ ہر شکاری کا اپنے شکار سے ایک رشتہ ہوتا ہے'' میں جانتا تھا لیکن میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''ہر شکاری کی طرح..... ہر شکاری جانور کی طرح، اژدہے کو شکار کی تلاش اس وقت ہوتی ہے جب وہ بھوکا ہوتا ہے وہ کسی درخت سے لپٹ کر انتظار کرتا رہتا ہے، کبھی بلندی پر انتظار کرتا ہے کبھی زمین کے قریب آ کر، کبھی ایک جگہ سے مایوس ہو کر دوسری جگہ جاتا ہے اور انتظار کرتا رہتا ہے آخر شکار اس کے نزدیک سے گزرتا ہے اور دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اژدہے کو نزدیک آتے شکار کی خبر نہیں لیکن اچانک وہ تڑپتا ہے اور شکار کے بدن سے لپٹا ہو نظر آتا ہے۔ شکار بھی تڑپتا ہے، اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ موت سے دوچار ہے، اس لیے وہ پوری قوت سے تڑپتا ہے اور اژدہے کے بلوں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بل اس کے گرد بڑھتے اور کستے جاتے ہیں۔ یہ جنگ بہت سخت مگر بالکل خاموش ہوتی ہے اور کبھی کبھی دیر تک جاری رہتی ہے۔ آخر اس کی شدت میں کمی ہونے لگتی ہے، وہی موت سے دوچار ہونے کا خیال جو شروع میں شکار کی قوت بڑھاتا ہے اب اس کی قوت کو گھٹاتا ہے، اور یہاں پہنچ کر اژدہا اس کو نگلنا شروع کرتا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں جیت جانے کی چمک نہیں ہوتی۔'' مارگیر نے آہستہ آہستہ مٹھیاں بند کر لیں ''میں نے دونوں کی آنکھوں کو بہت غور سے دیکھا ہے اور ہمیشہ مجھے دونوں کی آنکھوں میں ایک سناٹا دکھائی دیا ہے جیسے وہ جان بوجھ کر ایک دوسرے کو نظر انداز کر رہے ہوں اور اس سناٹے کے پیچھے ان کی ادھ کھلی آنکھوں میں کبھی افسردگی ہوتی ہے، کبھی ایک طرح کی جھینپ اور کبھی صرف اکتاہٹ، جیسے وہ خواہش کے بغیر اپنا اپنا فرض ادا کر رہے ہوں۔ اسی لیے کبھی کبھی شاید یہ میرا وہم ہو، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے..... وہ رک گیا اور پھر بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اس نے اپنی بات پوری نہیں کی''۔ [۱۲]

ثمر مسعود کے افسانوں میں پراسراریت، خواب کی فضا، معلوم سے نامعلوم کی جانب سفر، جدید دنیا کی المناک بے سمتی، ''وقت کی ستم رانی، انسان عنصر سے مسلسل خالی ہوتی ہوئی، ٹوٹتی اور بکھرتی ہوئی زندگی کے مشاہدات'' اور مکرر مطالعہ کا متقاضی اسلوب کئی سطحوں پر کافکائیت سے مماثلت کا سراغ دیتا ہے۔

''اوجھل'' میں فضا اس وقت زیادہ پراسرار ہوتی ہے، جب واحد متکلم مکانوں کے معائنے کا آغاز کر دیتا ہے ''خواہش اور خوف'' کے ٹھکانوں کی نشاندہی، باطنی دہشت میں قاری کو شامل کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ابہام کے دھند لکے ''بڑا کوڑا گھر'' اور ''رے خاندان کے آثار'' (میں وہم نہیں حقیقت ہوں) کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔ ''تحویل'' میں ثمر مسعود کی بچپن کے خوف کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ''اکلٹ میوزیم'' میں خواب کا دکھانا سریت کا باعث بنتا ہے اور ''مارگیز'' کی دہشت آمیز فضا کافکا کی کہانی

''ایک دیہاتی معالج'' جیسی ورائے واقعیت کیفیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے ''سیمیا'' کے فلیپ پر نیر مسعود کی کہانیوں کی مجموعی فضا کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان کہانیوں میں حویلیوں، دالانوں، دروازوں، کھڑکیوں، محرابوں، کا پھیلتا ہوا سلسلہ، مکانوں کے نقشے، ایک مسکن میں خوف اور خواہش کا ٹھکانہ اور پھر ان ٹھکانوں کی ہر مکان میں جستجو، نسوانی جسموں کی خوشبو، سانپ، تعیش اور احساس جرم کا ٹکراؤ۔ یہ تمام عناصر مل کر ایک عجیب منظر نامہ تشکیل دیتے ہیں جن میں ذات کی شناخت کے کئی مراحل اور کئی ماورائے منطق راز پوشیدہ ہیں''

مارگیر میں یہ جملہ ''ایک بار اژدہے کی پکڑ میں آجانے کے بعد شروع سے آخر تک شکار کو یہ معلوم رہتا ہے کہ وہ موت سے دوچار ہے'' ''کایا کلپ'' میں گریگر سمسا اور ''مقدمہ'' میں جوزف K کی صورتحال بھی بیان کرتا ہے۔ اسی طرح نصرت کا آخری جملہ ''میں نے دروازہ بند کر دیا اور پھر وہ مجھ سے کبھی نہ کھلا''

کافکا کے قانون کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے آدمی کی سرگزشت سناتا ہے۔

کافکا کے یہاں موت ایک حل کے طور پر سامنے آتی ہے جس سے کردار کی مسلسل اذیت کا سفر ختم ہوتا ہے۔ ''مقدمہ'' ''فیصلہ''، ''کایا کلپ''، ''بھوکا فنکار'' کتنی ہی کہانیاں موت کے مسیحائی پر ختم ہوتی ہیں۔ نیر مسعود کے یہاں موت کا تصور اس سے مختلف ہے اگر چہ وہ کہانی کے آخر میں کردار کی موت کا صرف اشارہ دیتے ہیں۔ ''عطر کافور'' پوری کہانی کافکا کی ''کایا کلپ'' کی طرح موت کی خوشبو میں لپٹی ہوئی ہے:

''آپ کو کافور بہت اچھا لگتا ہے'' میری سمجھ میں فوراً کچھ نہیں آیا۔

''کافور'' میں نے پوچھا

''آپ نے اس کا نام بھی کافوری چڑیا رکھا ہے۔''

''وہ تو سفید رنگ کی وجہ سے'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس کا نام مجھے اچھا نہیں لگتا''۔

''بہت لوگوں کو اس سے ڈر لگتا ہے''

''کافوری چڑیا سے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا ''کافور سے''، مارخ سلطان بولیں ''اس سے بہت لوگوں کو مرنے کا خیال آتا ہے''۔

''کافور سے؟'' مجھے پھر حیرت ہوئی ''کافور تو بہت سی تکلیفوں کا علاج ہے''۔

''مرنا بھی تو بہت سی تکلیفوں کا علاج ہے''۔ [۱۳]

نیر مسعود کے موضوعات میں موت، ادہام اور ناقابل علاج تنہائی کا جو کافکائی رنگ ہے وہ ان اشعار یا جملوں سے بھی مترشح ہے جو عموماً وہ افسانے کے آغاز سے قبل درج کیے گئے ہیں صرف تین مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ جن کا اندراج بالترتیب ''جانوس''، ''وقفہ''، اور ''ساسان پنجم'' سے کیا گیا ہے۔

"The world,unfortunately,is real" (Jorge Lwis Borges)

"Then did I know how existence could be cherished, strengthened,
and without the aid of joy" (Emily Bronte)
"My tale was heard and yet it was not told
I saw the world and yet it was not seen
My thread is cut and yet it was not spun.
And now I live, and now my life is done. (Chidiock Tichborn)

آدم کی آدم خوری کو کافکا نے جس طرح رمزیت اور تمثیل کے سہارے بیان کیا ہے نیر مسعود کے یہاں بھی اس کا پرتو نظر آتا ہے۔

''ہر شکاری کی طرح..... ہر شکاری جانور کی طرح، اژدہے کو شکار کی تلاش اس وقت ہوتی ہے جب وہ بھوکا ہوتا ہے''۔[۱۴]

نیر مسعود نے ''مارگیز'' کے حوالے سے ایک گفتگو میں اس بات کی وضاحت بھی کی ہے۔

''اس میں کہنا یہ ہے کہ جانور جو دوسرے والے جانوروں کو مارتے اور شکار کرتے ہیں وہ ہمیشہ ضرورت سے کرتے ہیں ایک قانون ہے جنگل کا، بھوک لگے گی تو شکار کرے گا، کھائے گا، آدمی کا یہ نہیں ہے، آدمی شکار کرنے جاتا ہے تو اس لیے تھوڑا ہی کہ اسے بھوک لگ رہی ہے شکار نہیں کرے گا تو کھائے گا کیا، آدمی تو شوقیہ شکار کرتا ہے''۔[۱۵]

''ندبہ'' کا ایک جملہ دیکھیے:

''اجاڑ علاقے وہ تھے جنھیں انسانوں نے قدیم زمانوں سے آباد کر رکھا تھا۔ یہ علاقے ان جغرافیائی خطوں سے گزرتے میں کسی ٹاپو کی طرح اچانک مل جاتے تھے اور شاید انسانوں ہی کے آباد ہونے سے اجاڑ معلوم ہوتے تھے۔''[۱۶]

نیر مسعود کا ایک اسلوب بظاہر سادہ لیکن پرکار ہے۔ یہ اردو افسانے میں سہل ممتنع کی مثال ہے۔

شمیم حنفی کے الفاظ میں ''اسلوب کی 'Tranparency'، اتنی شفافیت کہ آسانی کے ساتھ اس کے آر پار دیکھا جا سکے ایک چکر میں ڈال دینے والی خوبی ہے۔ نیر مسعود کے سلسلے میں یہ واقعہ محض اتفاقی تو نہیں کہ انہیں کافکا اور بورخیس اور بعض معاصر فارسی افسانہ نویسوں کے اسلوب میں اپنے احساسات کی آہٹ سنائی دی۔''[۱۷]

دراصل نیر مسعود کی کہانیاں واقعیت سے مربوط ہونے کے باوجود بے شمار بھید لیے ہوئے ہیں اور ان پر ایک اسرار کا پردہ پڑا ہے جسے اٹھانا اتنا آسان نہیں۔ شاید اسی لیے سلیم الرحمٰن نے ''سیمیا'' پر اپنے مختصر مضمون کا آغاز گوئٹے کے اس قول سے کیا ہے۔

"To read a good book is as diffidult as writing it." [۱۸]

ڈاکٹر سہیل احمد خاں، نیر مسعود کے تہ دار اسلوب کی وجہ سے لکھتے ہیں کہ

''ان کی کہانیاں اس روش سے علیحدہ ہیں، جس میں کسی بڑی واردات کو چند اشاروں یا کلیدی استعاروں میں سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نیر مسعود ایک واردات کو اس کی جزئیات سمیت گرفت میں لیتے ہیں اور اس کے ممکنہ پہلوؤں کا دور تک تعاقب کرتے ہیں۔ اس طرح بیانیے کی طوالت واردات کو اور زیادہ گھمبیر

اور تہ دار بنا دیتی ہے''۔

جزئیات نگاری کے ذریعے واردات کی گھمبیرتا اور رمزیت میں اضافہ کی مثالیں کافکا کے یہاں ''مقدمہ'' ''قلعہ'' کے علاوہ مختلف نمائندہ کہانیوں کے ساتھ ساتھ ''اپنے باپ کے نام خط'' میں پوری چمک کے ساتھ موجود ہیں۔'' کافکا کا سروکار جوہری سچائیوں سے ہے مگر انھیں وہ روزمرہ زندگی کی تفصیلات کے ذریعے بیان کرتا ہے۔غیر مسعود نے کافکا کے اس ہنر سے معنویت کو پالیا۔''[19]

مکالمے کی سطح پر بھی اسلوب کی مماثلت نظر آتی ہے تین مثالیں دیکھیے:

(۱) ''اور اس کی بیماری کیا ہے'' میں نے پوچھا

''وہ بولتے نہیں'' لڑکی نے کہا

''گلے میں کوئی تکلیف ہے؟''

''نہیں انہوں نے خود ہی بولنا چھوڑ دیا ہے''

''کیوں؟''

''معلوم نہیں''

''اس سے پوچھا نہیں؟''

''کیا فائدہ وہ بولنا جو چھوڑ چکے ہیں''۔ [20]

(۲) ''جو گھر تمھیں یاد آتا ہے وہاں کی ہر چیز تمہارے لیے انجانی تھی اور تم انہی انجانی چیزوں سے مانوس تھے''۔

''تو علم کہاں گیا''

''علم کوئی چیز نہیں نووارد! اصل چیز تو مانوس ہونا ہے، اسی کو ہم اپنی لاعلمی کہتے ہیں''۔ [21]

(۳) ''پیراکی جانتے ہو''

''نہیں!'' میں نے گردن کے اشارے سے اسے بتایا

''پانی سے ڈرتے ہو؟''

''ڈرتا ہوں'' میں نے پھر اشارے سے اسے بتایا

''بہت؟''

''ہاں بہت'' میں نے بتا دیا

''ڈرنا چاہیے'' اس نے یوں کہا جیسے میں نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو''۔ [22]

غیر مسعود اپنے اسلوب میں دلچسپی کے عنصر کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کیونکہ ''وہ یہ راز جانتے ہیں کہ رمزی سطح کے تاثر کو برقرار رکھنے کے لیے بیانیے کے ظاہر کا اثر انگیز ہونا لازم ہے۔گہری رمزیت کے ساتھ اسلوب کی پراسرار کشش غیر مسعود کے فن کی وہ خوبی ہے جس کے پیش نظر وارث علوی نے انہیں اردو میں کافکا کی طرز کے واحد افسانہ نگار قرار دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آصف فرخی، عالم ایجاد، کراچی، شہرزاد، ۲۰۰۴ء، ص ۵۷

۲۔ وارث علوی، جدید افسانہ اور اس کے مسائل، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۹۹۰ء بار اول، ص ۱۱

۳۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر، تعبیریں، لاہور: الرزاق پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۶۲، ۶۳

۴۔ سان سین گپتا، نیر مسعود سے ایک گفتگو، آج، کراچی: شمارہ ۱۹۹۸ء، سرما بہار، ص ۲۰۳، ۲۰۴

۵۔ ایضاً، ص ۲۰۱، ۲۰۲

۶۔ ایضاً، ص ۲۰۴

۷۔ ایضاً، ص ۲۵۸

۸۔ نیر مسعود، سیمیا، لاہور: قوسین، ۱۹۸۷ء، ص ۴۳

۹۔ ایضاً، ص ۲۱۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۳۱

۱۱۔ شمیم حنفی، ہمسفروں کے درمیاں، نیو دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵۹

۱۲۔ نیر مسعود، سیمیا، لاہور: قوسین، ۱۹۸۷ء، ص ۹۰، ۹۱

۱۳۔ نیر مسعود، عطر کافور، کراچی: آج، طبع دوم، ۱۹۹۹ء، ص ۷۵

۱۴۔ نیر مسعود، سیمیا، لاہور: قوسین، ۱۹۸۷ء، ص ۹۱

۱۵۔ سان سین گپتا، نیر مسعود سے ایک گفتگو، آج، کراچی: شمارہ ۱۹۹۶ء، سرما/بہار، ص ۲۴۵

۱۶۔ نیر مسعود، طاؤس چمن کی مینا، کراچی: آج ۱۹۹۷ء، ص ۴۳

۱۷۔ شمیم حنفی، ہمسفروں کے درمیان، نیو دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۰۶

۱۹۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر، تعبیریں، لاہور: الرزاق پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۳

۲۰۔ نیر مسعود، سیمیا، لاہور: قوسین، ۱۹۸۷ء، ص ۲۳۰

۲۱۔ نیر مسعود، سیمیا، لاہور: قوسین، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۸، ۱۶۹

۲۲۔ نیر مسعود، طاؤس چمن کی مینا، کراچی: آج، ۱۹۹۷ء، ص ۲۲۳

ناول اپنی تعریفوں کے آئینہ میں

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

کسی ایک صنفِ ادب کو دوسری صنف سے برتر یا کمتر قرار دینا پہلی نظر میں بھلا نہیں لگتا۔ تاہم کہیں کہیں ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی صنفِ ادب اپنے مطالعاتی وصف اور فکر کے پھیلاؤ کی وجہ سے دوسری صنف ادب پر فوقیت حاصل کر لیتی ہے اور پھر اگر یہ صنف ادب اکثریت کو قصہ یا کہانی کی بنا پر متاثر کرے، تب اس کو فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ صنف ادب ناول ہے جس نے داستان اور تمثیلی قصوں کی اجارہ داری کو توڑا اور قاری کو اس کے عہد یا اس کے گزرے ہوئے عہد کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی وجہ سے اپنا گرویدہ کر لیا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر قاری کو ایک اجنبی عہد کا ایسا قصہ سنایا جا رہا ہے جس میں ہمہ گیر اور حقیقی انسانی جذبات واحساسات (Emotions) موجود ہیں تب بھی وہ اچھے ناول کے سحر میں گرفتار ہونے پر مجبور پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کے ''نوبل پرائز'' اور دوسرے مؤقر بین الاقوامی انعامات میں ناول نگاروں کو زیادہ حصہ ملتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ اچھے ناول کی ماجرائی ہمہ گیریت، بڑی شاعری کی ہمہ گیریت کی طرح وقت سے ماورا ہو جاتی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ ناول کی مختلف تعریفیں کیا ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ناول کی تعریفوں میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہر ناقد نے اسے نئے انداز سے دیکھا ہے۔ ناول کی ہیئت، اسلوب، تیکنیک، مواد اور ماجرے کے انوکھے فنی برتاؤ Treatment نے ایسی تبدیلیوں کی راہ ہموار کی ہے اور ساتھ ہی نئے نکتے یا نظریہ سازی کا موقع بھی فراہم کیا ہے۔ ناول کی مختلف تعریفوں کو اگر ایک ساتھ جوڑ کر دیکھیں تو ایک دلچسپ منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ آیئے ان تعریفوں یا ان کی تشریحات کا جائزہ لیں۔

ناول کے لیے عمومی طور پر کہا گیا ہے کہ یہ ایک ایسے طویل قصے کا نام ہے جو کسی عہد کو سارے توقعات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس میں موجود صداقت اور حقیقت جزوی یا کلی پھیلاؤ کے ساتھ ہمارے قلب و ذہن کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ جھنجھوڑتی بھی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ابعادی Dimensional بھی بن جاتا ہے بشرطیکہ اس میں زیادہ سے زیادہ جہات سمیٹ دی گئی ہوں۔ اس میں ایک سے زیادہ عہد بھی ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر جو ناول نگار تاریخ کو سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی کروٹوں کا احاطہ کرتے ہیں وہ ایک طویل عرصے کی حقیقی انسانی نفسیات اور اجتماعی شعور و لاشعور کے حوالے سے پڑھنے والوں کو تحیر میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ چونکہ ناول کا فکری کینوس وسیع و عریض ہوتا ہے، اس لیے اس میں زندگی کے بڑے بڑے مسائل جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ یہ مسائل جان لیوا بھی ہو سکتے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانوں کی برادریاں ایسے ہی مسائل

کا شکار رہی ہیں، جن کی بنا پر ان کے نصیب میں موت یا پھر ہجرت آئی ہے۔ ہجرت کے مسائل کے نفسیاتی وسماجی اور سیاسی ابعاد ناول میں وہ مطالعاتی دھمک پیدا کرتے ہیں کہ یہ بصیرت مسلسل کا سفر بن جاتا ہے۔ ناول داستانوں اور رزمیہ نظموں میں پنہاں تھا، ناول نگار نے اسے ان کے بطون سے نکال کر اور حقیقت پسندی کے جوہر سے متصف کر کے ایک نئی صنف ادب کی تخلیق کی۔ ناول میں جہاں مبالغہ آمیز تخیل سے گریز اور معاشرہ کی صداقت آمیز عکاسی کا اثبات ہوا وہیں اس میں فنتاسی Fantasy کی تیکنیکی دل ربائی بھی شامل ہوئی، جس سے ایک اخلاقی دنیا کا تصور ابھرا۔ فنتاسی نے طنز، مزاح اور ناقابل یقین ماحول اور قصے سے یہ نظریہ ابھارا کہ تبلیغ اور پروپیگنڈے کے سحر سے آزاد ہو کر بھی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ایک مخصوص لائن آف ایکشن (Line of action) عالم انسانیت کے لیے بہتر ہے۔

ناول کے لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں ایک پلاٹ ہوتا ہے جو اس کی عمارت کی بنیاد ہوتا ہے۔ بغیر پلاٹ کے قصہ کو گویا گمراہی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ یہ تصور بھی پاش پاش ہو گیا۔ ناول کے لیے پلاٹ جو اس کی ہیئت Form کا غالب حصہ مانا جاتا تھا اب ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔ بغیر پلاٹ کے بھی ناول لکھے گئے تھے اور اب بھی لکھے جا رہے ہیں۔ اس طرح ناول کے کردار اور مکالمے ڈرامہ کی مانند ضروری خیال کیے جاتے تھے تاہم کردار کے مقابلے میں محض قصے ہی کو کئی ناول نگاروں نے اہمیت دی (یعنی کردار کو نہیں ابھارا گویا کچھ ہیولے ہوں!) البتہ مکالماتی فضا یا تو سرے سے موجود نہیں ہوتی یا پھر ناول نگار کے طولانی تبصرے ہی قصہ نگاری کے فرائض انجام دیتے ہیں لیکن یہ اگر دلچسپ نہ ہوں اور ماجرا آگے نہ بڑھتا ہو تو ناول ابلاغ کے حوالے سے ٹھس پن اور بوریت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ناول کی ایک مجموعی ہیئت بھی ہوتی ہے جو اسے اس صنف ادب کی پہچان عطا کرتی ہے لیکن کچھ تجربے ایسے کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے ناول کو اینٹی ناول/ردناول بھی کہا جاتا ہے۔ اردو ناول کے قارئین میں اس قسم کا ناول عدم ابلاغ کی وجہ سے مقبولیت حاصل نہیں کر سکا۔ ناول نگار کے لیے یہ بھی ضروری ٹھہرتا ہے کہ وہ زندگی کی گہرائیوں میں جا کر قصے کی تشکیل کرے، خواہ ہیئت میں خفیف سی تبدیلی بھی ہو۔ قاری جو خود اپنی زندگی کی غواصی نہیں کر پاتا اور نہ اپنے آپ کو پہچان پاتا ہے اس کے لیے تو ضروری ہے کہ ناول نگار زندگی کی گہرائیوں میں پہنچ کر اپنے تجربے، مطالعے اور مشاہدے کی امتزاجی خصوصیت سے اسے متاثر کرے۔ اس کے شعور میں اضافہ کرے اور اسے کسی رخ سے آشنا کرے اور زندگی کے بارے میں اس کے منفی وژن کی تصحیح کرے۔

کیا یہاں ناول کی تعریف، تصریح یا تشریح کا اختتام ہوتا ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ میرین کرافورڈ ناول کو پاکٹ تھیٹر کے نام سے پکارتی ہیں یعنی ایک ایسی کتاب جو بشکل تھیٹر یا اسٹیج ہماری جیبوں میں موجود ہے۔ ناول کو اپنے عہد کی اہم دستاویز مانا گیا ہے۔ یہ گزرے ہوئے عہد کی بھی اہم دستاویز ہے۔ اسی لیے شاید کہا گیا ہے کہ تاریخ میں کرداروں کے نام سچے اور واقعات جھوٹے ہیں۔ لیکن ناول میں نام فرضی لیکن واقعات سچے ہوتے ہیں۔ خیر یہ جزوی صداقت مانی جا سکتی ہے اگر تاریخ داں ناول نگاری کی طرح دیانت دار اور تعصبات سے آزاد ہو تو اس کی تحریر میں نام اور واقعات دونوں حقیقت پر مبنی ہوں گے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ خود صداقت گریز قارئین اسے ہضم نہ کریں لیکن صداقت و حقیقت کے جویا اسے پسند کریں گے!

ڈی ایچ لارنس نے اپنے مضامین میں ناول کے متعلق جو کچھ تحریر کیا وہ اس کی تعریفوں اور تشریحات کا زبردست اثاثہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک ناول نگار کی حیثیت سے وہ خود کو کسی بھی فلسفی اور سائنس دان سے اور شاعر سے بالاتر سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ زندہ انسان کے مختلف اجزا کی سالم صورت کا کوئی ادراک نہیں رکھتے یعنی ناول نگار اس کا ادراک رکھتا ہے۔ وہ ناول کو گلیلیو کی دوربین سے بڑی ایجاد کا درجہ دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح دوربین سے دور کے فاصلے سمٹ جاتے ہیں اور بصارت بڑھ کر بصیرت میں تبدیل ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح ناول زندگی کی گہرائی میں جا کر ان سنی، ان دیکھی اور ان پرکھی حقیقتوں اور صداقتوں کی رونمائی کر دیتا ہے! ناول کے لیے کہا جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی دوسری صنف ادب ایسی ہو جو تمام علوم کو اپنے اندر سمیٹ لے۔ اب نیا علم جینومکس Genomix جسے جینٹک انجیرنگ (یعنی خلیوں کا علم) کہنا چاہیے ادب یعنی ناول کا حصہ بننے کو تیار ہے۔ علم نفسیات، علم البشریات، دینی علوم، تاریخ وغیرہ تو اس میں اپنے جلوہ دکھا ہی رہے ہیں۔ جین آسٹن جیسی ناول نگار قصے کی حرمت کو مانتے ہوئے چاول کے دانے پر ایک دنیا کی تصویر دکھانے کے عمل کو ناول نگاری مانتی ہیں۔ ورجنیا وولف کہتی ہیں کہ ناول میں اتنی جگہ ہوتی ہے کہ ناول نگار اس میں ہر چیز سمو سکتا ہے۔ لیونل ٹرلنگ (Lionel Trilling) کے نزدیک ناول نگاری ایک ایسی افادی کوشش ہے جس میں قاری خود کو ملوث کر لیتا ہے۔ اپنی اقدار کو تولتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ حقیقت وہ نہیں جس کی اسے تعلیم دی گئی ہے بلکہ وہ ہے جو وہ ناول سے اخذ کر رہا ہے۔ ڈی ایچ لارنس جس نے ناول کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا ہے اور جس کا خلاقانہ ترجمہ مرحوم مظفر علی سید نے کیا تھا ایک اور حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ ناول ایک مکمل انسان کا اظہار ہے۔ رالف فاکس اسے دور حاضر کی رزمیہ نگاری کا فن تسلیم کرتے ہیں اور نوبل انعام یافتہ کولمبیا کے ناول نگار نے جن کا ناول ''ون ہنڈ ریڈ ایرس آف سولی چیوڈ'' (One Hundred Years of Solitude) (جس کا خوش قسمتی سے لاہور سے اردو ترجمہ بھی منظر عام پر آ گیا ہے) اب دنیا کے بڑے اہم ناولوں میں شمار ہو چکا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ناول خفیہ کوڈز (Codes) میں بیان کی گئی حقیقت کا نام ہے۔ ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) ناول کی عظمت کو بڑھاتے ہوئے اسے سچائی سے بھی آگے کی چیز گردانتا ہے۔ پریم چند، ''مضامین پریم چند'' میں ایک مضمون میں ناول کو انسانی کرداروں کی مصوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانی کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا ہی ان کے نزدیک ناول کا بنیادی مقصد ہے۔ شو نپہار ناول کو ایک ایسی تصنیف مانتا ہے جس میں بڑے واقعات دکھائے جائیں اور اگر چھوٹے واقعات دکھانا مقصود ہوں تو انہیں دلچسپ بنا کر پیش کیا جائے۔ ای کے چیمبرز کی رائے بہت سیدھی سادی ہے، کہ ناول ایک ایسی طویل بیانیہ نثر ہے جس میں اصل زندگی کی پیشکش کی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ طویل بیانیہ نثر کا کھیل ختم ہونے لگا ہے۔ یورپ یا یوں کہیے کہ مغرب میں کافکا، کامیو، تامس مان، اپڈائیک وغیرہ نے چھوٹے کینویس کے ناول بڑے وژن (Vision) کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔ ہمارے یہاں ڈاکٹر انور سجاد، انیس ناگی اور اب عبداللہ حسین اور احمد داؤد وغیرہ نے چھوٹے کینویس والے ناول لکھے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اب ایک رجحان میں تبدیل ہو جائے۔ ہمارے یہاں انڈیا کے مقابلے میں اب بھی نسبتاً طویل ناول لکھے جا رہے ہیں۔

یہ ناول کے سلسلے میں تشریحاتی یا توضیحاتی ملفوبہ ہے۔ اس میں غالباً سب چھوٹے بڑے پہلو یا تمام ممکنہ جہات سمٹ آتی

ہیں اور شاید ان حدود سے باہر ناول کو دیکھنا ممکن نہ ہو۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ خدانخواستہ اینٹی ناولوں کے جم غفیر میں ناول کی تعریف غیر معروف معنوں میں کی جائے۔ خیر اردو ناول ابھی اس قسم کی آلائش سے پاک ہے۔ لہٰذا مستقبل میں نئی تعریفوں کا موہوم سا امکان ہو سکتا ہے اس وقت تک تو انہی طے شدہ تعریفوں سے کام چلانا پڑے گا۔ لیکن اس مذکورہ مواد کو بھی توضیح اور تشریح کے دائرے میں لانا ضروری ہے تاکہ ہمارے ناول کے جمع شدہ اثاثے کی اہمیت واضح ہو سکے۔ جہاں تک طویل بیانیہ جس میں ایک عہد یا ایک سے زیادہ عہدوں کی بات کی گئی ہے کا تعلق ہے اور یہ بھی کہ تمام تر تنوعات کے ساتھ اس میں ماجرے یا قصے کی درو بست موجود ہوتی ہے تو ہماری نگاہ ''آگ کا دریا'' پر پڑتی ہے جس میں ڈھائی ہزار سال کی زندگی کو تمام تر تنوعات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں وہ باسٹھ فلسفے ہیں جن سے گوتم، جو ہندوستان کی روح کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، پریشان ہے۔ اپنے آشرم میں جہاں سے وہ علم و دانش کی زندگی کا آغاز کرتا ہے اس کا آخیر بھی ایسے مقام پر ہوتا ہے جہاں وقت Time اور تاریخ کے زخموں سے انسان چور چور ہے، نوآبادیاتی دور گزر چکا ہے، برصغیر تقسیم ہو گیا ہے، فرقہ وارانہ فسادات نے قلب و ذہن پر ناقابل مندمل گھاؤ لگا دیے ہیں۔ نفرتوں کی دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں، پرانا کلچر تار تار ہو گیا ہے اور انسان نئی سوچ کے ساتھ اپنا سفر شروع کرنے کو ہے۔ تاریخ سے گوتم نے کیا سبق سیکھا ہے؟ یہی کہ انسان اس ڈھائی ہزار سال میں اپنی تہذیب میں کس قدر بدلاؤ دیکھ چکا ہے، وہ شکست خوردہ ہے مگر پاش پاش بھی۔ کمال جوان مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے جو ہندوستان میں بڑے طمطراق سے داخل ہوئے تھے، حکمرانی کی تھی اور پھر نئے ملک کو واپس چل دیئے تھے۔ یہ چیوایشن کس قدر دل ہلا دینے والی ہے کہ کمال کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح نکل گیا!! چمپا وہی عورت ہے جو صدیوں سے اپنے آدرش کا بوجھ ڈھو رہی ہے یعنی ایک معمہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا! کیا نا آسودگی اس کا مقصد ہے؟ یہ سوال اس کی زندگی کے مختلف مظاہر میں اٹھتا ہے مگر گوتم کے حوالے سے وہ فرماں بردار، خدمت گزار، وفاکیش بیٹی، بہن اور سب سے بڑھ کر ماں ہے۔ ''آگ کا دریا'' میں تقسیم کے حوالے سے ناسٹلجیا یا غریب الوطنی کا احساس موجود ہے یہ احساس ''میرے بھی صنم خانے'' اور ''سفینۂ غم دل'' سے ہوتا ہوا یہاں تک آ کر وسیع نفسیاتی و سماجی غم میں ڈھل چکا ہے۔ اس ناول میں شاید ہی کوئی پہلو بشمول موت کا غم، وقت کی کارفرمائیاں، انسانی مقدرات، مذہب کا انسانی زندگی میں عمل دخل، ہجرت کے مسائل، نوآبادیاتی طاقتوں کا محکوموں پر سماجی و اقتصادی ظلم اور تہذیب کا بننے و بگڑنے میں نئی شکل اختیار کرنا۔

''آگ کا دریا'' کے ساتھ انہی پہلوؤں کے لیے ڈاکٹر احسن فاروقی کے نو سو سالہ برصغیر کی مسلم تاریخ پر مبنی ناول ''ستلم'' کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اس میں خواہ ہم ان کی اس تھیوری کو لاکھ شبہے کی نگاہ سے دیکھیں کہ اسلام ہمارا مقدر رہے اور وہ آ کر رہے گا مگر بہرحال وہ ان کی رائے ہے جس کی تائید اور مخالفت قاری اور ناقد کا حق ہے۔ ''ستلم'' کے ساتھ ''اداس نسلیں'' کا ذکر ضروری ہے۔ جس میں عبداللہ حسین نے پہلی جنگ عظیم سے قیام پاکستان تک کی معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی کروٹوں کا حال چال بیان کیا ہے۔ اس کے دو کردار نعیم اور عذرا اردو ناولوں کے اہم کرداروں میں اپنی مخصوص نفسیات کے حوالے سے قابل ذکر ہیں۔ اس میں ایک نسل کا دکھ خوب صورت ماجرائی انداز سے ظہور کرتا ہے۔ دوسری طرف ضخیم ناول ''لہو کے پھول'' جسے حیات اللہ انصاری نے تمام تر معاشرتی سیاسی،، تہذیبی اور معاشی تنوعات کے ساتھ پیش کیا ہے، ناول کو اپنے دور یا کئی ادوار کی اہم

دستاویز مانا گیا ہے۔ان تین مذکورہ ناولوں سے ہٹ کر''آنگن'' کا بھی شمار ضروری ہے اگر چہ اس کا کینولس مختصر ہے،اس میں آزادی کی تحریک کی گرمی ہے اور ایک خاندان کے سماجی وتہذیبی حالات، جو کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان معلق ہے،ایک اہم دستاویز کے طور پر ہوتا ہے۔اس میں بڑے اور چھوٹے سب کردار نا قابل فراموش ہیں۔ اسے سیاسی رجحان کے ناول کے طور سے دیکھنے کے باوجود ہمیں مسلمانوں کی سوچ اور فکر،ان کے رہن سہن،ان کی آرزوؤں اور تمناؤں اور ان کے رسم ورواج سب کو تہہ داری کے ساتھ برتا گیا ہے۔رالف فاکس اگر اسے دور حاضر کی رزمیہ نگاری EPIC تصور کرتے ہیں تو اس کے لیے ہم زمین (خدیجہ مستور) ایوان غزل (جیلانی بانو) اللہ میگھ دے (طارق محمود) تنہا (سلمیٰ اعوان) صدیوں کی زنجیر (رضیہ فصیح احمد) چلتا مسافر[1] (الطاف فاطمہ) خدا کی بستی اور جانگلوس (شوکت صدیقی) خون جگر ہونے تک (فضل احمد کریم فضلی) ایسی بلندی ایسی پستی (عزیز احمد) اور دوسرے کئی ناول حوالے کے طور سے پیش کر سکتے ہیں۔اگر نا سٹلجیائی رجحان کی ہجرت کے حوالے سے وہ اہمیت ہے جسے وہ قاری جو کہ ہجرت کے تجربے سے گزرا ہے،محسوس کرتا ہے اور وہ جسے ناول نگار بھی محسوس کرا دیتا ہے تب انتظار حسین کے تینوں ناول ''بستی''،''تذکرہ'' اور ''آگے سمندر ہے'' ہمارے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔جوگندر پال کا ''خواب رو'' جو نئی سرزمین میں ہجرت کرنے والوں کو اپنا پودا لگا کر پھلتے پھولتے دیکھنے کا تاثر واگزار کرتا ہے اسی صنف کا ناول ہے۔فنتاسی کے حوالے سے بھی ہمارا ناول اپنا اثبات کراتا رہا ہے۔کرشن چندر کا ''ایک وائلن سمندر کے کنارے'' حجاب امتیاز علی کا ''پاگل خانہ'' اور محمد خالد اختر کا ''چاکیواڑہ میں وصال'' (اس میں خیبلی کرداروں کو برتا گیا ہے۔اس کو معاشرتی فنتاسی میں شمار کیا جا سکتا ہے) اس کی اہم مثالیں ہیں۔دیہات کی خوب صورت پیش کش کے لیے جس میں کرداروں کی معصومیت نیز شر پسندی پر کشش رسم و رواج سب کا امتزاج موجود ہے۔ہم بلونت سنگھ کے ''کالے کوس'' اور ''رات چور اور چاند'' سید شبیر حسین کے ''جھوک سیال'' غلام عباس کے ''گوندنی والا تکیہ'' اور غلام الثقلین نقوی کے ''میرا گاؤں'' کی مثال دے سکتے ہیں۔اگر ہم ورجنیا وولف جیسی نابغہ ناول نگار کی اساسیات پر ایمان لے آئیں کہ ناول میں اتنی (زمانی مکانی اور فکری) وسعت ہوتی کہ اس میں سب کچھ سمویا جا سکتا ہے تو بیدی کے مختصر ناول ''ایک چادر میلی سی'' کو دیکھ لیا جائے جس میں انسانی مقدرات کے زندگی میں عمل دخل کو وسیع بنیاد پر برتا گیا ہے۔اگر اسی نکتے کو پھر سے ذہن میں رکھا جائے تو ہم اسلامی فکر کے حوالے سے (جس پر خاصی لے دے ہوئی ہے) ''راجہ گدھ'' (بانو قدسیہ) کی مثال دے سکتے ہیں جس میں انسانی جینز Genes یعنی خلیوں کے حوالے سے رزق حلال کے پاک اثرات اور رزق حرام کے حوالے سے مضر اثرات کو برتا گیا ہے۔جس قاری میں مشاہدے اور تجربے کی قوت ہوگی وہ اس تھیوری پر یقیناً ایمان لے آئے گا جس کو ناول کی بنیاد بنایا گیا ہے۔اس ضمن میں عبداللہ حسین کے ناول ''قید''،مستنصر حسین تارڑ کے ''راکھ''، ''بہاؤ'' اور ''قلعہ جنگی''[2] کو بھی رکھا جا سکتا ہے۔خاص طور پر ''بہاؤ'' کے ماجرے کو محیر العقول قرار دیا جا سکتا ہے۔اسے محیر العقول

---

[1] اللہ میگھ دے۔تنہا۔صدیوں کی زنجیر اور چلتا مسافر۔ یہ چاروں ناول سابق مشرقی پاکستان کی پاکستان سے علیحدگی یا سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے قابل ذکر ہیں۔یہ نہ صرف مقتدر سیاسی حلقوں کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ عبرت کا احساس بھی جگاتے ہیں۔

[2] ''بہاؤ'' کی تخلیقی اہمیت کا ابھی لوگوں کو صحیح اندازہ نہیں ہو سکا ہے۔یہ بڑا منفرد ناول ہے۔البتہ ''قلعہ جنگی'' کو افغان جنگ کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔انیس ناگی کا ناول 'کیمپ' بھی افغان جنگ کی یاد دلاتا ہے۔

اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اسے وسیع وعریض علاقے پر پھیلی تہذیب کے لسانی وتاریخی تناظر میں ناقابل یقین طریق پر تخلیق کر دیا گیا ہے۔پھر افغان جنگ کے ماحول کو ماجرے کا حصہ بناتے ہوئے جس طرح ''قلعہ جنگی'' میں پھنسے مجاہدین جو مختلف ملکوں سے آ کر جمع ہوئے ہیں اور قطرہ قطرہ موت کا مزا چکھ رہے ہیں وہ بھی ہمیں بتاتا ہے کہ ذہین فن کار واقعی ماجرے یا مواد کے اعتبار سے قاری کو ایک ایسی دنیا کا مشاہدہ کرا سکتا ہے جو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگی۔عبداللہ حسین کے مختصر ناول ''قید'' میں بھی حرماں نصیب ہیروئن کے حوالے سے بھی اس قسم کی حیرت انگیز و ناقابل یقین داستان ہے۔ناول میں ہر ملک میں تجربے ہوئے ہیں۔یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ناول ایک سطح پر رکا رہے۔انسان کا، یعنی فن کار کا ذہن اتنا تخلیقی، زرخیز اور نئے پن کی تخلیق کی قوت سے متصف ہے کہ ہیئت میں تبدیلی کے ساتھ اپنی داستان رقم کر سکتا ہے۔انور سجاد کا ''خوشیوں کا باغ'' انیس ناگی کا ''دیوار کے پیچھے'' اور فہیم اعظمی کا ''جنم کنڈلی'' (جو اینٹی ناول تک آ جاتا ہے) ہمیں نئے ذائقے سے روشناس کراتا ہے۔ناول کو بہت سے فن کار اپنی ذات کی تجسیم بنا دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی فکر کو کردار کے پردے میں واضح کر سکیں۔ ڈپٹی نذیر احمد ''ابن الوقت'' ''مراۃ العروس'' ''بنات النعش'' میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔''امراؤ جان ادا'' کی کہانی تو ایک کردار کی صورت میں مرزا ہادی محمد رسوا خود ہی سناتے ہیں اور تہذیب کے زوال کی اس صورت کی وضاحت کر دیتے ہیں جو ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول ''شام اودھ'' عزیز احمد کے ''گریز'' اور ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں زیادہ ٹھوس شکل اختیار کرتی نظر آتی ہے۔نثار عزیز بٹ کے یہاں ''نگری نگری پھرا مسافر'' سے لے کر جدید رنگ ''کاروان وجود'' اور ''دریا کے سنگ'' میں پھلتا پھولتا نظر آتا ہے۔نسوانی کردار میں پنہاں آدرش کی چنگاری کی جو وقت کے ساتھ شعلہ بنتی ہے عکاسی میں ان کا جواب نہیں۔کردار نگاری کی جولانی جس کے لیے ناول قصے یا ماجرے کے بعد قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے، ہمیں بہت سے ناول نظر آتے ہیں۔پریم چند تو ناول کو کرداروں کی مصوری ہی کہتے ہیں خود ان کے ناول ''گئودان'' کا ہوری ہمارے ناول کو دنیا کا ناقابل فراموش صابر وشاکر، ہمدرد ومظلوم کردار جس کا صبر وتحمل اور ظلم کو جذب کرنے کی درویشانہ وبشری صلاحیت استحصالی قوت کے خلاف خاموش مگر مؤثر مزاحمت کا رمزیہ اشارہ ہے۔''لبیق'' کا ذاکر اور ''تذکرہ'' کا اخلاق انتظار حسین سے ملتا جلتا کردار ہے۔''آگے سمندر ہے'' کا جوا وہ خود ہیں حالانکہ ان کے فکر کی ترجمانی ایک مجہول کردار مجو بھائی کرتے ہیں! لیکن ہمارے ناول میں ماورائی قسم کے کردار بھی ہیں۔مثلاً حجاج بن منصور حلاج جو ''دشت سوس'' میں چاند کی طرح ابھرتے ہیں اور امر ہو جاتے ہیں۔جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول تاریخیت کے حوالے سے اہم ہے۔''چہرہ بہ چہرہ روبرو'' میں اس کا نسوانی کردار ان کی کردار نگاری کی فنی قوت کی یاد دلاتا ہے تاہم شروع کے ناول ''تلاش بہاراں'' میں راج کا کردار مبالغہ کا شکار ہو گیا ہے۔تاہم بعد میں ''دشت سوس'' میں انہوں نے زبردست جست لگائی۔کردار نگاری کے حوالے سے رحیم گل کے ناول ''جنت کی تلاش'' کی احمل، ''شام اودھ'' کے نواب ذوالفقار علی خان۔''گردش رنگ چمن'' کے پیر صاحب یا میاں اور دلشاد علی خان عرف دلن میاں گوتم۔کمال اور چمپا تو قرۃ العین حیدر کے دائمی قدر والے کردار ہی ہیں۔

ناول اگر لارنس کے الفاظ میں مکمل انسان کے اظہار کا نام ہے تو اسے کیا سمجھا جائے؟ کیا یہ سمجھا جائے کہ انسان کے کردار کی جتنی بھی قابل یقین اور ناقابل یقین جہتیں ہوں وہ سب کی سب متشکل ہو جائیں تو کیا یہ ایک ناول میں ممکن ہے یا ایک

عہد کے بہت سے ناول مل کر اس فریضے کو انجام دیتے ہیں؟ ناول نگار، ایک حد تک ہی کردار کی عکاسی کر سکتا ہے یعنی جتنا اس نے زندہ کرداروں کو دیکھا، جتنا اس نے تاریخی کرداروں یا ماضی کے کرداروں کے بارے میں سنا اور پڑھا اور اس کی حقیقت پسندانہ عکاسی کر دی اور جتنا اس نے اپنے تخیل کی بنیاد پر کسی کردار کو تخلیق کر دیا کہ یہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور قاری اس پر بھروسہ کر کے اس کی ذات کو تسلیم کرے یا پھر ہم یہ سمجھیں کہ مکمل انسان وہ ہے جو خاص حالات اور عہد میں داخلی اور خارجی جبر (COMPULSIONS) کے درمیان سینڈوچ ہو کر جس طرح تمام تر ممکنہ عمل اور ردعمل کے حوالے ایک پودے کی طرح بڑھتے ہوئے درخت کی شکل اختیار کر لے اور مکمل Round کردار بن جائے اور پھر ایسے ناول میں زندگی اور فن یکجا ہو جائیں اور قاری اس مکمل انسان کو مرتے دم تک نہ بھول سکے۔ یہ مکمل انسان ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں اس کی ذات کے حوالے سے کوئی فکری، موضوعاتی اور نفسیاتی خلاء نہ ہو۔ اس کے لیے ہم اگر ابتدا سے اب تک کے جدید ناول دیکھیں تب ہمیں احساس ہو جائے گا کہ ہمارے ناول کا مکمل انسان کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے۔ اسی طرح نوبل انعام یافتہ ناول نگار گیبریل گارسیا مارکیز کا یہ کہنا کہ ایک اچھا ناول خفیہ کوڈز (Codes) میں بیان کی گئی حقیقت کا نام ہے۔ یہ بھی ایک بڑا خراج تحسین ہے۔ ناول جیسی صنف ادب کو جو ہر دور میں ایک نئے انداز سے موضوعاتی، اسلوبیاتی اور فکری سطح پر اپنا اثبات کرا رہا ہے۔ اور ہر اہم ناول نگار اس فن کے حوالے سے ایک نئی کوڑی لے آتا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ناول اور حقیقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے ورنہ یہ اب تک داستان کی پوٹلی سے نئے انداز سے ظہور نہیں کرتا۔ حقیقت کی بھی اگر دیکھا جائے تو کوئی انتہا نہیں ہوتی بلکہ یہ لامحدود فکری تلازمے رکھتی ہے اس لیے کہ زمانہ ازل سے ابد تک لامحدود جست لگاتا جائے گا۔ ہر زمانے کی اقدار، اس کا تمدن اور اس کی اجتماعی سوچ خواہ بین الاقوامی سطح پر کئی تہذیبوں کی کئی سوچیں ہوں ناول میں اپنا ٹھکانہ بنا کر ایک نئی تھیوری کو جنم دے ڈالتی ہیں۔ یا پھر مختلف نقاد یا تخلیق کار ہو سکتا ہے کہ ایک ہی بات کو مختلف شکلوں میں بیان کر رہے ہوں۔ سائنس کے کلیوں کی طرح جو ہر نئی ایجاد میں اپنی صداقت کے ساتھ جلوہ گر رہے ہیں اور اشیا کو وہ شکل دیتے رہتے ہیں جن کے بارے میں گزشتہ نسلوں کو آگاہی بھی نہ ہوتی ہو۔ یعنی ناول کے سلسلے میں بات وہیں آ کر رک جاتی ہے کہ ناول اور حقیقت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ مگر یہ خفیہ کوڈز کیا ہیں؟ وہ علامتیں جنہیں ہم ماجرے کی آگاہی کے بعد ڈی کوڈ کرتے ہیں؟ وہ فکری تلازمے جو ایک خاص اسلوب سے ماجرے سے پھوٹ رہے ہوں اور اوپر سے تھوپے نہ گئے ہوں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اور پروفیسر ممتاز حسین دونوں کا یہ خیال تھا کہ فکر کو قصے سے برآمد ہونا چاہیے نہ کہ قصہ یا ماجرا فکر کے بطن سے پیدا ہو۔ اگر واقعی فکر قصے یا ماجرے سے پھوٹتی ہے تو کرداری عمل اور ان کی کہی اور ان کہی جہتیں اور بین السطور ایک لفظ، ایک جملہ یا ایک بصیرت آمیز اشارہ یا پھر کوئی رمزیہ صورت حال سب مل کر کوڈز کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور بین السطور ایسی حقیقت یا صداقت کو آشکار کر رہے ہوتے ہیں جو ناول کی تخلیق کا سبب بنا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ذہین ناقد اور ذہین قاری دونوں ان کوڈز کی تہہ میں پہنچ کر حقیقت یا صداقت کی ان جمالیاتی لہروں سے یقیناً لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے ''بہاؤ'' میں جا بجا ایسے Codes موجود ہیں۔ دوسرے ناولوں میں بھی کوڈز کی بڑی لہریں رواں دواں ملیں گی صرف ڈی کوڈ کرنا شرط ہے! ہماری دنیا ہم سے کہیں زیادہ وسیع و عریض ہے لیکن ادیب میں جو تحریری شعور کی بے

کراں انسانی ذات کے ان گنت اعمالی گوشوں کو گرفت میں لینے والی بہت ہی بڑی دوربین یعنی جناتی یا دیو پیکر آنکھ ہے، اس کے سامنے تخلیقی سطح پر دنیا غالباً ایک نقطے کے برابر ہے۔ لیکن یہ تخلیقی صلاحیت دنیا بنانے والے ہی کی طرف سے ودیعت کردہ نعمت نظر آتی ہے۔ ناول جو ہمارے یہاں تمثیلی تکنیک کے بطن سے برآمد ہوا ہماری ان بحث کردہ تعریفوں پر پورا اترتا رہا ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا کباڑ خانہ بھی ہے اور زمانہ حال کا ڈیپارٹمنٹل اسٹور بھی اور مستقبل کے حوالے سے جام جم بھی۔ کتنے ہی ایسے ناول ہیں جن کو پڑھ کر قاری سمجھ جاتا ہے کہ آنے والے دور یا ادوار میں انسانی ذات کیا گل کھلائے گی یا صورت حال کون سی دوسری صورت حال کو جنم دے گی۔ ای ایم فورسٹر کے ناول "اے پیسیج ٹو انڈیا "A Passage to India" کا قصہ بتا چکا تھا کہ برصغیر تقسیم ہو کر رہے گا۔ قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا'' اور ''گردش رنگ چمن'' خدیجہ مستور کا ''آنگن'' اور عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' ہمیں بتا چکے ہیں کہ منفی اقدار کے قیام اور مادیت پسندانہ انسانی روش سے انسانوں کو شکست وریخت کا صدمہ اٹھانا پڑے گا۔ بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ'' (گو کہ ان کی رزق حلال کے پاک اثرات اور رزق حرام کے مہلک اثرات کی تھیوری کو بعض نقاد طنز و تضحیک کا نشانہ بنا چکے ہیں) اس وقت کم از کم یہ تو ثابت کر رہا ہے کہ رزق حرام عروج پر ہے اور اس کے سماجی و معاشرتی مظاہر حساس افراد کو شدید مایوسی اور ڈپریشن (Depression) کی جانب دھکیل رہے ہیں۔ خاندان کے خاندان متاثر ہو رہے ہیں اور لوگ ایسے منفی کلمات کا اظہار کر رہے ہیں جو پہلے سننے میں نہیں آتے تھے۔ اس سے نوجوان نسل تک متاثر ہو رہی ہے اگر اس نسل کے خیالات سنے جائیں تو خوف آتا ہے! غرض ہر طرف ذہنی اور نظریاتی افراتفری ہے۔ انیس ناگی کے ''کیمپ'' اور ''محاصرہ'' اور مستنصر حسین تارڑ کے ''قلعہ جنگی'' کو سنجیدگی سے پڑھ کر اپنے وجود کے بارے میں تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تارڑ ہی کا انعام یافتہ ''راکھ'' (۱۹۹۷) انتہائی کیفیت (Writing on the Wall) کا حامل ہے۔ میرا خیال ہے کہ ناول کی مختلف تعریفوں میں سب سے خوب صورت نظریہ یہی ہے کہ اس حیرت انگیز صنف ادب میں سب کچھ سمویا جا سکتا ہے۔

مقالہ نگاروں سے التماس

طبع شدہ یا کسی اور رسالے کو ارسال کردہ مقالے مخزن میں اشاعت کے لیے نہ بھجوائیں اور نہ ہی مخزن میں بھجوائے گئے مقالے اشاعت کا فیصلہ ہونے تک کسی اور رسالے کو ارسال کریں۔

مدیر

اقبال کے شعر و فلسفہ پر رومی کے اثرات

ڈاکٹر تحسین فراقی

یوں تو تاریخ فکر انسانی میں بیسیوں ایسے دبستان نظر آتے ہیں جن کے نظامہائے فکر ایک دوسرے سے متصادم اور متعارض ہیں۔ مگر جزئیات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو زندگی کے باب میں دو نقطۂ نظر ایسے ہیں جو ہر زمانے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یعنی قنوطیت پسندی اور روشن نگری و رجائیت۔ اقلیمِ شعر و فکر میں اس دوسرے نقطۂ نظر کے دو نہایت پر جوش اور انقلاب آفرین علمبردار رومی اور اقبال کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دونوں زمانِ ماضی کے دقیقہ رس شاہد و ناقد، امروز کے ہوش مند ناظر اور مستقبل کے نقش گر، گویا آیندہ گرای (Futurist) ہیں۔ دونوں کی شخصیتوں میں ان تینوں زمانوں کا ایک ایسا حیران کن اجتماع ہے کہ تاریخ شعر انسانی میں اس کی مثالیں کمیاب ہیں۔ دونوں کا شعری و فکری سرمایہ اس پریشان کن فکری سوال کا جواب مہیا کرتا ہے کہ مادہ و معنی میں کس طرح اتحاد پیدا کر کے اسے ایک نامیاتی وحدت کی شکل دی جائے اور کس طرح موجود کو متغیر کر کے نوعِ انسانی کو آسودہ حال اور اس کے مستقبل کو روشن اور محفوظ بنایا جا سکے۔ کس طرح نزول کا عروج سے اور پستی کا بلندی سے رشتہ جوڑ کر آدمی کو انسان میں بدلا جا سکے اور اس کا ذاتِ حق سے مستحکم اور ناقابلِ شکست رشتہ قائم کیا جا سکے۔

اقبال کے شعری اور نثری سرمایے کو کلیۃً نگاہ میں رکھا جائے تو ان کے یہاں متعدد فارسی شعراء و ادبا اور مشرقی و مغربی فلاسفہ و ادبا سے ربطِ فکری کے شواہد ملتے ہیں لیکن ان سب میں صرف ایک شخصیت ایسی ہے جن کے ساتھ ان کا عمر بھر کا پیمانِ عشق اور اتحادِ نظر دکھائی دیتا ہے اور وہ شخصیت ہے جلال الدین رومی کی۔ اپنے اردو اور فارسی کلام میں رومی کا نہایت تسلسل سے ذکر ملتا ہے۔ ان کی پہلی شعری تصنیف ''اسرارِ خودی'' (۱۹۱۲ء) سے لے کر آخری شعری مجموعہ ''ارمغانِ حجاز'' تک رومی کا تواتر سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ اپنی ''یادداشت ہائے پراگندہ'' Stray Reflections سے لے کر اپنے سات انگریزی خطبات تک ہر جگہ رومی کا ذکر ہے اور نہایت والہانہ پن سے ان کی فکر سے خود کو وابستہ کر کے اپنے عہد کے آشوب پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ ''اسرارِ خودی'' جو اقبال کے تصورِ خودی کی بہترین اور مربوط ترین مظہر ہے، نہ صرف تمہیدی اشعار میں رومی سے اقبال کے والہانہ عشق کی دلیل فراہم کرتی ہے بلکہ ''اسرارِ خودی'' کے آغاز سے بھی پہلے رومی کے جن اشعار کو سرِ متن بنایا گیا ہے، وہ نہ صرف رومی کے تصورِ حیات کے بہترین نمائندہ ہیں بلکہ اقبال کے تصورِ زیست اور رومی سے ان کی والہانہ وابستگی کی بھی زندہ برہان کہے جا سکتے ہیں:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام[1] و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہان سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم[2] کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اور پھر ''اسرار'' کے تمہیدی اشعار میں رومی کے اچانک ظہور اور ان کی اس ترغیب کا، کہ ''جرعہ گیر از شراب ناب عشق'' (کلیات اقبال، ص۹) اور ''از قُمِ خود زندہ تر کن زندہ را'' جس سپردگی اور بے کنار عقیدت سے ذکر کیا گیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تنہا رومی ہی مشرقی فکریات کے ایک ایسے نمایندہ شاعر تھے جنھیں اقبال اپنا پیرومرشد، اپنا خضر، اپنا استاد معنوی قرار دے سکتے تھے۔ ذرا غور فرمایئے کہ اقبال نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''اسرار خودی'' میں انھیں ''پیر روم'' (ص ۸)، ''اخوند روم'' (ص ۹۹)، پیام مشرق میں ''مرشد رومی''، ''حکیم پاکزاد'' (ص ۱۹۰)، ''پیر یزدانی'' اور ''پیر عجم''، جاوید نامہ میں ''حضرت رومی''، ''دانائے راز''، ''رومی آن، عشق و محبت را دلیل''، ''مرشد اہل نظر'' اور مثنوی ''پس چہ باید کرد'' میں ''حضرت جلال الدین رومی'' کہا ہے اور اپنے اردو شعری مجموعوں میں انھیں کثرت سے حوالہ بنایا اور ان کے اشعار اور افکار کے ذریعے اپنے تصور حیات و کائنات کی توضیح کی ہے۔ اردو مجموعوں میں بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز پر مجموعے میں کہیں نہ کہیں رومی کا ذکر آیا ہے یا ان کے اشعار کی تضمین کی گئی ہے۔ یوں لگتا ہے گویا علوِ فکری اور شعری کمالات کی حامل اس شخصیت نے اقبال کے پورے وجود میں رس بس کر ان کی کامل شخصیت کا احاطہ کر رکھا ہے درآنحالیکہ دونوں کے درمیان قریباً سات صدیوں کا زمانی بُعد حائل ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ علوِ فکر و تخیل زائیدہ زمان نہیں، ابوالوقت ہوتا ہے اور ''بعد منزل نبود در سفرِ روحانی''!

اقبال اور رومی کے یہاں محض اسلوب شعری ہی میں نہیں، موضوعات شعری میں بھی کمال مشابہت نظر آتی ہے۔ دونوں کے تصور انسان، تصور حیات اور تصور عشق نیز ان تصورات کے تحت ذیلی تصورات میں حیرت انگیز مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ تاہم یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ اقبال و رومی میں مرید و مراد کے باہمی عقیدتی و احترامی رشتے کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ اقبال نے رومی میں اپنی شخصیت کو گم کر دیا ہو۔ رومی سے اقبال کی فیضان اندوزی کسی اندھے بہرے مقلد کی نہیں، بلکہ ایک وسیع النظر اور کمال تربیت یافتہ، پختہ فکر دانشور کی ایک دوسرے بے نظیر متکلم، عالم اور حامل حکمت و حرارت اور عرفان الٰہی کی فیض یافتہ شخصیت سے اثر پذیری ہے [۳]۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں بے مثال مفکر شاعر کہے جا سکتے ہیں اور دونوں کا انتہائی چشمہ فیض اندوزی، الہام ربانی ہے:

اگر کلام نداز آسمان فرود آید　　چرا بہر سخنی خامہ در سجود آید

سعید نفیسی نے اقبال کی اسی منفرد حیثیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ''کسی جرأت نمی کرد دوش بدوش و سر بہ سر حدیقۃ الحقیقہ و مثنویات عطار و مثنوی مولانا و گلشن راز بگذارد۔ این نابغہ پاکستانی این دلاوری را کرد و از عہدہ ہم بر آمد۔ گویا می گفت ''می گویم و می آیمش از عہدہ بر ون''۔ [۴]

رومی کے عہد پر نگاہ ڈالیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے پرآشوب اور گھٹے ہوئے ماحول میں سانس لے رہے ہیں جس پر خوف، دہشت، تقدیر کی جبریت اور بے یقینی کا آسیب مسلط ہے۔ فتنہ تاتاری نے اس زمانے کے عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چنگیزی جتھوں نے ایشیا اور مشرقی یورپ کے بعض حصوں کو تاخت و تاراج کیا اور جرمنی کی مشرقی سرحدات سے لے کر جاپان کے ساحل سمندر تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ غرض جہاں کہیں یہ گئے موت اور تباہی کی داستان رقم کرتے گئے۔ یہ

مرکزی اناطولیہ تک رسا تھے۔ رومی اسی فتنہ انگیز عہد میں سانس لے رہے تھے اور اس کے ردِعمل کے طور پر اپنے عہد کے لیے گویا ایک نیا عہدنامہ بشارت تحریر کر رہے تھے جس کے حروف کے رگ و پے میں بلند نگہی، رجائیت، حوصلے، مبارز طلبی اور نئے امکانات کا لہو رواں دواں تھا۔ شاید اسی لیے محمد اسلامی ندوشن نے رومی کی مثنوی معنوی کو بعد از اسلام کا ایک حماسہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''اگر آں را حماسہ خوانیم برای آن است کہ حماسہ کلیت روح و پویش یک ملت را در راہ تثبیت خود بکار می اندازد۔ یعنی نوعی مبارزہ است با زمانہ، با جوانب نا مساعد زندگی، چہ دشمن خارجی باشد و چہ دشمنش داخلی کہ ناظر بہ درونِ خود انسان است''۔[۵]

اقبال نے جس عہد میں آنکھ کھولی وہ عہد بھی بدقسمتی سے مسلم ملّت کا عہد زوال تھا اور مسلمانوں کے لیے گویا ایک فتنۂ کبریٰ۔ یہاں بھی منفی تصورات حیات نے صحت مند زاویہ نگاہ کی جگہ لے لی تھی۔ مسلم دنیا کے بڑے حصے پر مغربی استعمار کا تسلط تھا۔ اس حادثے نے بے یقینی، یاس، بے ہمتی، خود فراموشی اور نفی خودی کے تصورات کو عام کیا۔ اقبال نے رومی سے اپنا اور اپنے عہد کا تقابل کرتے ہوئے کس قدر برمحل لکھا ہے:

چو رومی در حرم دادم اذان من　　ازو آموختم اسرار جان من
بدور فتنہ عصر کہن او　　بدور فتنہ عصر روان من[۶]

رومی اور اقبال دونوں نے اپنے اپنے عہد کے انسان کو حوصلہ مندی، احساس عظمت اور مبارزہ طلبی کا سبق دیا۔ یہ سبق آج بھی آفاقی نوعیت و اہمیت کا حامل ہے۔ رومی نے انسان کی عظمت اور اس کے باطن میں موجود امکانات کا ذکر بڑے جوش و جذبہ کے ساتھ اپنی مثنوی اور اپنے ملفوظات ''فیہ ما فیہ'' میں کیا ہے:

''آدمی عجیب چیز است۔ در وی ہمہ چیز مکتوب است۔ حجب و ظلمات نمی گذارد کہ او آن علم را در خود بخواند ..... باین ہمہ کہ در ظلمات است و محجوب پردہ ہاست، ہم چیزی می خواند و از آن واقف است۔ بنگر کہ چون این ظلمات و حجب برخیزد چسان واقف گردد و از خود چہ علم ہا پیدا کند''۔[۷]

انہی ملفوظات میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: ''پس از آدمی آن کار می آید کہ ندا از آسمان ہا می آید و ندا از زمین ہا می آید و ندا از کوہ ہا''۔[۸]

رومی کے نزدیک انسان شمشیر ہندی کی طرح قیمتی ہے۔ یہ تلوار گوشت کاٹنے کے لیے نہیں۔ انسان کی حیثیت دیگ زرین کی ہے اور دیگِ زریں شلغم پکانے کے لیے نہیں ہوتی۔ پھر انسان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

''حق تعالیٰ تو را قیمت عظیم کردہ است۔ می فرماید کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ.

تو بہ قیمت ورای دو جہانی　　چہ کنم قدر خود نمی دانی"[۹]

یہی بات سعدی نے اپنے انداز میں کہی تھی۔

قیمتِ خویش را خسیس مکن　　کہ تو در اصل گوہرِ نابی

رومی اس امر پر تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ انسان نے باوصف عظمت، اپنی قدر و قیمت نہیں پہچانی:

خویشتن نشناخت مسکین آدمی　　از فزونی آمد و شد در کمی
خویشتن را آدمی ارزاں فروخت　　بود اطلس خویش بر دلقی بدوخت[۱۰]

ظاہرش را پیشۂ آرد بچرخ　　باطنش آمد محیط ہفت چرخ[۱۱]

اور پھر اس کو اس کی عظمت کا احساس دلا کر کس اعتماد سے فرماتے ہیں:

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند　　فرشتہ صید و ہنر شکار و یزداں گیر

اقبال کے کلام میں بھی عظمت انسانی، قوتِ تسخیر اور انسان کے باطن میں چھپے ہوئے لاتعداد امکانات کا ذکر نو بہ نو پیرایوں میں ان کے تمام کلام میں پھیلا نظر آتا ہے۔ مثلاً:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدی　　یزداں بہ کمند آور ای ہمت مردانہ[۱۲]

میتواں جبریل را انگشتک دست آموز کرد　　شہپرش با موی آتش دیدہ بستن می تواں[۱۳]

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے[۱۴]

یا مثلاً:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگری پیدا شد　　حسن لرزید کہ صاحب نظری پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور　　خود گری، خود شکنی، خود نگری پیدا شد
خبری رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل　　حذر اے پردگیاں، پردہ دری پیدا شد
آرزو بی خبر از خویش بہ آغوشِ حیات　　چشم وا کرد و جہان دگری پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک طپیدم ہمہ عمر　　تا ازیں گنبد دیرینہ دری پیدا شد[۱۵]

یا مثلاً:

فروغ خاکیان از نوریان افزوں شود روزی
زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزی

خیالِ او کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد
ز گرداب سپہر نیلگوں بیروں شود روزی
یکی در معنیِ آدم نگر از من چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزی
چنان موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونی
کہ یزداں را دل از تاثیر او پر خون شود روزی [۱۶]

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے تصورِ خودی کے پسِ پشت زیادہ تر رومی کا اور کسی قدر بیدل کا حرکی تصورِ حیات کارفرما ہے۔ یہاں بیدل سے تو بحث نہیں، البتہ اس باب میں رومی کے بعض اشعار درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔ بال جبریل کی مشہور طویل نظم ''پیر و مرید'' اقبال کے استفسارات اور رومی کے جوابات پر مشتمل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم رومی کے تصورِ علم، تصورِ تہذیب، تصورِ انسان، قوموں کے عروج و زوال اور تصورِ جبر و قدر وغیرہ کی اجمالی مگر بڑی عمیق سطح پر وضاحت کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اقبال کے تخلیقی شاہکار جاوید نامے میں رومی کی رہنمائی میں سفرِ عروجی و افلاکی کے دوران انسان، خدا اور کائنات اور حیات و ممات کے امور پر جس قدر چشم کشا حقائق ملتے ہیں اور عقبیٰ کے دوش بدوش دنیا کو معنوی طور پر قابلِ رشک مقام بنانے کے ضمن میں جن فکر انگیز نکات کی جانب اشارے ملتے ہیں، یہ سب حد درجہ قابلِ توجہ ہیں۔ یہاں پہلے اقبال کے استفسارات کے ضمن میں رومی کے دیے گئے جوابات درج کیے جاتے ہیں جن سے رومی کی وسعتِ نظر اور عارفانہ بصیرت کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور مذکورہ تصورات کی وضاحت بھی:

دست ہر نا اہل بیمارت کند　　سوی ما درآ کہ تیمارت کند [۱۷]

بندۂ یک مرد روشن دل شوی　　بہ کہ بر فرقِ سرِ شاہانِ روی [۱۸]

بال بازان را سوی سلطان برد　　بال زاغان را بگورستاں برد [۱۹]

بندہ باش و بر زمین رو چون سمند　　چون جنازہ نی کہ بر گردن برند [۲۰]

آن کہ بر افلاک رفتارش بود　　بر زمین رفتن چہ دشوارش بود [۲۱]

علم را بر تن زنی ماری بود　　علم را بر دل زنی یاری بود [۲۲]

مرغ پرہا رستہ چون پراں شود　　طعمۂ ہر گربہ و زاں شود [۲۳]

کار مرداں روشنی و گرمی است　　کار دوناں حیلہ و بی شرمی است [۲۴]

اور اب جاوید نامے میں اقبال کے استفسارات کے ضمن میں رومی اپنے تصورِ حیات و تصورِ خودی، تسخیرِ فطرت کے اسالیب اور معارف خلوت و جلوت، وصول الی اللہ، تصورِ معراج اور تصورِ زمان و مکان کی وضاحت کرتے ہیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ نظم ''پیر و مرید'' میں رومی کے جوابات خود ان کے اپنے اشعار کی صورت میں ہیں اور یہاں جوابات اقبال نے اپنے لفظوں میں ترتیب دیے ہیں مگر اس ایجاز اور اس قدر مہارت کے ساتھ کہ ان کی قدرتِ کلام پر رشک آتا ہے:

زندگی خود را بخویش آراستن　　بر وجودِ خود شہادت خواستن
زندہ ای یا مردہ ای یا جاں بلب　　از سہ شاہد کن شہادت را طلب
شاہدِ اول شعور خویشتن　　خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعور دیگری　　خویش را دیدن بنورِ دیگری
شاہدِ ثالث شعورِ ذات حق　　خویش را دیدن بنورِ ذات حق
بر مقام خود رسیدن زندگی است　　ذات را بی پردہ دیدن زندگی است
پیکرِ فرسودہ را دیگر تراش　　امتحان خویش کن موجود باش [۲۵]

باز گفتم پیشِ حق رفتن چسان　　کوہ و خاک و آب را کفتن چسان
گفت اگر ''سلطان'' ترا آید بدست　　می توان افلاک را از ہم شکست
نکتۂ ''الا بسلطاں'' یاد گیر　　ورنہ چون مور و ملخ در گل بمیر [۲۶]

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست　　قوتش از سختی اعصاب نیست
عشق با نانِ جوین خیبر کشاد　　عشق در اندام مہ چاکی نہاد
عشق سلطان است و برہانِ مبین　　ہر دو عالم عشق را زیرِ نگین
لازمان و دوش فردای ازو　　لا مکان و زیر و بالای ازو
عاشقی؟ از سو بہ بی سوئی خرام　　مرگ را بر خویشتن گردان حرام
اے مثال مردہ در صندوق گور　　می توان بر خاستن بی بانگ صور! [۲۷]

تو ازین نہ آسمان ترسی؟ مترس　　از فراخای جہان ترسی؟ مترس
چشم بکشا بر زمان و بر مکان　　این دو یک حال است از احوال جان
چیست جان؟ جذب و سرور و سوز و درد　　ذوقِ تسخیر سپہر گرد گرد
از شعور است این کہ گوئی نزد و دور　　چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور! [۲۸]

بے محل نہ ہوگا کہ اگر یہاں خود رومی کے کلام سے استشہاد کر کے ان کی فکریات کے مرکزی تصور یعنی عشق کی وضاحت کر دی جائے۔ رومی سے پہلے غزالی نے بھی عشق کی عظمت کو اپنی معروف کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں بیان کیا تھا اور اسے معرفت کا زائیدہ قرار دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عشق تصوف و عرفان کا ایک سدا بہار موضوع ہے اور اس پر رومی سے پہلے سنائی و عطار نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ رومی کے نزدیک عشق ''فساد از خوردن گندم'' سے بالا ہے اور اس کا تعلق الحق سے ہے۔ مثنوی کے دفتر دوم میں عشق کی توضیح کے لیے ذیل کے اشعار ملتے ہیں۔ عشق کی کیمیا گری اور معجزہ طرازی کے ان نمونوں کا اقبال پر فیضان واضح ہے:

از محبت تلخ ہا شیرین شود　　از محبت مس ہا زرین شود
از محبت دُردہا صافی شود　　از محبت دردہا شافی شود [۲۹]
از محبت مردہ زندہ می شود　　از محبت شاہ بندہ می شود [۳۰]

مثنوی کے دفتر پنجم میں بھی عشق کی یہ معجزہ کاری نظر آتی ہے:

زاہد با ترس می تازد بہ پا　　عاشقان پران تر از برق و ہوا [۳۱]

دراصل عشق ان کا کام ہے جن کے حوصلے زیادہ اور جن کی نگاہ وسیع ہوتی ہے۔ رومی نے اپنے دیوان میں بھی لکھا ہے:

در رہ معشوق ما تر سندگان را کار نیست　　جملہ شاہانند آنجا، بندگان را بار نیست [۳۲]

فراخ تر ز فلک گشت سینۂ تنگم　　لطیف تر ز قمر گشت چہرۂ زردم
شراب خانۂ عالم شد است سینۂ من　　ہزار رحمت بر سینۂ جوان مردم [۳۳]

مثنوی میں ایک اور جگہ عشق کی قوت تسخیر اور اس کی ہمیشہ بہاری کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

جسم خاک از عشق بر افلاک شد　　کوہ در رقص آمد و چالاک شد [۳۴]

باغ سبز عشق کو بی منتہا ست　　جز غم و شادی درو بس میوہ ہاست
عاشق زین ہر دو حالت برتر است　　بی بہار و بی خزان سبز و تر ست [۳۵]

کہیں کہیں تو دونوں کے یہاں اس قدر گہری مماثلت ملتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اظہار و اسلوب کا اس قدر تحیر خیز تماثل بتاتا ہے کہ اقبال نے رومی کو کس والہیت کے ساتھ اپنے وجدان کا حصہ بنا لیا تھا۔ رومی کہتے ہیں:

گم شدن در گم شدن دینِ من است　　نیستی در ہست آئینِ من است
چون بہ یک دم صد جہان واپس کنم　　بنگرم گامِ نخستین من است [۳۶]

اور اقبال کہتے ہیں:

عالَم فریاد ایمان من است　　شور حشر از پیش خیزانِ من است [۳۷]

اقبال نے رومی ہی کی طرح عشق کو زمان و مکان کی حدود سے ماورا قرار دیا ہے۔ رومی کہتے ہیں:

تو روز و شب دو مرکب دان یکی اشہب یکی ادہم
بہ اشہب بہ نمی شینم، سرِ ادہم نمی دارم
جز این منہاجِ روز و شب بود عشاق را مذہب
کہ من مسلک بہ زیرِ این کہن طارم نمی دارم [۳۸]

اور اقبال کہتے ہیں:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں [۳۹]

نہ صرف یہ کہ اقبال رومی کے تصورِ عشق سے متاثر ہیں بلکہ دونوں کے یہاں تصوف کے بارے میں بھی مماثل خیالات ملتے ہیں۔ رومی کی طرح اقبال بھی عجمی تصوف کے منفی عناصر کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں اور اس ضمن میں ان کے یہاں بڑا شدید رویہ پایا جاتا ہے۔ رومی کی طرح وہ بھی عجمی تصوف کے فنا کے تصورات پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ رومی کا موقف ہے کہ اگر فنا کے بعد بقا کی طرف پیش رفت نہ ہو تو یہ نوعِ انسانی کے لیے زیان بخش ہے۔ معروف دانشور اے ایچ کمالی نے ''فکرِ اسلامی کا ورثہ'' کے زیرِ عنوان رومی کے تصورِ عشق پر بحث کرتے ہوئے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ رومی کے لیے عشق اخلاقی طرزِ عمل کے ایک اصول کا درجہ رکھتا تھا۔ عرفان کے ایک اصول کی حیثیت سے اس کا انجام سمندر کی وسعتوں میں گم ہو جانے کے سوا کچھ نہیں۔ رومی نے تجربۂ محبت کے علمیاتی معانی کا ادراک کیا۔ رومی کے نزدیک محبت کا تجربہ سالک کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے اور وہ اپنے اندر مطلوب و محبوب کی صفات پیدا کر لیتا ہے۔ اگر تمہیں آگ کی ماہیت جاننا ہے تو آگ بن جاؤ [۴۰]۔ اس ضمن میں رومی کے ذیل کے اشعار قابلِ توجہ ہیں جن میں لوہے کو آگ کی بھٹی سے آگ بنتے دکھایا گیا ہے مگر جہاں لوہا آگ کے رنگ میں رنگ کر بھی اپنی اصل حقیقت کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ ایک لطیف انداز ہے تصورِ فنا کی تردید کا۔

رنگ آہن، محوِ رنگ آتش است — زآتشی می لافد و آتش وش است
شد ز رنگ و طبع آتش محتشم — گوید او من آتشم من آتشم [۴۱]

تصوف و عرفان میں ایک مبحث صورت و معنی کا بھی ہے۔ بعض صوفیہ کے نزدیک شریعت ابتدا ہے اور طریقت انتہا۔ اس طرح کے مباحث شریعت پر طریقت کو ترجیح دے کر شریعت کی بیخ کنی کا سبب بنتے ہیں۔ بعض کے نزدیک شریعت چھلکا ہے اور طریقت مغز۔ رومی نے اس باب میں بڑے لطیف انداز میں اس طرزِ فکر کی تردید کی ہے۔ کہتے ہیں:

''ہمچنانک کار، بی مغز بر نمی آید، بی پوست نیز بر نمی آید۔ چنانک دانہ را اگر بی پوست در زمین کاری بر نیاید، چون با پوست در زمین دفن کنی بر آید و درختی شود عظیم۔ پس ازین روتن نیز اصلی عظیم باشد''۔ [۴۲]

اسی طرزِ استدلال کو بغیر کنائے کے کھلے اور واضح انداز میں اقبال نے اپنی متعدد شعری اور نثری تحریروں میں واضح کیا ہے۔ خان نیاز الدین کے نام سنہ ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''صوفی ہا می گویند شریعت ظاہر است و طریقت باطن ولی در این عصر و زمانِ پر آشوب و ہیجان ظاہری کہ

باطنش تصوف باشد در معرض خطر است۔ اگر ظاہر پا بر جا نماند، باطن چطور می تواند استقامت داشتہ باشد''۔ [۴۳]

فکری رومی سے اقبال کی تاثیر پذیری کا ایک ثبوت رومی کے متعدد اشعار کی تضمینات اور رومی کی زمینوں میں کہی گئی غزلیں ہیں۔ یہ موضوع فی نفسہ ایک طویل مقالے کا متقاضی ہے لہٰذا یہاں اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے نیز رومی کی شاعری میں باز کی علامت (تفصیل کے لیے دیکھیے دفتر دوم) اور اقبال کی شاعری میں شاہین کی علامت میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے مگر تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

نہ صرف شاعری میں بلکہ اقبال نے اپنے اہم ترین نثری کارنامے ''جدید تشکیل الہیات اسلامیہ'' میں بھی کئی جگہ رومی کا ذکر کمال شیفتگی سے کیا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے تیسرے، چوتھے اور ساتویں خطبے دیکھے جا سکتے ہیں۔ چوتھے خطبے میں اقبال نے عصر جدید کے آشوب و بحران کے حل کے لیے ایک رومی کی ضرورت محسوس کی ہے۔ کہتے ہیں:

> The world of today needs a Rumi to create an attitude of life and to kindle the fire of enthusiasm for life.[۴۴]

بال جبریل میں بھی تو ایک موقع پر ایسی ہی بات کہی تھی:

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں [۴۵]

کیا یورپ اور خصوصاً امریکہ میں رومی کی روز افزوں اور حیرت انگیز مقبولیت کا سبب یہی تو نہیں کہ روحانی طور پر بنجر اور باطنی سطح پر کھوکھلی تہذیب کے فرزندوں کو رومی کی صورت میں ایک ایسا نجات دہندہ دکھائی دیا ہے جو ان کے اندر کی تشنگی کو بجھانے کا سر و سامان کر سکتا ہے اور ان کے باطن میں آتش شوق کی چنگاری روشن کر سکتا ہے کہ یہی کام روشن ضمیر لوگ تہذیبوں کے بجھتے چراغوں کو سہارا دینے کے لیے ہر دور میں کرتے رہے ہیں۔

حواشی

۱۔ دیوان شمس تبریز، مرتبہ فروزانفر ۱۳۸۰ھ۔ش میں ''دام'' کے بجائے ''دیو'' ہے۔ ص ۱۳۴

۲۔ ایضاً، ''گفتم'' کے بجائے ''گفتند'' ص ۱۳۶

۳۔ خود اقبال کو بھی اس امر کا بخوبی احساس تھا، اس لیے کہتے ہیں:

شرار جستہ می گیرد از درونم　　کہ من مانند رومی گرم خونم

۴۔ اقبال و جہان فارسی بہ حوالہ ''رومی عصر'' چاپ تہران، ص الف

۵۔ از رود کی تا بہار، جلد دوم، ص ۱۴۷

۶۔ کلیات اقبال فارسی (شیخ غلام علی اینڈ سنز) لاہور، ص ۹۳۸

۷۔ فیہ مافیہ، مرتبہ فروزانفر، ۱۳۷۸ھ ش، تہران، ص ۵۰

۸۔ ایضاً، ص ۱۴

۹۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۰۔ مثنوی رومی، دفتر سوم، جلد دوم، مرتبہ نکلسن، ص ۵۷

۱۱۔ مثنوی رومی، دفتر چہارم، جلد دوم، مرتبہ نکلسن، ص ۵۰۲

۱۲۔ کلیات اقبال فارسی بحوالہ سابقہ، ص ۳۳۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۳۰

۱۴۔ کلیات اقبال اردو (شیخ غلام علی اینڈ سنز)، لاہور، ص ۱۹۳

۱۵۔ کلیات اقبال فارسی، بحوالہ سابقہ، ص ۲۵۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۰۴

۱۷۔ مثنوی، دفتر دوم، جلد اول، بحوالہ سابقہ، ص ۲۶۵

۱۸۔ مثنوی، دفتر سوم، جلد دوم، بحوالہ سابقہ، ص ۳۷

۱۹۔ مثنوی، دفتر ششم، جلد سوم، بحوالہ سابقہ، ص ۲۵۵

۲۰۔ مثنوی، دفتر ششم، جلد سوم بحوالہ سابقہ، ص ۲۸۹۔ نسخہ نکلسن میں یہ مصرح متفاوت ہے: چون جنازہ کہ ہر گردن نہند

۲۱۔ مثنوی، دفتر دوم، جلد اول، بحوالہ سابقہ، ص ۳۲۷

۲۲۔ نسخہ رمضانی، نسخہ جعفری اور نسخہ نکلسن میں دونوں مصرعے یوں ہیں:

علم را بر تن زنی باری شود علم چون بر دل زنی یاری شود (دفتر اول، جلد اول، نکلسن، ص ۲۲)

۲۳۔ نسخہ نکلسن، دفتر اول، جلد اول میں دوسرا مصرع یوں ہے لقمہ ہر گربہ دراں شود (رک ص ۳۷)

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۱

۲۵۔ کلیات اقبال فارسی (بحوالہ سابقہ) ص ۶۰۷، ۶۰۸

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۰۸

۲۷۔ ایضاً، ص ۶۱۰، ۶۱۱

۲۸۔ ایضاً، ص ۶۱۱، ۶۱۲

۲۹۔ مثنوی کے دفتر اول میں بھی عشق کی معجزہ کاری کا بیان ہے اور خاصی شرح و بسط سے مثلاً

ہر کرا جامہ ز مستی چاک شد او ز حرص و جملہ عیبی پاک شد

وغیرہ۔ خود اقبال نے بھی ایک اور موقع پر عشق کی فیض رسانی کو یوں بیان کیا:

عشق سوہان زدہ را آدم شدم عالم کیف و کم عالم شدم

۳۰۔ دفتر دوم، جلد اول، مرتبہ نکلسن، ص ۳۳۰

۳۱۔ جلد سوم، مرتبہ نکلسن، ص ۱۳۹

۳۲۔ کلیات شمس تبریزی، مرتبہ بدیع الزمان فروزانفر، ص ۱۲۱

۳۳۔ ایضاً، (چاپ انتشارات امیر کبیر)، جلد دوم، ص ۱۲۰

۳۴۔ دفتر اول، جلد اول، مرتبہ نکلسن، ص ۴

۳۵۔ دفتر اول، جلد اول، مرتبہ نکلسن، ص ۱۰۹

۳۶۔ کلیات شمس تبریزی، جلد اول، ص ۲۶۹

۳۷۔ کلیات اقبال فارسی، ص ۷

۳۸۔ کلیات شمس تبریزی یا دیوان کبیر (بتصریحات وحواشی بدیع الزمان فروزانفر)، انتشارات دانشگاہ تہران۔ جزو سوم، ص ۱۹۹

۳۹۔ کلیات اقبال اردو (بحوالہ سابقہ)، ص ۳۱۰

۴۰۔ یا رومی کے بقول: پس قیامت شو قیامت را ببین دیدن ہر چیز را شرط است این (دفتر ششم، جلد سوم مرتبہ نکلسن، ص ۳۱۶)۔
عشق کی ایسی ہی قیامت خیزی اور قوت تسخیر کو کلیات شمس تبریزی میں بھی عجیب کیفیت میں بیان کیا گیا ہے:

امروز قیامت تو برخاست برخیز و قدم بر آسمان نہ
از آتش عشق نردبان ساز بر گنبد چرخ نردبان نہ

کلیات شمس تبریزی (انتشارات امیر کبیر)، جلد دوم، ص ۴۲۱

۴۱۔ دفتر دوم، جلد اول، مرتبہ نکلسن، ص ۳۲۰

۴۲۔ فیہ ما فیہ (ملفوظات رومی) بحوالہ سابقہ، ص ۱۹

۴۳۔ اصل اردو متن تہران میں دستیاب نہ ہو پایا چنانچہ مکتوبات اقبال کے منتخب فارسی ترجمے "نامہ ہای علامہ اقبال لاہوری" (گزینش و ترجمہ محمد یونس جعفری و فریاد پالیزدار) سے حوالہ دیا گیا۔ ملاحظہ ہو جلد اول، ص ۱۴۲

۴۴۔ "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" (مرتبہ ایم سعید شیخ) ص ۹۷

۴۵۔ کلیات اقبال اردو (بحوالہ سابقہ)، ص ۳۲۰

روایتی رسم الخط کے تناظر میں

اردو کے ''باہنجار'' اِملاء کی طرف ایک قدم

حافظ صفوان محمد چوہان

اردو ایک زندہ زبان ہے۔ کسی بھی زبان کے زندہ ہونے کے دلائل میں یہ ایک محکم دلیل ہے کہ اُس زبان کے اندر الفاظ کا آنا جانا لگا رہے۔ الفاظ کی یہ آرجا رو دو طرفہ عمل ہے: جو لفظ پرانا ہو کر قابلِ استعمال نہ رہے اُس کی جگہ لینے کے لیے نئے الفاظ ملتے رہیں، اور جو دخیل الفاظ زیادہ قوت والے اور معانی کی سمائی کے اعتبار سے بڑے ظرف والے ہیں اُن کی آمد پر بوسیدگی کا شکار الفاظ از خود میدان خالی کرتے رہیں۔ فطری تبدیلیوں کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں۔ اِن تبدیلیوں کو ہشاشت سے قبول کرنا چاہیے۔ فطرت کے اصولوں کو ''نہیں'' کہنا سعیِ نامشکور ہے۔

جس طرح بچے علی العموم اپنی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہیں اور اُن کے جسم کا ہر ہر عضو فطری انداز میں نمو پاتا ہے جیسے کوئی عضو لمبا ہوتا جاتا ہے، کوئی چوڑا ہوتا رہتا ہے، کوئی حصۂ بدن ایک خاص حجم سے بڑھتا نہیں جب کہ کچھ حصے مثلاً بال اور ناخن وغیرہ اِتنی تیزی سے بڑھ رہے ہوتے ہیں کہ چند دن میں اِنھیں کاٹنا پڑتا ہے؛ زبان کی بُل بڑھ بھی بالکل اِسی طرح فطری انداز میں ہوتی ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر دانت اور پلکیں بھی بالوں کی رفتار سے بڑھتے ہوتے تو انسانی زندگی کا رہن سہن کیسا ہوتا؟ فطرت کی اِس تکوینی ترتیب (composition) کو بے چلن کرنا بڑی خرابیوں کو جنم دیتا ہے۔ مثلاً ناخنوں کو یہ حکم نہیں دیا جا سکتا کہ وہ آئندہ بڑھنا بند کر دیں۔ اور اگر کہیں ایسا حکمِ امتناعی بزور منوانے کی کوشش کی جائے گی تو سارا جسم بے نُرا ہو جائے گا۔ پاکستان کے لوگوں نے ''شاہ دولے کے چوہے'' ضرور دیکھ رکھے ہیں!

اگلی بات یہ ہے کہ جسم کا ہر حصہ فطری طور پر اُسی کام کے لیے استعمال ہوتا ہے جس پر اُس کی تشکیل ہے: آنکھیں صرف دیکھ سکتی ہیں، سن نہیں سکتیں؛ زبان صرف محاورتاً چل سکتی ہے ورنہ اِس کام کے لیے پاؤں رکھے گئے ہیں؛ وغیرہ۔ یہ سب اعضا اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں جیسے زبان جب پیاس کا ہُو کا دیتی ہے تو پاؤں سارے بدن کو جملہ اعضا سمیت ہنکا کر پانی تک لے جاتے ہیں، ہاتھ پانی کا برتن سہارتا ہے، پھر پانی برتن میں لینے کا عمل ہوتا ہے، اِس کے بعد کہیں زبان کی پانی پینے کی باری آتی ہے۔ جسم کا ہر ہر حصہ اپنی اپنی ضرورت اِسی طرح پوری کرتا ہے۔ یوں معلوم ہوا کہ ضرورتیں دو طرح کی ہیں: اوّل وہ جو اعضا مل جل کر پوری کر دیتے ہیں جیسے کھجلی بدن کے کسی بھی حصے میں ہو، ہاتھ یہ ضرورت پوری کر دیتا ہے جب کہ دوسری ضرورتیں وہ ہیں جن کے لیے کسی عضوِ بدن کو باہر (foreign) سے کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ ایسی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے سارا جسم استعمال

ہوتا ہے۔جسم کے سب اعضا کے لیے یہ سمت بند (object-oriented) نظام ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔

یہی مثال زندہ زبان کی ہے۔ جب اور جہاں کسی لفظ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، زندہ زبان کے بدن کے سارے اعضا مل کر وہ ضرورت پوری کرنے کی فکر کرتے ہیں: کہیں سے کوئی مصدر چہرہ کرائے گا اور کسی جانب سے کوئی مصمّمہ یا ترکیب، اور یوں ایک نئی ترکیب بن جائے گی یا ایک نیا لفظ وجود پذیر ہو جائے گا۔مثلاً دیکھیے کہ قیمہ بنانے والی مشین گوشت کے پارچوں کو کچو کے لگا لگا کر ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔اِس مشین کو کچوکنی کہنا بالکل بجا ہے۔جن علاقوں کی اردو میں پنجابی، سندھی، سرائیکی یا ہندکو کی آمیزش زیادہ ہے وہاں کے لوگ کچو کے لگانا کے فعل کو ٹو کے لگانا/ٹنگ لگانا/ٹکنا کہتے ہیں۔یوں اِن علاقوں میں اِس مشین کے لیے ٹو کا اور قیمہ مشین دونوں لفظ سننے کو ملتے ہیں۔ایک اور مثال لیجیے: وہ مسلمان خواتین جو ساحلِ سمندر پر غسل کے لیے جاتی ہیں اُن میں کی نسبتاً کم آزاد خیال والیوں نے bikini اور برقع کا ایک امتزاج بُرقنی کے نام سے متعارف کرایا ہے جو بے حیائی کا لباس پہننے والیوں کے مقابلے میں بڑی حد تک پردے والا لباس ہے، اور یوں اللہ کی اِن بندیوں نے ساحلِ سمندر پر ہونے والے بے ہودہ پن کو اپنے لیے ہودہ کر لیا ہے۔

ہاں! سوال یہ ہے کہ یہ لفظ بنائے گا کون؟ وضعِ الفاظ و اصطلاحات کی فطری ترتیب [۱] یہ ہے کہ زبان سے کام لینے والے کارندے کی جو ضرورت ہے وہ خود اِختراعی تردد اور تفکر سے اُسے پورا کرنے کی کوشش کرے۔اوپر درج کیے گئے الفاظ (کچوکنی، ٹو کا، قیمہ مشین اور برقنی) میں سے پہلے کو چھوڑ کر بقیہ تینوں الفاظ عوامی اِختراعات ہیں۔یعنی جن لوگوں کو ضرورت پڑی، اُنھوں نے اپنی ضرورت اور ماحول کے مطابق اپنے حسبِ حال لفظ یا ترکیب بنالی۔اِس فہرست کا پہلا لفظ، کچوکنی، البتہ ایک سوچا سمجھا، با قاعدہ لفظ ہے۔

اصل مسئلہ اِس اِختراع کیے گئے لفظ کے عوام میں چلنے کا ہے۔اب یہاں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا زبان اِس لفظ/اصطلاح کے مصداق کو از خود پورا کر رہی ہے یا اِس ضرورت کے پورا کرنے میں اُسے باہر کے الفاظ کی ضرورت ہے۔کچوکنی کے لیے انگریزی کا لفظ grinder زبانوں پر عام طور سے سنا جاتا ہے۔''ہر زبان کے الفاظ پر قانونِ بقائے اَنفع کا اِطلاق ہوتا ہے؛ اگر نئے الفاظ میں قبولِ عام اور ٹھہر جانے والی خوبیاں ہوئیں تو فبہا، اور اگر یہ نحیف و نژند ہوئے تو بہتر الفاظ جلد اِن کی جگہ لے لیں گے۔''[۲] سخن کوتاہ، وقت کا خود کار تعامل جلد اِس کا فیصلہ کر دے گا کہ کچوکنی کا لفظ grinder کو بے جا کرتا ہے یا اردو ایک اور لفظ کو گھر داماد لیتی ہے!

زبان میں .....''صرف وہی تبدیلیاں ٹھہر سکیں گی جن کا کوئی جواز ہوگا، لہٰذا اِن سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''[۳] زندہ زبانوں کا ذخیرۂ الفاظ کوئی عجائب گھر یا ہتھیار گھر نہیں ہوتا بلکہ یہ ''لائیو سٹاک'' ہوتا ہے۔الفاظ و تراکیب مرتے بھی ہیں، اُگتے بھی ہیں، درآمد بھی کیے جاتے ہیں۔اور یہ سب کچھ بالکل فطری ہے کیوں کہ.....''زبان نہ مٹائی جاتی ہے نہ بنائی جاتی ہے، وہ خود فطرت کے اصولوں پر جیتی اور مرتی ہے۔''[۴] اگر زبان کا کوئی لفظ زن صفت ہے اور اُسے بہتر لفظ سے عمداً بدلا نہیں جاتا تو اُس سے بہت جلد ہمک آنے لگتی ہے۔یوں نئے نئے الفاظ و تراکیب کی ہلواہی نہ صرف زبان کے اپنے وجود کے لیے ضروری ہے بلکہ

مادّی ترقی کی دوڑ میں اپنی ہم نورد دوسری زندہ زبانوں سے صحت مندانہ مقابلے کے لیے ضروری بھی۔

لیکن دوسری زبانوں کے الفاظ و تراکیب کو اپنی زبان کے اندر لانے کے لیے دروازے ہی استعمال کرنے چاہییں نہ کہ اپنی دیوار ہی کو ڈھا دینا چاہیے۔ سید سبط علی صبا کا شعر کیا برمحل یاد آیا کہ:

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

دوسری زبان کا کوئی لفظ اگر اِس حالت میں قبول کیا جائے کہ اُس کا ہم ہست ہمارا اپنا لفظ جو زبانوں پر جاری بھی ہو اور سننے میں آتا رہتا ہو، اپنی زبان کو ہلکانے والی بات ہے جیسے مثلاً ریڈیو پروگراموں میں میزبان کا ''سامعین'' کے بجائے ''لسنرز'' کہنا۔ زبان کے اچھے بھلے الفاظ کو ڈنڈا ڈولی کر کے باہر نکالنے کا یہ رویہ جو کھلا کھلا اپنی زبان و ثقافت کی ہتک کا آئینہ دار ہے، بہت خطرناک ہے۔ اپنا اپنا ہی ہوتا ہے، پرایا پرایا۔ ہر چند جامہ تنگ است، جزو بدن نہ کردد۔ اور جن کم سواد لوگوں کو دوسری زبانوں کے الفاظ خوامخواہ استعمال کرنے کا ہُو کا لگ جاتا ہے، زبان اپنی فطرتی غیرت کی وجہ سے اُن پر اپنے گُن کھولتی بھی نہیں۔ یہ نادان جانتے ہی نہیں ہیں کہ اردو کی ہمہ گیری اور ہنگامہ گیری کی کیا نوعیت ہے اور اِس نے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کی کل کائنات پر کیسا ہاتھ پھیرا ہے۔[۵] بلکہ دنیا بھر کی زبانوں پر اردو کی ہتھ پھیری اب تو ضرب المثل بن گئی ہے: urdish اور hinglish کی جوتا نیں لگائی جا رہی ہیں یہ بے وقت کی راگنی نہیں ہے، ہونی ہو کے ملتی ہے۔[۶]

جہاں تک استعمال کا تعلق ہے، اردو بلاشبہ ایک ہرکارہ زبان ہے: دنیا کی ایک ارب سے زیادہ آبادی میں روزمرہ کی خرید و فروخت کی گفتگو، کاؤنٹروں کی گفتگو، کھیت کھلیان والوں کی بات چیت، دفاتر اور کارخانوں میں کام کرنے والے ملازمین کی گفتگو، ابتدائی اور ثانوی درجوں کے تعلیمی اداروں میں کی گفتگو، وغیرہ، یعنی کوئی جگہ بھی اِس کے بھرپور، زندہ استعمال سے خالی نہیں۔ ہر چہار طرف میں لوگ اپنی ضرورت کے مطابق زبان میں نئے الفاظ داخل کرتے رہتے ہیں۔ یوں اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف ہر علاقائی زبان بلکہ بڑی عالمی زبانوں کے زوردار الفاظ کی مختلف سطحیں، ہر رنگ کے محاورے اور روزمرے، غرض ہمہ نعمت اب اردو میں موجود ہے۔ اِن معنوں میں اردو کی ہرجائی ظاہر و باہر ہے۔ دوسرے زاویے سے دیکھیں تو اردو اچھے الفاظ و تراکیب اور محاورات وغیرہ کو گود لینے کے لیے ہر بڑی زبان کے دروازے پر کھڑی ملتی ہے۔ یوں اگر اردو کے لیے ہر بابی زبان کی اصطلاح استعمال کی جائے تو بہت مناسب ہے۔

تکنیکی اور قواعدی اعتبار سے بھی اردو اپنی بنت میں بے مثال زبان ہے۔ ''یہ مقامی زبانوں کی ہم رشتہ ہے اور اِس کی ترکیبِ نحوی ایسی نادر ہے کہ ہر زبان کا لفظ اِس میں کھپ جاتا ہے، اور بخلاف انگریزی کے، اِن سب زبانوں میں علی العموم جملے کی ترکیب ایک طرح کی ہے: لفظ کی جگہ لفظ رکھ دیجیے، جملہ تیار ہے۔''[۷] یہی صورتِ حال رسم الخط کی بھی ہے۔ ''اردو کا رسم الخط اپنی دیدہ زیبی، تکنیک اور مجرد حروف کے دائروں وغیرہ کو چھوڑ کر صرف جزو لازم سے کام لے کر حروف کو باہم ملانے کے اُعجوبہ طریقے کی

برکت سے بیک وقت کئی الفاظ کے حیطۂ نظر میں آسکنے کے سبب سے، ایک مثالی رسم الخط ہے۔'' [۸] بالفاظِ دیگر، اردو کا رسم الخط فطری طور پر مختصر نویسی ہے۔

ایک جملۂ معترضہ کہہ کر آگے چلتے ہیں۔ اِس بات میں دورائی نہیں ہے کہ اردو کے لیے عربی رسم الخط کا وہی درجہ ہے جو راگ داری میں وادی سُر کا۔ مجھے دعوٰی نہیں لیکن میری دانست میں دنیا بھر کی تمام زبانوں میں صرف اردو ہی ایسی زبان ہے جو آج کے مشینی دور کی ضروریات کو ''ہاں'' کہتے ہوئے سب سے زیادہ رسوم الخط میں باقاعدہ لکھی جارہی ہے۔ [۹] وقتی ضرورت کے تحت ایک زبان کے لیے ایک سے زائد رسم الخط استعمال کیے جانا کوئی عیب نہیں بلکہ بڑی خوبی ہے، جسے تسلیم کیا جانا چاہیے۔ جملۂ معترضہ ختم ہوا۔ اب موضوع کی جانب آیئے۔

اردو کے اِملاء کے بارے میں یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ ہر طرف ہڑبونگ کا راج ہے اور ہنکار مچی ہے۔ جہاں زبان کے علم اور قواعد سے سرسری آشنائی بھی نہ ہونے کے سبب اچھے بھلے الفاظ کا ناراست وناہنجار اِملاء عام دیکھنے کو ملتا ہے وہاں جب کوئی اللہ کا بندہ اِملاء کو ہنجار بنانے کی بات کرے تو یوں لگتا ہے کہ ویرانے میں بہار آگئی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ یاوہ سرائی کے بجائے اردو کے اِملاء کو معیاری بنانے کے لیے راست اِقدام ترجیحی بنیادوں پر کیا جائے تاکہ بین البراعظمی فاصلوں کے سمٹنے سے جو نئی ''ہوائی دیدہ'' ثقافت وجود پذیر ہورہی ہے، زبان اُس کے لیے کارآمد رہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ سب بولنے والے لوگ آپس میں باتیں کرتے کرتے زبان کے جو بھی چیتھڑے گھڑلیں گے، وہی کل کی زبان کا سکہ ہوگا۔ اب وہی زبان باقی رہے گی جو پوری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ الیکٹرانک میڈیا اور اِنٹرنیٹ کی آمد نے مستقبل کی اردو کا مزاج طے کردیا ہے، کہ یہ آسان اردو ہوگی۔'' نئے زمانے نے اردو کے حق میں بہتر فیصلہ دیا ہے۔'' [۱۰] موبائل فون پر عربی وفارسی کے علاوہ اب اردو بھی موجود ہے اور تمام عوامل اُسی طرح کرتی ہے جیسا انگریزی یا دیگر یورپی زبانوں کے موبائل پر ہوتے ہیں۔ یوں اردو کے بارے میں بہت سی کمیوں کا ذکر لایعنی ہوگیا ہے۔

لیکن اہم ترین سوال یہ ہے کہ یہ معیاری اِملاء کن بنیادوں پر اُستوار ہونا ضروری ہے؟ اگر چہ اردو کی اُفتاد عوامی ہے لیکن اِس کی جڑیں بہرحال قدیم، زندہ زبانوں میں ہیں۔ چناں چہ ذیل میں ایک اصلِ اُصول بیان کی جاتی ہے:

کسی بھی رسم الخط میں زبان کا اِملاء کرتے وقت میں احتیاط ضروری ہے۔ اِملاء میں سراغِ معانی ہے۔ اگر اِملا خراب کردیا جائے تو اِدراکِ معانی غتربود ہوجائے گا۔ اور یہ ایسا عظیم نقصان ہے کہ جس کی تلافی شاید ہی ہوسکے۔ ایک مثال لیجیے: اردو کی روشِ تحریر میں عربی سے آیا ہوا ایک قاعدہ ہے کہ جو الفاظ ی پر ختم ہوتے ہیں اُن کے آخر میں اگر متصل کوئی ضمیر بڑھائی جائے تو ی کو ترسیم میں بشکلِ دندانہ قائم رکھا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ اِس ی کے نقوط لکھے نہیں جاتے، کہ قرات میں یہ ی پڑھی نہیں جاتی۔ مثال کے طور پر سورۂ الشمس میں ایسے چودہ الفاظ موجود ہیں۔ اِن میں سے صرف اُن الفاظ کا جو سورۂ اللیل یا سورۂ الضحیٰ میں موجود ہیں، تقابلی مطالعہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

	سورۃ الشّمس (۹۱)		سورۃ اللّیل (۹۲)		سورۃ الضحیٰ (۹۳)	
#	لفظ	حوالہ	لفظ	حوالہ	لفظ	حوالہ
۱	وَضُحٰیھا	۹۱:۱			وَالضُّحٰی	۹۳:۱
۲	جَلّٰیھا	۹۱:۳	تَجَلّٰی	۹۲:۲		
۳	یَغْشٰیھا	۹۱:۴	یَغْشٰی	۹۲:۱		
۴	تَقْوٰیھا	۹۱:۸	واتّقٰی	۹۲:۵		
۵	زَکّٰیھا	۹۱:۹	یَتَزَکّٰی	۹۲:۱۸		
۶	اَشْقٰیھا	۹۱:۱۲	اَشْقٰی	۹۲:۱۵		
۷	سُقْیٰھا	۹۱:۱۳				

سورۂ اللیل اور سورۂ الضحیٰ والے کالموں میں موجود الفاظ ی معروف پر ختم ہوتے ہیں جب کہ اُن کے مقابل سورۂ الشمس والے کالم میں وہی لفظ مزید ھا کے ساتھ تحریر ہے۔(یہ ھا واحد مونث غائب کی علامت ہے)۔ ھا سے پہلے ی کا دندانہ بنایا جاتا ہے البتہ اُس کے نیچے دو نقطے نہیں لگائے جاتے کیوں کہ تجوید میں ی کی آواز نہیں آتی۔ ترسیم یا ترقیم میں ی کو قائم رکھا جاتا ہے اگرچہ قرات میں پڑھا نہیں جاتا۔ یہ اہتمام اِس لیے کیا جاتا ہے کہ اِدراکِ معانی میں خلل در نہ آئے۔ جدول میں نمبر شمار ۴ پر غور کیجیے کہ اِس لفظ (آیت نمبر ۹۱:۸) کی اصل تقویٰ ہے، اور جب اِس کے ساتھ ضمیر ھا لگی تو اِس کے ی کی ترسیمی علامت باقی رکھی گئی ہے یعنی تَقْوٰیھا۔ اِسی طرح نمبر شمار ۷ پر غور کیجیے کہ اِس لفظ (آیت نمبر ۹۱:۱۳) کی اصل سُقْیٰی ہے؛ اب اِس لفظ کی قرات میں چوں کہ ی کی آواز بالجہر نکالنا ضروری ہے اِس لیے یہاں دندانے کے نیچے دو نقطے بھی لگے ہوئے ہیں یعنی سُقْیٰھا۔ وَقِس علیٰ ہٰذا۔

اب اگر اردو کے اِملاء کو شکل سے بے شکل کر دینے والی اِصلاحات پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ تفہیم ہوش افزا ہی نہیں، ہوش باختہ کرنے والی بھی ہے۔ چناں چہ اردو کے اِملاء کی اِس محکم بنیاد یعنی تحریر کی قرآنی روش (رسم المُصحف) پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے۔ گاندھی جی کا دادرایا دیکھیے: اُن کی نیرنگِ سیاست کے حتمی موڑ کی ابتدا ''اردو کے قرآنی حروف میں لکھے جانے'' کے اَلاپ سے ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے سنگت کر کے یہی بول اُٹھایا اور مسلمانوں کا دادرے سے دادرا بجا دیا تھا۔ چناں چہ اردو کے اِملاء کی قرآنی روشِ تحریر والی بنیاد کو اگر چھوڑا گیا تو اردو کا دادرا بھی بیٹھ جائے گا۔

ہمارے دشمن کا بچہ بچہ اِس کھلے راز کی سدھ رکھتا ہے جب کہ ہمارے سکہ بند عالی دماغوں کو تو چھوڑیے، ہمارے حساس اداروں کے لقمہ یاب بھی حالات کی سنگینی کی سُرت نہیں رکھتے۔ ہم میں کے جو حقیقت کا اِدراک رکھتے ہیں اُن تک ہماری بندگی پہنچے!

اُس کی سادہ دلی کو کیا کہیے
مسکراہٹ کو جو وفا جانے

☆☆☆

اردو میں مستعمل قواعد کی قرآنِ پاک سے لی گئی اِن اسناد کی طرف میری توجہ خواجہ غلام ربانی مجال صاحب نے

دِلائی ہے۔ یہ اعتراف مجھ پر واجب تھا سو عرض کیا۔

☆

حواشی:

۱۔ پاکستان میں اردو (مجموعۂ مقالات) جلد-۱: ''شان الحق حقی کی یاد میں'' از حافظ صفوان محمد چوہان، مقتدرۂ قومی زبان، اسلام آباد (۲۰۰۶ء): ص- ۴۱۰ .....شان الحق حقی صاحب میرے [راقم الحروف] کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے متعلق کسی اصطلاح کا اردو مترادف پوچھنے پر یہ ضرور فرماتے تھے کہ یہ مترادف مجھ سے پوچھنے کے بجائے آپ مجھے بتائیے، کہ آپ اِس میدان کے آدمی ہیں اور اِس شعبے میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کے سب سے بہتر مترادفات آپ ہی بنا سکتے ہیں۔ میں بھی بہت غور و خوض کے بعد حقی صاحب کی رائے کا حامی بنا ہوں، یعنی دفتر کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے کوئی اصطلاح جڑ دینے کے بجائے اُن لوگوں (''کرخنداروں'') کے پاس چل کر جایا جائے جو کوئی کام خود کر رہے ہوں: ایسے دو تین مجمعوں میں جا کر اُن کے کام کو دیکھتے ہوئے اُن کے زیرِ استعمال اصطلاح کو، جو اُس کام کے ''عمومی عوامی تعینیس'' کا پھل ہے، دیکھا اور جانچا جائے؛ اور پھر اگر آپ کے پاس اِس مستعمل اصطلاح کے مقابلے میں کوئی ایسا متبادل ہو جو مانوس اور بولنے میں آسان ہو تو اِسے تجویز کر دیا جائے۔ اگر اہلِ حرفہ اِسے قبول کر لیں تو بجا، ورنہ اِس کی پہلی شکل کو چلنے دیا جائے یا اِسی کو اُردو لیا جائے، اور بعد ازاں رفتہ رفتہ لغوی لیا جائے (Lexicalize)۔ وضعِ اصطلاحات کا فطری طریقہ یہی ہے۔ .....حقی صاحب کے ایک برقیاتی خط سے اقتباس کرتا ہوں کہ اُن کا نقطۂ نظر اُن کے اپنے الفاظ میں سامنے آ سکے:

.....If a language is in current use, new terms are automatically generated as the fruit of collective genius of the people, which does wonders. No Boards or academic bodies need to be set up for coinage of new terms.....

۲۔ ایضاً: ص- ۳۹۷

۳۔ ایضاً: ایضاً

۴۔ سید سلیمان ندوی: نقوشِ سلیمانی، اردو اکیڈمی، سندھ، (۱۹۶۷ء)؛ بحوالہ جاوید اختر بھٹی: اردو ہندی- ایک تاریخی جائزہ، ص ۲۷

۵۔ حوالۂ بالا: ص- ۳۹۶ .....اردو زبان اپنی بوقلمونی، برِعظیم پاک و ہند کے دور دراز علاقوں کی بولیوں اور تہذیب کے چاروں کھونٹ کے اثرات کے تحمل، عربی و فارسی جیسی اعلیٰ ادبی و ثقافتی سرمایہ رکھنے والی زبانوں کا ایک طرح سے خرمن ہی لوٹ لینے اور دورِ حاضر کی کئی شائستہ زبانوں کا جوہر اور عطر کھینچ لینے کی بے مثال اِکتسابی صلاحیت، بہترین نظام الاصوات اور اسالیبِ اظہار کی فراوانی کے سبب ایک زندہ و توانا زبان ہے جس نے سیاسی و ذہنی محکومی کے سیاہ ترین دور میں اور چار چوٹ کی مار کھانے کے باوجود نہ صرف علمی و ادبی تقاضے نبھائے بلکہ عملی زندگی کی عوامی ضروریات کو بھی پورا کیا۔

۶۔ اِس سلسلے باقاعدہ بحثیں زور پکڑ گئی تھیں اور کئی ایک اہم کتابیں بھی سامنے آئیں۔ سرِ دست دو حوالے دیکھیے: ۲۵/اپریل ۲۰۰۴ء کو لندن سے نکلنے والے مجلّے The Observer میں Anushka Asthana کا ایک بڑا مزے دار مضمون Kiss my chuddies! (Welcome to the Queen's Hinglish) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون اِنٹرنیٹ کی سائٹ http://observer.guardian.co.uk/uk_news/story/0,6903,1202721,00.html پر بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا ۱۰/مارچ ۲۰۰۲ء کو کراچی سے نکلنے والے The Dawn میں شائع ہونے والا مضمون Pinglish, Urdish or Engdu? بھی بہت اہم ہے۔ اِسے بھی اِنٹرنیٹ پر پڑھا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: http://www.dawn.com/weekly/dmag/archive/020310/dmag14.htm

۷۔ حوالۂ بالا: ص- ۳۹۳

۸۔ ایضاً: ص- ۳۹۶

۹۔ایضاً،ص۔ ۳۹۵ .....رومن اردو دراصل اُن لوگوں کی بنیادی ضرورت ہے جو مدتوں سے انگریزی بولنے والے ملکوں میں آباد ہیں اور اُن کے بچے اب اردو بول تو سکتے ہیں، پڑھ یا لکھ نہیں سکتے۔.....آج انٹرنیٹ پر اردو کے اخبارات کا رومن اردو ایڈیشن ساتھ میں نکلنا اِس بات کی شہادت ہے.....

۱۰۔جاوید اختر بھٹی: اردو ہندی-ایک تاریخی جائزہ،ص ۲۷

مآخذ/مصادِر/منابع:

الف: کتب

۱۔شان الحق حقی :لسانی مسائل و لطائف، مجموعۂ مضامین،مقتدرۂ قومی زبان،اسلام آباد(۱۹۹۶ء)

۲۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں: اردو کا المیہ،شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بھارت (مارچ ۱۹۷۳ء)

۳۔جاوید اختر بھٹی: اردو ہندی-ایک تاریخی جائزہ، دارالکتاب، لاہور(جون ۲۰۰۴ء)

۴۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری:ہندی اردو تنازع-ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد(۱۹۸۸ء)

۵۔ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان: کشاف اصطلاحاتِ لسانیات،مقتدرۂ قومی زبان، اسلام آباد(۱۹۹۵ء)

۶۔حافظ محمود خاں شیرانی: پنجاب میں اردو، (ترتیب وتدوین مع اضافات از محمد اکرام چغتائی)،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور(۲۰۰۵ء)

۷۔جابر علی سید:لسانی وعروضی مقالات،مقتدرۂ قومی زبان، اسلام آباد(۱۹۸۹ء)

۸۔عابد صدیق:تحسینیات، مجموعۂ مضامین،مغربی پاکستان اردو اکادمی، لاہور(جون ۲۰۰۵ء)

۹۔ایضاً:مغرب میں آزاد نظم اور اُس کے مباحث، مجموعۂ مضامین، اردو اکادمی، بہاول پور(۲۰۰۴ء)

۱۰۔پاکستان میں اردو (مجموعۂ مقالات)جلد-۱:''شان الحق حقی کی یاد میں'' از حافظ صفوان محمد چوہان،مقتدرۂ قومی زبان،اسلام آباد(۲۰۰۶ء)

۱۱۔محمد خسن الحق: اردو کے ضرب المثل اشعار،ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی(۲۰۰۳ء)

ب: ادبی وتحقیقی مجلّات

۱۔سہ ماہی اردو نامہ،ترقی اردو بورڈ کراچی،مختلف شمارے

۲۔سہ ماہی الزبیر، بہاول پور،مختلف شمارے

۳۔ماہنامہ اخبارِ اردو،مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد،شمارہ فروری ۲۰۰۷ء

۴۔اورینٹل کالج میگزین،جلد ۸۱، ۲۰۰۶ء

ج: اِنٹرنیٹ

1. http://dsal.uchicago.edu/cgi-bin/philologic/getobject.pl?p. xxx
2. http://www.urdustudies.com/
3. http://www.velvetillusion.com/
4. http://www.ahiida.com/index.php?a=subcats&cat=20
5. http://observer.guardian.co.uk/uk_news/story/0,6903,1202721,00.html
6. http://www.dawn.com/weekly/dmag/archive/020310/dmag14.htm

غالب کی مہریں

پروفیسر حنیف نقوی

اشیا کی قدر و قیمت کا تعین بالعموم ان کی ماہیت اور کیفیتِ ظاہری کی بنیاد پر کیا جاتا ہے لیکن بعض اوقات کوئی نسبتِ خاص کسی شے کو اس کی حیثیتِ ظاہری سے بلند تر کر کے اس مرتبہ و مقام تک پہنچا دیتی ہے جہاں اس کے دوسرے تمام اوصاف ہیچ اور بے مقدار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سربرآوردہ اور نامور شخصیات سے تعلق رکھنے والی بعض معمولی چیزیں بھی محض ان کی ذات سے نسبت کی بنا پر غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے، غالب اس معاملے میں بھی اپنے تمام ہم مشربوں میں سابق و فائق ہیں کہ ان سے وابستہ ہر شے اس نسبتِ خاص کے انکشاف کے ساتھ از خود معتبر و محترم ہو جاتی ہے۔ ان کی مختلف مہریں جن کے نقش ان کی بے شمار تحریروں پر ثبت ہیں، اس ضمن میں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ مہروں کا رواج انیسویں صدی میں اور اس سے پہلے بہت عام تھا، چنانچہ یہ بات یقینی ہے کہ غالب کے بہت سے معروف و ممتاز معاصرین اور ان سے پہلے کے لاتعداد مشاہیر شعرا اور اہلِ علم نے اپنے ناموں کی مہریں تیار کرائی ہوں گی اور مرورِ ایام کے باوجود بعض کتابوں اور تحریروں پر ان کے نقوش کی موجودگی بھی خارج از امکان نہیں، تاہم ان کی تلاش و تحقیق اور ان سے متعلق گفتگو میں اہلِ علم کی دلچسپی کا ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جیسی دلچسپی کا مظاہرہ غالب کی مہروں کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ البتہ ان کے بعض ہم نام اور ہم تخلص یا صرف ہم نام حضرات کی مہریں محض اس غلط فہمی یا شبہے کی بنا پر کہ وہ غالب سے نسبت رکھتی ہیں، ضرور معرضِ بحث میں آتی رہی ہیں۔ نسبتیں کبھی کبھی کتنی اہم ہو جاتی ہیں، یہ اس کا بین ثبوت ہے۔

تازہ ترین معلومات کے مطابق غالب نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں کم از کم آٹھ (۸) مہریں بنوائی تھیں۔ مالک رام صاحب نے مندرجہ بالا عنوان (غالب کی مہریں) ہی کے تحت اپنے ایک مضمون میں جو ان کے مجموعۂ مضامین ''فسانۂ غالب'' میں شامل ہے، ان میں سے چھ (۶) مہروں کا مفصل تعارف سپردِ قلم فرمایا ہے۔ بعد کے جن مصنفین اور توقیت نگاروں نے اپنی نگارشات میں ان مہروں کا ذکر کیا ہے، ان کا ماخذ یہی مضمون ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک ''اس مضمون کا سب سے قابلِ قدر پہلو ان مہروں کا نفسیاتی مطالعہ ہے''۔[1] خود مالک رام صاحب کے ارشاد کے مطابق ''میرزا کی یہ مہریں ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت اور عام حالت کی مادی ترجمان ہیں ..... (انھوں) نے ان میں اپنی زندگی کے اہم واقعات کو بھر دیا ہے''۔[2] پیشِ نظر سطور میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ تجزیہ جو بہ ظاہر بہت محققانہ اور عالمانہ معلوم ہوتا ہے، کس حد تک مبنی بر حقیقت ہے؟

دریافت شدہ مہروں میں سے دو قدیم ترین مہریں غالب نے ۱۲۳۱ھ (۱۶۔ ۱۸۱۵ء) میں کندہ کرائی تھیں۔ ان میں

سے ایک مہر پر خط نستعلیق میں ''اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ'' اور دوسری پر خط نسخ میں ''اسداللہ الغالب'' نقش تھا۔ مالک رام صاحب کے مطابق پہلی مہر سے غالب کی ''اس زمانے کی سرمستی و رنگینی، رندی و ہوس پیشگی بہ درجۂ اتم ظاہر ہے۔'' (ص ۸۱) جب کہ دوسری مہر ''ان کے دلی خیالات و معتقدات کی مظہر ہے۔'' (ص ۸۲) پہلے تاثر کی تائید میں منشی شیونرائن آرام اور مرزا حاتم علی مہر کے نام کے خطوط سے شطرنج کے کھیل سے دلچسپی، پتنگ بازی کے شوق اور ایک ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھنے کے واقعات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں کا عرف ''میرزا دولھا'' تھا، اسی لیے لوگ میرزا غالب کو بچپن ہی سے ''میرزا نوشہ'' کہنے لگے۔ اس عرف کی پستی ظاہر ہے اور خود میرزا کو بھی بعد کو اس ''نالائق'' عرف سے نفرت ہو گئی تھی۔ مگر اس طوفانی زمانے میں بھلا ثقاہت کہاں قریب پھٹک سکتی تھی۔ یہ باتیں شعور اور تجربے سے حاصل ہوتی ہیں اور وہ ان کی عمر اور گرد و پیش کا اقتضا نہ تھا۔'' (ص ۸۱)

دوسری مہر کے سلسلے میں محترم مضمون نگار کا ارشاد ہے:

> ''اس مہر کی بنا حضرت علی کا لقب ہے۔ چوں کہ میرزا کا نام اسداللہ تھا، اس لیے انھوں نے اس رعایت سے بہ طور سجع یہ نام کھدوا لیا اور بعد کو ان کے دوسرے تخلص کی بنا بھی یہی ہوئی۔ چوں کہ سامنے کی چیز تھی، اس لیے جب انھوں نے تخلص تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تو اسدؔ چھوڑ کر بلا تامل غالبؔ رکھ لیا.....'' (ص ۸۱)

اس کے بعد حضرت علی سے میرزا صاحب کی عقیدت اور ''شیعت سے شغف'' کو عبدالصمد سے زبانِ فارسی کی تحصیل اور ''ایران کے علوم و رسوم'' سے حصول واقفیت کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے علائیؔ کے نام ۷ جولائی ۱۸۶۲ء کے ایک خط کے حوالے سے ان کے مذہب و مسلک کی وضاحت کی ہے، جس کا لبِ لباب خود میرزا صاحب کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

> ''.....محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی .....مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے، اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں، ثم حسن، ثم حسین تا مہدی موعود علیہ السلام .....'' (ص ۸۲)

ایک ہی سال میں تیار شدہ ان دو مہروں کو دو مختلف بلکہ متضاد مزاجی کیفیات اور طبعی میلانات کی علامت قرار دے کر مالک رام صاحب نے اجتماع ضدین کی جو مثال پیش فرمائی ہے، وہ عقلاً ممکن الوقوع تو ہے لیکن عملاً بعید از قیاس نظر آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلی مہر میں نام کے ساتھ عرف کی موجودگی نہ تو عنفوان شباب کی رنگ رلیوں یا لاابالی پن کی مظہر تھی اور نہ ثقاہت کے منافی۔ جیسا کہ خود مالک رام صاحب نے فرمایا ہے، غالبؔ بچپن ہی سے ''میرزا نوشہ'' کے عرف سے معروف تھے، لیکن واقعہ صرف اتنا ہی نہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ عرف شروع سے آخرِ عمر تک ان کے نام کا جزو لاینفک بنا رہا اور یہ بات ان کے لیے کسی بھی درجے میں ناگواری کا باعث نہ تھی۔ غالبؔ کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ بنیادی نکتہ ذہن نشین رکھنا اشد ضروری ہے کہ مصلحت اندیشی ان کے مزاج کا لابدی خاصہ تھی۔ اس معاملے میں وہ اس قدر حساس واقع ہوئے تھے کہ ان سے عمداً کسی ایسے کام کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی جو خلافِ مصلحت یا مقتضائے وقت کے منافی ہو۔ عرف کا معاملہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، چنانچہ اس کے ترک و اختیار کے سلسلے میں بھی ان کی تمام تر ترجیحات بہ ظاہر وقتی ضرورت اور حالات کے تقاضوں کا ردِ عمل معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۲۳۱ھ (۱۶۔ ۱۸۱۵ء) میں اس مہر کے کندہ کرانے کے بعد انھوں نے جہاں جہاں اس عرف کو اپنے قلم سے اپنی

شناخت کا وسیلہ بنایا، ان میں سے مندرجہ ذیل تحریریں اب بھی محفوظ ہیں:

(۱) درخواست بہ نام سائمن فریزر مورخہ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء: ''اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ برادر زادۂ نصراللہ بیگ خاں جاگیردار سونک سونسا۔''[۳]

(۲) عرضی دعویٰ پنشن مورخہ ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء: ''میرا نام اسداللہ خاں ہے اور عرف میرزا نوشہ.....''[۴]

(۳) درخواست بہ نام ''سرحلقۂ افرادِ دفتر کدۂ کلکتہ'': ''اسم این فقیر اسداللہ خان است وعلم مرزا نوشہ وتخلص غالبؔ۔''[۵]

(۴) عرضی بہ نام اینڈ ریواسٹرلنگ مورخہ ۱۵/جولائی ۱۸۲۹ء: ''اسداللہ خاں عرف میرزا نوشہ برادر زادۂ کلان نصراللہ بیگ خاں۔''[۶]

(۵) عرضداشت مورخہ ۱/اگست ۱۸۲۹ء: ''اسداللہ خاں عرف میرزا نوشہ برادر زادہ نصراللہ بیگ خاں جاگیردار سونک سونسا۔''[۷]

(۶) مکتوب بہ نام رائے سداسکھ مدیر اخبار جام جہاں نما مورخہ جمعہ، ۲۵/صفر ۱۲۴۷ھ (۵/اگست ۱۸۳۱ء) ''ایں منگِ آفرینش کہ موسوم بہ اسداللہ خاں ومعروف بہ مرزا نوشہ ومتخلص بہ غالبؔ.....است۔''[۸]

(۷) دیباچۂ دیوانِ اردو مرقومہ بست وچہارم شہر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ (۱۴/اپریل ۱۸۳۳ء): ''نگارندۂ ایں نامہ..... بہ اسداللہ خاں موسوم وبہ میرزا نوشہ معروف وبہ غالبؔ متخلص است۔''[۹]

(۸) مکتوب بہ نام میر مہدی مجروح مورخہ ۸/اگست ۱۸۵۸ء: ''وہ جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہم نام کے ہاتھ جا پڑا، صاحب! قصور تمھارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو؟ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلّی میں رہتا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا، نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا، نہ اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا۔''

(۹) خودنوشت برائے تذکرۂ شعرا مرتبہ مولوی مظہرالحق مظہرؔ: مرقومہ ۱۸۶۴ء: ''اسداللہ خاں عرف میرزا نوشہ، غالبؔ تخلص۔''[۱۰]

ان تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پسند وناپسند سے قطع نظر غالبؔ کو اس اعتراف واظہار میں کوئی تأمل نہ تھا کہ وہ ''مرزا نوشہ'' کے عرف سے معروف ہیں۔ اگر وہ اسے اپنی شخصیت کا ایک لازمی جزو نہ سمجھتے اور اس سے متنفر یا بیزار ہوتے تو اس طرح بار بار اس کا ذکر ہرگز نہ کرتے۔ ان کے اعزا، احباب اور معاصرین میں بھی ایسے متعدد حضرات شامل ہیں جنھیں اس عرف کے حوالے سے ان کا ذکر کرنے میں کوئی عذر مانع نہ تھا۔ اگر اس میں ان کی ناخوشی یا بے ادبی کا شائبہ ہوتا تو ان میں سے بعض لوگ یقیناً اس سے احتراز برتتے۔ مثلاً

(۱) مولانا فضل حق خیرآبادی کے بڑے بھائی مولوی فضل عظیم نے ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۶ء میں ''افسانۂ بھرت پور'' کے نام سے فارسی میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ یہ مثنوی مرزا غالبؔ کی نظر سے گزر چکی تھی اور انھوں نے اس کی تاریخِ تصنیف بھی کہی تھی جو ان کے کلیات فارسی میں موجود ہے۔ مصنف نے اس مثنوی کے خاتمے پر یہ تاریخ نقل کرنے سے پہلے مرزا غالبؔ کی تعریف میں بائیس شعر کہہ کر شامل کتاب کیے ہیں۔ ان اشعار کا عنوان انھوں نے ''در تعریف مرزا نوشہ صاحب'' قائم کیا ہے اور ایک شعر میں بھی ان کا ذکر ان کے اسی عرف کے ساتھ کیا ہے۔ شعر حسب ذیل ہے:

زاوصاف اوہر کسے آ گہ است کہ معروف بامیرزا نوشہ است [۱۱]

(۲) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء میں تذکرہ ''گلشنِ بے خار'' تالیف کیا۔اس میں مرزا صاحب کے ترجمہ احوال کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے: ''غالب تخلص، اسم شریفش اسداللہ خاں، المشتہر بہ مرزا نوشہ.....'' [۱۲]

''گلشن بے خار'' کا مسودہ طباعت سے پہلے مرزا صاحب کی نظر سے گزر چکا تھا۔اگر نام کے ساتھ عرف کی شمولیت ان کے مزاج کے خلاف ہوتی تو وہ اس عبارت سے ''المشتہر بہ مرزا نوشہ'' کو بہ آسانی قلمزد کر سکتے تھے۔

(۳) سرسید کے برادر بزرگ سید محمد خاں بہادر نے اکتوبر ۱۸۴۱ء میں پہلی بار مرزا صاحب کا دیوان اردو اپنے لیتھو گرافک پریس سے شائع کیا تو اس کے سرورق پر ''دیوان اسداللہ خاں صاحب غالب تخلص، میرزا نوشہ صاحب مشہور کا'' لکھ کر گویا اس امر کی تصدیق کی کہ صاحب دیوان کا نام اسداللہ خاں اور تخلص غالب ہے لیکن وہ عام طور پر مرزا نوشہ کے عرف سے مشہور ہیں۔

(۴) دیوان کی اشاعت کے فوراً بعد سید محمد خاں بہادر کے لیتھوگرافک پریس ہی سے شائع ہونے والے ''سیدالاخبار'' کے ۹/شوال ۱۲۵۷ھ/ ۲۴/نومبر ۱۸۴۱ء کے شمارے میں ایک اشتہار شائع ہوا تھا جس میں شائقین کو ''پنج آہنگ'' کی اشاعت کے لیے تیاری کی خوشخبری سنائی گئی تھی۔اس کی ابتدا بھی ''مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب تخلص، مرزا نوشہ صاحب مشہور'' سے ہوئی تھی۔

(۵) منشی بال مکند بے صبر غالب کے شاگرد کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔انھوں نے اپنی اردو مثنوی ''لختِ جگر'' ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء میں نظر ثانی کے بعد بہ غرض اصلاح غالب کی خدمت میں پیش کی تھی۔اس میں انھوں نے ''در شانِ مجمع کمالاتِ صوری و معنوی حضرت استادی جناب مولانا اسداللہ خاں صاحب'' کے زیر عنوان جو اشعار کہے ہیں، ان میں ان کے نام، تخلص اور لقب (عرف) کا بیان اس طرح ہوا ہے:

نام اس کے سے کرتا ہوں میں آگاہ اول ہے اسد اور آخر اللہ
مشہور تخلص اس کا غالب مطلوب دلِ ہزار طالب
مرزا نوشہ لقب ہے اس کا ثانی کوئی اور کب ہے اس کا [۱۳]

(۶) مکتوب بہ نام حسین مرزا مورخہ ۲۹/اکتوبر ۱۸۵۹ء میں خود مرزا صاحب کا ارشاد ہے: ''کاشی ناتھ بے پروا آدمی ہے۔تم ایک خط تاکیدی اس کو بھی لکھ بھیجو۔اکثر وہ کہا کرتا ہے کہ حسین مرزا صاحب جب لکھتے ہیں مرزا نوشہ ہی لکھتے ہیں۔''

(۷) مرزا یوسف کے انتقال کے پانچ برس بعد ان کی اہلیہ لاڈو بیگم نے یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء کو ایک درخواست کے ذریعے ڈپٹی کمشنر سے یہ التجا کی کہ حکومت کی طرف سے ان کی مالی امداد کی جائے۔اس درخواست کے اندراجات کی روشنی میں ڈپٹی کمشنر نے ان کے کوائف کا جو گوشوارہ مرتب کر کے کمشنر کو بھیجا تھا، اس کا ایک اندراج یہ بھی تھا کہ ''کبھی کبھی اس کے مرحوم خاوند کا بھائی مرزا نوشہ اس کی مدد کرتا ہے۔'' [۱۴] ظاہر ہے کہ لاڈو بیگم نے اپنی درخواست میں ''مرزا نوشہ'' ہی لکھا ہوگا۔

(۸) ۱۸۶۷ء کے اواخر میں غالب نے ''قاطع القاطع'' کے مصنف مولوی امین الدین کے خلاف دہلی کی ایک عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کیا۔اس مقدمے میں ان کے وکیل مولوی عزیز الدین تھے۔انھوں نے ۱۵/دسمبر

۱۸۶۷ء کو پیش کردہ ایک درخواست کے آخر میں اپنے دستخط کے تحت خود کو ''وکیل مرزا اسداللہ خاں پنشن دار سرکاری عرف مرزا نوشہ'' اور ۲۰ رفروری ۱۸۶۸ء کی اسی سلسلے کی ایک تحریر کے خاتمے پر ''وکیل مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ'' لکھا ہے۔ [۵]

(۹) غالب کی وفات کے تیسرے دن ان کے فرزند محمد علی حسین علی خاں شاداں (پسر عارف) نے نواب کلب علی خاں کو اس حادثے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا: ''بتاریخ ۱۵ فروری سال حال مطابق ۲ رذی قعدہ روز دوشنبہ وقت ظہر جناب دادا جان صاحب قبلہ نواب اسداللہ خاں غالب عرف میرزا نوشہ صاحب نے اس جہان فانی سے رحلت کی۔'' [۶]

(۱۰) مولانا حالی نے جو غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے، ''یادگار غالب'' کا آغاز اس جملے سے کیا ہے:

> ''میرزا اسداللہ خاں غالب المعروف بہ میرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک، اسداللہ خاں بہادر، نظام جنگ، المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ، شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔'' [۷]

عرف کے متواتر استعمال اور اس کے ساتھ شہرت عام کی ان مثالوں کے پیش نظر یہ باور کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ غالب واقعتاً اس سے بیزار ہوں گے یا اسے بہ نظر حقارت دیکھتے ہوں گے۔ اس کے باوجود بھی واقعہ ہے کہ انھوں نے ایک دو بار اپنے احباب کو اس کے استعمال سے روکا بھی ہے اور اسے ''نالائق'' قرار دے کر ایک اعتبار سے اس کی مذمت بھی کی ہے، لیکن اس کی وجہ ان کی وہی مصلحت اندیشی اور احتیاط پسندی تھی جو انھیں بہ وقت ضرورت خلاف معمول فیصلے لینے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ فروری ۱۸۲۸ء میں جب وہ اپنی پنشن کا مقدمہ حکومت عالیہ کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے کلکتے پہنچے تو ایک ''نکوہیدہ سیرت'' ہم وطن (مرزا افضل بیگ) نے حکام کو ان کی طرف سے بدظن کرنے کی غرض سے یہ افواہ اڑا دی کہ اس تازہ وارد شخص نے اپنا نام بھی بدل لیا ہے اور تخلص بھی۔ گویا یہ شخص فریبی اور جعل ساز ہے۔ اسی افواہ کے زیر اثر اعیانِ دفتر کو ان کا نام بہ غرضِ ملاقات اپنے افسر اعلیٰ تک پہنچانے میں تامل تھا، کیوں کہ سرکاری کاغذات کے مطابق خاندانی پنشن ''مرزا نوشاہ'' کے نام جاری ہوئی تھی اور وہ ''مرزا نوشہ متخلص بہ اسد'' کی منزل سے آگے بڑھ کر اب ''اسداللہ خاں غالب'' کے طور پر روشناس خلق تھے۔ اس مرحلہ دشوار سے نپٹنے کے لیے مرزا صاحب نے اپنے دیوان اردو کے ایک قلمی نسخے کا سہارا لیا جسے مرتب ہوئے سات سال سے کچھ زیادہ مدت گزر چکی تھی اور اس سفر میں اتفاقاً ان کے ساتھ تھا۔ اس دیوان میں وہ غزلیں بھی شامل تھیں جن کے مقطعوں میں پرانا تخلص (اسد) موجود تھا اور وہ غزلیں بھی جن میں نیا تخلص (غالب) نظم ہوا تھا۔ مزید براں اس کے خاتمے پر ۱۲۳۱ھ کی وہ مہر بھی ثبت تھی جس کے نگینے پر ''اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ'' نقش تھا۔ غالب نے یہ دیوان ایک خط کے ساتھ ''سر حلقۂ افرادِ دفتر'' (غالباً سائمن فریزر) کی خدمت میں پیش کر دیا تا کہ وہ بہ طور خود فیصلہ کر سکیں کہ یہ افواہ کس حد تک درست ہے۔ خط میں انھوں نے لکھا تھا:

> ''آن مہر ..... بہ ابطالِ دعوی حداثتِ اسم مسکتِ مدعی است و در مسلم نہ داشتن علم برائے سکوت ایں گمنام نیز کافی است۔ آرے اسم ایں فقیر اسداللہ خان است و علم مرزا نوشہ و تخلص غالب، لیکن ازیں جا کہ غالب کلمۂ رباعی است و ظرف بعض بحور نشست آں را نیک بر نتابد، فقیر لفظ اسد را کہ مخفف اسم عاصی است و مع ہذا کلمہ ثلاثی، گاہ گاہ تخلص اختیار می کند۔'' [۸]

اس تحریر سے غالبؔ کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ اب سے بارہ سال پہلے بھی جب کہ یہ مہر تیار ہوئی تھی، وہ ''اسداللہ خاں'' کے نام سے موسوم تھے۔ لہٰذا یہ مہر مدعی کے اس دعوے کی تردید کے لیے کہ انھوں نے اپنا نام بدل لیا ہے، ایک مسکت دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیز یہ کہ ''مرزا نوشہ'' انھی کا عرف ہے اور یہ ان کا اختیار تمیزی ہے کہ وہ چاہیں تو اسے استعمال کریں اور چاہیں تو ترک کر دیں۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک وہ سرکاری خطوط اور عرض داشتوں میں اپنا نام ''اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ'' لکھتے رہے، بعد ازاں جب یہ قضیہ فیصل ہو گیا کہ ''مرزا نوشہ'' بھی وہی ہیں اور ''اسداللہ خاں'' بھی وہی تو انھوں نے اس دوعملی سے نجات پانے کے لیے آئندہ بہ نظر احتیاط صرف ''محمد اسداللہ خاں'' یا ''اسداللہ خاں'' لکھنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ قیام کلکتہ کے اسی زمانے میں ایک بار اپنے دوست رائے چھج مل کو خط لکھا تو پتے کے ذیل میں ان کے لکھے ہوئے مفصل نام کو موضوع گفتگو بنا کر یہ سوال بھی کر ڈالا کہ:

> ''بر عنوانِ مکتوب کلمۂ نواب راجز واعظم (کذا = اسم) ساختن یعنی چہ و عرف پایان اسم رقم کردن چرا؟
> سگِ دنیا را بہ اسداللّٰہی شہرت دادن چہ کم است کہ نوابی و میرزائی بر سرہم باید افزود۔''[19]

یہ بات بظاہر انکسار کے طور پر کہی گئی ہے لیکن اصل مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ نام کے ساتھ عرف نہ شامل کیا جائے تاکہ پڑھنے والے کا ذہن اس قضیہ نامرضیہ کی طرف منتقل ہی نہ ہو کہ مکتوب الیہ اب سے پہلے ''مرزا نوشہ'' کے نام سے موسوم تھا اور اب اس نے اپنا نام بدل کر ''اسداللہ خاں'' کر لیا ہے۔ اس کے بعد اگلے تیس (۳۰) برسوں میں ان کی کوئی ایسی تحریر نہیں ملتی جس میں انھوں نے اس عرف سے برئیت کا اظہار کیا ہو یا کسی کو اس کے استعمال سے روکا ہو۔ تا آنکہ یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کو انھوں نے مرزا ہرگوپال تفتہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

> ''صاحبِ مطبع (مفید خلائق، آگرہ) نے خط کے لفافے پر لکھا ہے: ''مرزا نوشہ صاحب غالبؔ''، للہ غور کرو، یہ کتابے جوڑ جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اول کتاب پر بھی نہ لکھ دیں ..... صرف اپنی نفرت عرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتے سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمے میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا، پس اگر صاحب مطبع نے ''مرزا نوشہ صاحب غالبؔ'' لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا، میری محنت رائگاں گئی، گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی۔''

اس کے تیسرے دن ان سے دوبارہ یہ استدعا کی:

> ''منشی شیونرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں، نام اور تخلص بس، اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔''

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ کتاب (دستنبو) کے سرورق پر صرف نام اور تخلص لکھنے اور عرف نہ لکھنے پر یہ اصرار فی الواقع اس مبینہ طور پر ''نالائق عرف'' سے نفرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس احتیاط اور پیش بندی پر مبنی ہے کہ سرکاری کاغذات میں درج ان کے نام کے ساتھ اس عرف کی شمولیت ''وزرا کے محکمے اور ملکۂ عالیہ کے حضور میں'' کسی غلط فہمی کا سبب نہ بن جائے اور پھر کوئی ایسی صورتِ حال پیش نہ آ جائے جیسی ایک بار کلکتے میں پیش آ چکی تھی۔ غدر کے بعد کے مخصوص حالات اور انگریز حکام کی مطلق العنانی کو مدنظر رکھا جائے تو یہ اندیشہ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ کلکتے میں انھیں ذاتی طور پر جو تجربہ ہو چکا تھا، ممکن ہے کہ اس قسم کے کچھ اور واقعات بھی ان کے علم میں ہوں۔ کم سے کم ایک واقعے کا ذکر خود ان کے ایک خط میں موجود ہے۔ یہ خط یوسف مرزا

کے نام ہے اور قیاساً ۱۸۵۹ء کے وسط میں لکھا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک لطیفہ پرسوں کا سنو: حافظ حمو بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے، صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہیں۔ مسل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا: حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ حمو کون؟ عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے، حمو حمو مشہور ہوں۔ فرمایا: یہ کچھ بات نہیں، حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ حمو بھی تم، سارا جہان بھی تم۔ جو کچھ دنیا میں ہے، وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مسل داخلِ دفتر ہوئی۔ میاں حمو اپنے گھر چلے آئے۔''

جہاں ایک معمولی سے شبہے کی بنا پر اس طرح ایک جیتا ہوا مقدمہ ہارا جا سکتا ہے، وہاں غالبؔ کا اپنے مفادات کے تحفظ میں ہر ممکن احتیاط برتنا مقتضائے حال کے عین مطابق تھا۔ وہ یہ خطرہ مول لینے کے لیے کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہو سکتے تھے کہ نام اور عرف کے چکر میں حافظ محمد بخش عرف حمو کی طرح ان کی مسل بھی داخل دفتر کر دی جائے۔ تفتہؔ کے نام اپنے محولہ بالا دونوں خطوں میں سے پہلے خط میں انھوں نے جس تشویش کا اظہار کیا ہے اور دوسرے خط میں تاکید کی جو صورت اپنائی ہے، وہ بدیہی طور پر اسی قسم کے اندیشہ ہائے دور دراز کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ واقعی اس ''نالائق عرف'' سے متنفر ہوتے تو عام حالات میں بھی اپنے نام کے ساتھ اس کے الحاق کے خلاف کبھی نہ کبھی ضرور احتجاج کرتے، لیکن اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حد یہ ہے کہ ۱۸۶۵ء میں جب اسی کتاب (دستنبو) کا دوسرا ایڈیشن ''نسخۂ صحیحۂ مرسلۂ مصنف'' کی بنیاد پر مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی سے شائع ہوا تو اس کے سرورق پر ان کا پورا نام ''نجم الدولہ، دبیر الملک، اسداللہ خان بہادر، نظام جنگ، المتخلص بہ غالبؔ عرف مرزا نوشہ'' لکھا ہوا تھا۔ نام کے ساتھ ''اجزائے خطابی'' اور ''عرف'' کے اس اندراج کو انھوں نے بعد کی کسی تحریر میں نہ تو ''نامناسب بلکہ مضر'' قرار دیا اور نہ اس پر کسی قسم کی ناگواری ظاہر کی۔

دوسری مہر کے سلسلے میں مالک رام صاحب کا ارشاد ہے کہ ''اس کی بنا حضرت علی کا لقب ہے۔ چوں کہ میرزا کا نام اسداللہ تھا، اس لیے انھوں نے اس رعایت سے بہ طور سجع یہ نام کھدوا لیا۔'' بعد میں جب انھوں نے تخلص تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تو اسی لقب کی رعایت سے اسدؔ کو چھوڑ کر غالبؔ اختیار کر لیا (ص ۸۱) غالبؔ نے ایک منقبتی قصیدے میں خود بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ تخلص کے اس انتخاب میں حضرت علی کے ''اسم و رسم'' کے اثرات شامل تھے۔ فرماتے ہیں:

اے کز نوازشِ اثرِ اسم و رسمِ تو　　نامم زمانہ غالبؔ مجبر بیاں نہاد

اس کے باوجود مالک رام صاحب کا یہ دعویٰ محتاجِ دلیل ہے کہ مرزا صاحب نے پہلے حضرت علی سے اپنی محبت و عقیدت کے اظہار کے طور پر یہ مہر کھدوائی، اس کے بعد اپنا تخلص اسدؔ سے بدل کر غالبؔ کیا۔ اس کے برخلاف مرحوم اکبر علی خاں عرشی زادہ کا یہ استدلال زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے کہ رجب ۱۲۳۱ھ (جون ۱۸۱۶ء) میں دیوان کے اولیں دستیاب نسخے کی ترتیب کے وقت تک مرزا صاحب اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ بعد میں اسی سال کی کسی تاریخ کو انھوں نے غالبؔ تخلص اختیار کیا تو یہ نئی مہر تخلص مہر کندہ کرائی۔ [۲۰]

اگر اس مہر کی وساطت سے صرف ''دلی خیالات و معتقدات'' کا اظہار مقصود ہوتا تو یہ کام اس سے قبل بھی کیا جا سکتا تھا

کیوں کہ غالبؔ ۱۲۳۱ھ سے پہلے بارہا اس امر کا اعتراف و اعلان کر چکے تھے کہ:

امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی　　علی، ولی، اسداللہ، جانشینِ نبی ہے

ان حالات میں ایک ہی سال کے اندر دو مہروں کی تیاری کی اس کے علاوہ اور کوئی معقول توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ مرزا صاحب نے اسی سال اپنا تخلص تبدیل کیا ہوگا اور اس تبدیلی کی علامت کے طور پر بہ صورت سجع یہ دوسری مہر کندہ کرائی ہوگی۔ لیکن مالک رام صاحب کے نزدیک یہ استدلال قابلِ قبول نہیں، چنانچہ ''گلِ رعنا'' کے مقدمے میں انھوں نے اس مسئلے کو ایک بار پھر اٹھایا ہے۔ عرشی زادہ کا نام لیے بغیر تحریر فرماتے ہیں:

> ''بعض لوگوں نے استدلال کیا کہ ''اسداللہ الغالب'' مہر سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سال (۱۲۳۱ھ میں) غالبؔ تخلص اختیار کیا، حال آں کہ نہ ان کا نام ''اسداللہ'' تھا نہ تخلص ''الغالب''۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس مہر میں لفظ ''غالب'' بہ طور تخلص استعمال ہی نہیں ہوا بلکہ یہ مہر انھوں نے بطور سجع تیار کرائی تھی۔ دراصل ''اسداللہ الغالب'' لقب ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا۔ چوں کہ میرزا کا نام ''اسداللہ خاں'' تھا اور وہ عقیدے کے لحاظ سے شیعی تھے، اس لیے انھوں نے یہ سجع والی مہر بنوا کر گویا حضرت علی سے اپنی عقیدت کا اعلان بھی کر دیا۔ غرض اس مہر سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۲۳۱ھ میں انھوں نے غالبؔ تخلص اختیار کر لیا تھا۔ البتہ یہ درست ہے کہ بعد کو انھوں نے اسدؔ تخلص سے بیزار ہو کر نیا تخلص رکھنے کا فیصلہ کیا تو اسی سجع نے ان کی مشکل حل کر دی اور انھوں نے یہ سامنے کا لفظ بہ طور تخلص اختیار کر لیا۔''[۲۱]

اپنی بات پر بے جا اصرار کا رویہ بعض اوقات بدیہیات سے بھی چشم پوشی پر مجبور کر دیتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس بیان کی بھی ہے۔ سجع کی خوبی یہ خیال کی جاتی ہے کہ اس میں صاحبِ سجع کا نام بھی آ جائے اور کلمۂ سجع کی معنویت بھی اپنی جگہ برقرار رہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ حشو و زوائد سے یکسر پاک ہو۔ غالبؔ نے اپنے شاگرد حکیم سید احمد حسن قنا مودودی کی فرمائش پر ان کے نام کے دو سجع کہے تھے۔ یہ سجع بھیجتے ہوئے انھوں نے خط میں لکھا تھا:

> ''بہارِ گلستانِ احمد حسن، یہ سجع کیا برا ہے؟ دلِ حیدر و جانِ احمد حسن، یہ اس سے بھی بہتر ہے۔ انھی دونوں میں سے ایک سجع مہر پر کھدوا لیجیے۔''[۲۲]

ان دونوں سجعوں میں ایک لفظ بھی زائد از ضرورت نہیں۔ ''اسداللہ الغالب'' کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اگر اس وقت مرزا صاحب کا تخلص غالبؔ نہ ہوتا تو یہ سجع کوئی معنی ہی نہ رکھتا، اور اگر اس مہر میں ''اسداللہ'' کے ساتھ ''الغالب'' کی بجائے صرف ''غالب'' کندہ کیا گیا ہوتا تو یہ سجع نہ ہوتا، صرف نام ہوتا۔ رہ گیا یہ سوال کہ غالبؔ کا اصل نام ''اسداللہ'' نہیں ''اسداللہ خاں'' تھا تو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ میر، میرزا، سید، شیخ، خاں، بیگ، مودودی اور چشتی جیسے سابقے اور لاحقے کسی نام کے اجزائے اصلی نہیں، اجزائے اضافی ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں الفاظ کے اس مخصوص تانے بانے سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتے جس سے سجع کی تشکیل ہوتی ہے، اس لیے سجع کہتے وقت انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ غالبؔ نے بھی سید احمد حسن کے نام کے مذکورہ بالا دونوں سجعوں میں ''سید'' کے سابقے سے صرفِ نظر کر کے صرف ''احمد حسن'' نظم کیا۔ قطعِ نظر اس سے اگر مالک رام صاحب کے نزدیک غالبؔ کا اصل نام ''اسداللہ خاں'' اور صرف ''اسداللہ خاں'' تھا تو چند سال کے بعد ''محمد اسداللہ خاں'' کے نام سے ایک

تازہ مہر کندہ کرانے کا کیا جواز باقی رہتا ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ غالبؔ کا اصل نام صرف ''اسداللہ'' تھا، باقی تمام سابقے اور لاحقے فروعی یا اضافی حیثیت رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی بے شمار تحریروں میں نظم میں بھی اور نثر میں بھی، اپنا نام صرف ''اسداللہ'' لکھا ہے۔ نظم کے چند نمونے حسب ذیل ہیں:

جنس بازار معاصی، اسداللہ اسدؔ — کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

غالبؔ نام آورم، نام و نشانم مپرس — ہم اسداللّٰہم و ہم اسداللّٰہیم

منصورِ فرقۂ علی اللّٰہیاں منم — آوازۂ انا اسداللہ در اقلیم

فیضِ دمِ انا اسداللہ بر آوردم — منصورِ لا ابالی بے دار و بے رسن

''پنج آہنگ'' کے خطوط میں بھی انھوں نے متعدد جگہ اپنا نام صرف ''اسداللہ'' ہی لکھا ہے حتیٰ کہ بعض خطوط کا آغاز ''از اسداللہ نامہ سیاہ'' یا ''نامہ نگارا سداللہ'' سے ہوتا ہے۔ میاں نوروز علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اگر نامہ فریسند و بہ عنوان نویسند کہ ایں مکتوب بہ دہلی بہ اسداللہ برسد، دشوار نیست کہ آں نامہ بدیں روسیاہ برسد۔''[۲۳]

۲۲/ مارچ ۱۸۵۲ء کے ایک خط میں تفتہؔ کو ہدایت کرتے ہیں:

''خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے۔ ''در دہلی با اسداللہ برسد'' کافی ہے۔''

اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ پنشن سے متعلق عرض داشتوں اور درخواستوں کے آخر میں بھی وہ کبھی کبھی اپنا نام صرف ''اسداللہ'' ہی لکھا کرتے تھے۔ اس سلسلے کے دستاویزات میں ایسی اٹھائیس تحریریں ہماری نظر سے گزر چکی ہیں جن پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔ ان میں سے بارہ تحریروں میں انھوں نے اپنا نام ''اسداللہ'' لکھا ہے۔ ان میں قدیم ترین تحریر ۲۵ نومبر ۱۸۳۱ء کی اور آخری تحریر ۲۵ اکتوبر ۱۸۴۴ء کی ہے۔ نواب کلب علی خاں کے نام کے خطوط میں بھی جہاں انھوں نے بطور دستخط تخلص کی بجائے نام لکھا ہے، یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے کا آخری خط ۱۶/ نومبر ۱۸۶۸ء کا تحریر کردہ ہے۔

اس سلسلۂ گفتگو کا آخری اور سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ''اسداللہ'' کی حیثیت اسمی سے متعلق مالک رام صاحب کا زیر بحث بیان خود ان کے سابقہ موقف سے مطابقت نہیں رکھتا۔ گزشتہ سطور میں ان کا یہ قول نقل کیا جا چکا ہے کہ ''اس (دوسری) مہر کی بنا حضرت علی کا لقب ہے۔ چوں کہ میرزا کا نام اسداللہ تھا، اس لیے انھوں نے اس رعایت سے بہ طور تبرک یہ نام کھدوا لیا۔'' اس طرح ایک بار یہ کہنا کہ ''میرزا کا نام اسداللہ تھا'' اور دوسری بار اس سے انکار کر دینا ایک ایسی کیفیت ذہنی کی غمازی کرتا ہے جو اعترافِ حق اور اعلانِ حق کی بجائے بہر صورت حریف کے دعووں کو باطل ٹھہرانے میں دلچسپی رکھتی ہے۔

غالب نے تیسری مہر ۱۲۳۸ھ میں تیار کرائی تھی۔ اس پر ''محمد اسداللہ خاں'' کندہ تھا۔ مالک رام صاحب کے مطابق یہ ''معرکہ آرا مہر ایک عظیم الشان داخلی اور ذہنی انقلاب کی آئینہ دار ہے۔'' اس انقلاب کے محرکات میں انھوں نے اس مذہبی مباحثے کا بہ طور خاص حوالہ دیا ہے جو ان کے بقول انیسویں صدی کے ربع اول میں شروع ہوا تھا اور جس کا موضوع مسئلہ امکان و

امتناع نظیر تھا۔ اس مباحثے کے ایک فریق مولانا فضل حق خیر آبادی تھے۔ ان کی تحریک پر غالبؔ نے بھی اس بحث میں حصہ لیا تھا اور فارسی میں ایک مثنوی کہہ کر ان کی اور ان کے ہم خیال علماء کی تائید کی تھی۔ مذہبی معاملات سے غالبؔ کی اس دلچسپی کا اولین محرک مالک رام صاحب نے نواب الٰہی بخش معروفؔ سے ان کی عزیز داری کو ٹھہرایا ہے۔ نواب صاحب خود صوفی تھے اور اس حیثیت سے متصوفین کے درمیان ''خاصے معروف بھی تھے۔'' غالبؔ کی طبیعت کے ''لاابالیانہ پن'' پر ''علم و عمل کے اس نمونے'' کے اثرات مرتب نہ ہوں، یہ اصول فطرت کے خلاف تھا۔ اس تمہید کے بعد مالک رام صاحب نے اس سلسلے میں اپنے مجموعی تاثرات ان الفاظ میں قلمبند فرمائے ہیں:

> ''میرزا کی تحریروں سے ثابت ہے کہ وہ اس سے قبل فسق و فجور اور عیش و عشرت کی دلدل میں پھنس چکے تھے، لیکن اس نئے مذہبی ماحول نے اگر ان کی کایا بالکل پلٹ نہیں دی تو کم از کم اس کی شدت میں ضرور کمی آ گئی اور وہ اخلاقی قدروں کے بھی شناسا ہو گئے۔ اس سے پہلے ان کی مہر پر کندہ تھا: اسداللہ خاں عرف میرزا نوشہ، انھوں نے جو نئی مہر تیار کرائی، اس پر لکھا ہے: محمد اسداللہ خاں۔ کیا ان کی قلب ماہیت کا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت درکار ہے۔'' (ص ۸۴)

مسئلۂ امکان و امتناع نظیر پر بحث کب شروع ہوئی اور اس کا آغاز کس نے کیا، فی الوقت اس موضوع پر گفتگو کا موقع نہیں۔ قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ غالبؔ اس بحث میں کب شریک ہوئے اور ان کی وہ نظم جو اس مسئلے سے متعلق ہے، کس زمانے میں معرض وجود میں آئی؟ مالک رام صاحب نے اس مباحثے کو انیسویں صدی کے ربع اول کا واقعہ قرار دیا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ غالبؔ کو اس ابتدائی مرحلے میں اس مسئلے سے کوئی دلچسپی تھی یا نہیں۔ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۶ء کے اواخر تک اس بحث کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ بعض قرائن کے بموجب یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مولانا فضل حق نے الور سے رام پور جاتے ہوئے کچھ دنوں کے لیے دہلی میں قیام کیا تھا اور اس دوران ان کی سرگرم شرکت کی بدولت یہ بحث ایک بار پھر تازہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ غالبؔ نے انھی ایام میں مولانا کی فرمائش پر وہ اشعار کہے تھے جو ان کی چھٹی فارسی مثنوی موسوم بہ ''بیان نمودار ی شان نبوت و ولایت .....'' میں شامل ہیں۔ سلطان العلما مولانا سید محمد مجتہد کے نام ۲۱ جمادی الاول ۱۲۷۳ھ (۱۷ جنوری ۱۸۵۷ء) کے خط میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دریں ہنگام در شہر دو دانشمند باہم در آویختہ اند۔ یکے می سراید کہ آفریدگار ہمتاے حضرت خاتم الانبیا علیہ و آلہ السلام می تواند آفرید۔ و ایں یکے می فرماید کہ ایں ممتنع ذاتی و محال ذاتی است۔ بندہ چوں ہمیں عقیدہ دارد، نظمے در گیرندہ بدیں مدعا سرانجام دادہ است۔ ہر آئینہ چشم دارد کہ سواد بہ نور نظر اصلاح روشن شود۔''[۲۴]

اس واضح بیان کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۶ء میں اس مذہبی مباحثے میں غالبؔ کی شرکت اور اس سے پورے پینتیس (۳۵) برس قبل ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۳ء میں تیار شدہ ان کی زیر بحث مہر کے درمیان کسی ذہنی و جذباتی رشتے کی موجودگی قطعاً خارج از امکان ہے۔ یہی کیفیت تصوف کے اثرات کی بھی ہے کہ اس سے

غالبؔ کا واسطہ ''ثمرائے شعر گفتن'' سے زیادہ نہ تھا۔ علاوہ بریں مذہبی طور پر وہ شیعی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے جس میں تصوف کے لیے یوں بھی کوئی گنجائش نہیں ☆۔ البتہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دوسری مہر کی طرح یہ تیسری مہر بھی شیعت میں ان کے گہرے اعتقاد کی توثیق کرتی ہے۔ اس میں ان کے نام کے مختلف اجزا کی نشست میں جو ترتیب قائم کی گئی ہے، اسے محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ سب سے اوپر لفظ ''اللہ'' کندہ ہے، درمیان میں لفظ ''محمد'' نقش اور تیسری اور آخری سطر میں لفظ ''اسدؔ'' اور ''خان'' یعنی:

خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام　　یہی ہے مذہب حق، والسلام والاکرام

غالبؔ کی خود نوشت تحریروں، سرکاری مراسلوں اور عرضداشتوں میں کہیں ان کا نام ''اسداللہ خاں''، کہیں ''محمد اسداللہ خاں''، کہیں ''محمد اسداللہ'' اور کہیں صرف ''اسداللہ'' لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے میں کسی طے شدہ ضابطے کے پابند نہیں تھے۔ دوسری اور تیسری صورتوں میں اصل نام ''اسداللہ'' کے ساتھ لفظ ''محمد'' کے اضافے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے رشتے کے ایک سالے یعنی امراؤ بیگم کے عمِ حقیقی نبی بخش خاں کے ایک بیٹے کا نام بھی ''اسداللہ خاں'' تھا اور ان کی مہر پر یہی نام کندہ تھا۔ چوں کہ غالبؔ اپنے تشخص کی نگہداری کے معاملے میں خاصے حساس تھے، اس لیے عین ممکن ہے کہ انھوں نے اپنے اور اپنے ان برادر نسبتی کے درمیان امتیاز کی غرض سے اپنی مہر پر ''محمد اسداللہ خاں'' کندہ کرا لیا ہو۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا، غالبؔ اپنے نام کے معاملے میں کسی طے شدہ ضابطے کے پابند نہیں تھے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا غالب رجحان ''اسداللہ خاں'' کی طرف تھا۔ جب اس نام کو سرکاری سطح پر سندِ اعتبار حاصل ہو گئی تو انھوں نے لفظ ''محمد'' کو ترک کر کے صرف ''اسداللہ خاں'' لکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مرزا ہرگوپال تفتہؔ کو ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''لفظ مبارک ''میم، حا، میم، دال'' اس کے ہر حرف پر میری جاں نثار ہے مگر چوں کہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی 'محمد اسداللہ خاں' نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔''

حکام کا پاس خاطر غالبؔ کو کس قدر عزیز تھا، اس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے، اس لیے ان کے کسی بھی فیصلے یا طرزِ عمل کو وقت اور حالات کے تقاضوں سے بلند تر ہو کر دیکھنے کی کوشش کبھی صحیح سمت میں رہنمائی نہیں کر سکتی۔ اسی مصلحت کوشی اور احتیاط پسندی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنی خاندانی پنشن اور دیگر امور سے متعلق درخواستوں اور مراسلوں پر کبھی اس مہر کے علاوہ کوئی اور مہر نہیں لگائی۔ چنانچہ اس سلسلے کے جو دستاویزات برصغیر اور یورپ کے مختلف محافظ خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں سے سترہ (۱۷) کاغذات پر دستخط کے ساتھ یہ مہر بھی ثبت ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نام کے ساتھ ''محمدؐ'' کا سابقہ موقوف کر دینے کے اعلان کے بعد بھی وہ سرکاری نوعیت کی تمام تحریروں پر یہی مہر لگاتے رہے۔ چنانچہ جن سترہ تحریروں پر اس مہر کے نشانات ہماری نظر سے گزرے ہیں، ان میں اولین تحریر ۷ رجولائی ۱۸۳۰ء کی اور آخری تحریر ۷ فروری ۱۸۶۷ء کی ہے۔ اس آخری تحریر کی روشنی میں جناب کالی داس گپتا رضا کا یہ ارشاد محلِ نظر قرار پاتا ہے کہ ''غالبؔ کی یہ مہر تقریباً تیس سال تک استعمال میں رہی۔''[۲۵]

موجودہ شواہد کی بنیاد پر اس کا کم از کم پینتالیس (۴۵) سال تک (۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۳ء تا ۲ شوال ۱۲۸۳ھ/ ۷ فروری ۱۸۶۷ء)

☆ اسی زمانے میں لکھنؤ و دہلی میں شیعہ حضرات میں تصوف پسندی کی وجہ سے اس جملے سے اتفاق مشکل ہے۔ (مدیر)

استعمال میں رہنا ثابت ہے۔

ہمارے نزدیک یہ مہر نہ تو مذہبی نقطۂ نظر سے کسی ''داخلی اور ذہنی انقلاب'' کی آئینہ دار ہے اور نہ اخلاقی سطح پر کسی ''قلب ماہیت'' کی نشان دہی کرتی ہے۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بطور خاص سرکاری کاغذات پر ثبت کرنے کے لیے تیار کرائی گئی تھی، کیوں کہ اس سے پہلے کی دونوں مہریں اس کام کے لیے موزوں نہیں تھیں۔ پہلی مہر کا استعمال نام کے ساتھ عرف کے شمول کی وجہ سے خلاف احتیاط تھا جب کہ دوسری مہر خالص مذہبی رنگ کی نمائندگی کرتی تھی۔

اس سلسلے کی چوتھی مہر وہ ہے جسے مالک رام صاحب نے پانچویں نمبر پر جگہ دی ہے۔ اس پر ''یا اسداللہ الغالب'' کندہ ہے اور مالک رام صاحب کے مشاہدے یا تحقیق کے مطابق یہ ۱۲۶۹ھ/ ۵۳۔ ۱۸۵۲ء میں تیار ہوئی تھی۔ مصیبت یا پریشانی کے وقت حضرت علی کو مدد کے لیے پکارنا شیعہ حضرات کے بنیادی عقائد اور روزمرہ کے معمولات میں شامل ہے۔ یہ مہر اسی عقیدے کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔ چنانچہ مالک رام صاحب نے اسے مناسب جواز فراہم کرنے کی غرض سے پہلے تو یہ وضاحت فرمائی ہے کہ غالبؔ اس زمانے میں یعنی ۵۳۔ ۱۸۵۲ء کے آس پاس مختلف قسم کی ذہنی و مالی پریشانیوں میں مبتلا تھے، جنھوں نے انھیں ''پراگندہ روزی، پراگندہ دل'' کا مصداق بنا دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۵۴ء کے چند واقعات کے حوالے سے ان کی ''خوش اعتقادی اور نیک نیتی'' کے بارآور اور اس استعانت کے مقبول و مستجاب ہونے کے کئی ثبوت پیش کیے ہیں۔ یہ شواہد حسب ذیل ہیں:

(۱) ذوق کے انتقال (۴ نومبر ۱۸۵۴ء) کے بعد استادِ شاہ کے منصب پر تقرر۔

(۲) ولی عہد مرزا غلام فخرالدین رمز کا حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونا اور چار سو روپے سالانہ وظیفہ مقرر کرنا۔

(۳) ظفرؔ کے سب سے چھوٹے بیٹے مرزا خضر سلطان کا شاگرد ہونا۔

(۴) سلطنتِ اودھ سے رسم و راہ میں استواری اور واجد علی شاہ کی طرف سے پانچ سو روپے سالانہ بہ طور وظیفہ مقرر ہونا۔

یوں تو غالب کی زندگی میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب کہ انھوں نے اپنی خواہشات اور توقعات کے مطابق آسودگی اور مرفہ الحالی کی زندگی گزاری ہو تاہم ۱۸۵۳ء میں یا اس سے کچھ پہلے آلام و مصائب کی کوئی ایسی غیر معمولی صورت حال نظر نہیں آتی جس میں وہ مالک رام صاحب کے بقول ''بآواز بلند فریاد'' پر مجبور ہوں اور حضرت علی کو ان کی مشکل کشائی کا واسطہ دے کر مدد کے لیے پکاریں۔ اس کے برخلاف یہ وہ زمانہ ہے جب کہ بہادر شاہ ظفرؔ کی سرکار سے ''نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ'' کے خطابات اور پچاس روپے ماہوار کے مشاہرے کے ساتھ سلاطین مغلیہ کی تاریخ نویسی کے منصب پر تقرر کے بعد ان کی انا کی تسکین اور اسبابِ معیشت کی بہتری کا اچھا خاصا سامان مہیا ہو گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں مالک رام صاحب کی تمام تاویلات و توجیہات دور از کار قیاسات پر مبنی ہیں، کیوں کہ یہ مہر ۱۲۶۹ھ میں نہیں، اس سے پورے بیس برس پہلے ۱۲۴۹ھ/ ۳۴۔ ۱۸۳۳ء میں کندہ کرائی گئی تھی۔ اس کے دستیاب نقش میں چار کی دہائی واضح نہیں۔ مالک رام صاحب نے اسے پہلی نظر میں غلطی سے چھ پڑھ لیا، اس کے بعد دوبارہ اس پر غور کرنے اور دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق کرنے کی ضرورت

محسوس نہیں کی، حال آنکہ یہ زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ غالبؔ نے اپنا دیوان فارسی ''مے خانۂ آرزو سرانجام'' کے نام سے ۱۲۵۰ھ/ ۳۵۔ ۱۸۳۴ء میں مرتب کیا تھا۔اس کا دیباچہ ان کے کلیات فارسی کے علاوہ ''کلیات نثر غالب'' میں بھی شامل ہے۔ اس دیباچے میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

''دل بہ شرا کب نعلین محمدیؐ آویختن کیش و آئین من وطغرا ے والا ے ''یا اسداللہ الغالب''، نقش نگین من''۔ [۲۶]

اس سے ظاہر ہے کہ یہ مہر اس دیوان کی ترتیب سے پہلے تیار ہو چکی تھی۔ ۱۲۵۰ھ سے پہلے اور اس کے بعد لیکن ۱۲۶۹ھ سے بہت پہلے کی غالبؔ کی ایسی کئی تحریریں راقم الحروف کی نظر سے گزر چکی ہیں جن کا آغاز انھوں نے ''یا اسداللہ الغالب'' سے کیا تھا۔مثلاً:

(۱) مکاتیب غالبؔ کے اس مجموعے میں جو پہلے پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ملکیت تھا اور اب مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے، مثنوی ''بادِ مخالف'' کے سرِ عنوان ''یا اسداللہ الغالب'' لکھا ہوا ہے۔اس مجموعے کی تمام تحریریں غالبؔ کے قیام کلکتہ کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۲) ''مآثر غالبؔ'' میں شامل فارسی خطوں میں سے ایک خط کا آغاز ''یا اسداللہ الغالب'' سے ہوا ہے۔ یہ خط خواجہ فخراللہ کے نام ہے اور ۱۰/رمضان ۱۲۴۸ھ مطابق ۳۱ جنوری ۱۸۳۳ء کو لکھا گیا ہے۔

(۳) خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں غالبؔ کے کلیاتِ نظم فارسی کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جسے ان کے دوست رائے چھج مل نے لکھ کر ۱۱ ربیع الآخر ۱۲۵۴ھ/ ۴ جولائی ۱۸۳۸ء کو مکمل کیا ہے۔اس کے ایک صفحے کے حاشیے پر ''نامۂ منظوم بہ نام جوہر'' کی ابتدا بھی ''یا اسداللہ الغالب'' ہی سے ہوئی ہے۔

(۴) دیوان غالب کے ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء میں شائع شدہ پہلے ایڈیشن کا آغاز بھی یا اسداللہ الغالب ہی سے ہوتا ہے۔حضرت علی سے استعانت کا یہ متواتر عمل غالبؔ کی اس زمانے کی ذہنی و مالی پریشانیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ان ایام میں وہ جن مسائل و مصائب سے دوچار تھے، ان کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے کیا جا سکتا ہے:

(۱) میرزا یوسف ۱۸۲۶ء کے آس پاس مرض جنون میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے تقریباً تیس برس اسی حالت میں گزارے۔چھوٹے بھائی کی یہ علالت غالبؔ کے لیے ہمیشہ سوہان روح بنی رہی لیکن شروع میں کئی برس وہ اس کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی پریشان رہے۔

(۲) امراؤ بیگم کو اپنے چچا نواب احمد بخش خاں کی سرکار سے تیس روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نواب صاحب کی وفات کے بعد جو حالات رونما ہوئے، ان کے زیر اثر ان کے جانشین نواب شمس الدین احمد خاں نے غالباً ۱۸۳۰ء یا ۱۸۳۱ء میں یہ وظیفہ منسوخ کر دیا۔بیوی کی اس مستقل آمدنی کے بند ہو جانے سے گھر کی اقتصادی حالت کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

(۳) معتمد برائے گورنر جنرل کے خط مورخہ ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کے ذریعے اس فیصلے سے آگاہ ہونے کے بعد کہ ''حضور والا

(گورنر جنرل) نصر اللہ خاں کے متوسلین کی مالی امداد کے ضمن میں فیروز پور کے جاگیردار کے کیے ہوئے انتظام میں مداخلت پسند نہیں فرمائیں گے''، غالبؔ اپنے مقدمہ پنشن کی ناکامی پر عرصے تک بے حد افسردہ اور پریشان رہے۔ اس کے بعد اپریل ۱۸۴۴ء تک ان کا بیشتر وقت اس مقدمے کی اپیل کی کامیابی کے لیے تگ و دو میں صرف ہوا۔

(۴) سقیم مالی حالت اور رئیسانہ طرز زندگی کی وجہ سے قرض کا بوجھ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ پنشن کے مقدمے میں گورنر جنرل کے فیصلے کے بعد قرض خواہوں کے تقاضوں نے غالبؔ کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ انجام کار فروری ۱۸۳۵ء میں عدالت دیوانی سے ان کے خلاف پانچ ہزار کی ڈگری ہو گئی۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں یہ مہر تیار ہوئی۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ یہ ۱۲۴۹ھ میں کندہ کرائی گئی تھی، یہ بات از خود طے ہو جاتی ہے کہ غالبؔ کی اب تک دریافت شدہ مہروں میں اس کا چوتھا نمبر تھا۔

محمد مشتاق تجاروی کا بیان ہے کہ پروفیسر مختار الدین احمد کے خیال میں یہ مہر بدر الدین کے علاوہ کسی اور مہر کن کی کندہ کی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ [۲۷] ہمیں اس خیال سے اتفاق کی بہ ظاہر کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کیوں کہ اس کے حروف کی کشش اور نشست میں کوئی ایسا نقص موجود نہیں جو بدر الدین کی شانِ خط کے منافی ہو۔ البتہ اس کا جو نقش دستیاب ہوا ہے، وہ بہت صاف نہیں۔ یہی سبب ہے کہ مالک رام صاحب کو اس پر درج سنہ کے پڑھنے میں تسامح ہوا۔ اس کیفیت کی وجہ سے بعض حروف کی ہیئت ظاہری بھی متاثر ہوئی ہے۔ غالباً اسی بنا پر مختار الدین احمد صاحب کو یہ شبہ ہوا کہ یہ بدر الدین کے سوا کسی اور کی بنائی ہوئی ہے۔

پانچویں، چھٹی اور ساتویں، تینوں مہریں غالبؔ کے شاہی خطاب ''نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ'' سے تعلق رکھتی ہیں۔ مالک رام صاحب نے ان میں سے صرف آخری یعنی ساتویں مہر کا ذکر فرمایا ہے اور اپنے حساب کے مطابق اسے چوتھے نمبر پر رکھا ہے۔ چوں کہ یہی مہر اس سلسلے کی باقی دو مہروں تک ہماری رسائی کا وسیلہ بنی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گفتگو کا آغاز اسی کے ذکر سے کیا جائے۔ اس ساتویں مہر پر غالبؔ کا نام مع ان کے خطابات کے اس طرح کندہ تھا:

''نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر، نظام جنگ''

دائیں طرف کے زیریں گوشے میں لکھے ہوئے سنہ کے مطابق یہ مہر ۱۲۶۷ھ میں تیار ہوئی تھی۔ غالبؔ کو متذکرۂ بالا خطابات بہادر شاہ ظفرؔ نے ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ مطابق ۴/جولائی ۱۸۵۰ء کو عطا کیے تھے اور ''تاریخ نویسی تاجداران تیموریہ'' کی خدمت ان کے سپرد فرمائی تھی۔ مالک رام صاحب نے خود غالبؔ کی ایک فارسی تحریر کے طویل اقتباس، ''اسعد الاخبار'' آگرہ کے ۱۵/جولائی ۱۸۵۰ء کے شمارے میں شائع شدہ مفصل خبر اور مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے کہے ہوئے قطعہ تاریخ کے حوالے سے اس سلسلے کی تمام تفصیلات اپنے مضمون میں یکجا فرما دی ہیں لیکن ایک پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ یہ خطابات تو ۱۲۶۶ھ میں ملے تھے پھر یہ مہر ۱۲۶۷ھ میں کیوں تیار ہوئی؟ خود اشتہاری غالبؔ کے مزاج کا ایک نمایاں عنصر تھی چنانچہ یہ بات ان کی نفسیات کے بالکل خلاف معلوم ہوتی ہے کہ وہ مہینوں نئی مہر کی تیاری کا انتظار کرتے اور اس اعزاز کے اعلان و اشتہار کے اس سہل الحصول اور موثر وسیلے سے اتنے دنوں تک محروم رہتے۔ اگر فاضل محقق کے ذہن میں یہ خلش پیدا ہوئی ہوتی اور انھوں نے اسے دور کرنے کے

لیے غالبؔ کی اس زمانے کی تحریریں پر بہ نظر غائر توجہ فرمائی ہوتی تو اس انکشاف میں زیادہ دیر نہ لگتی کہ وہ اس مہر سے پہلے ان خطابات پر مشتمل ایک نہیں، دو مہریں ۱۲۶۶ھ ہی میں تیار کرا چکے تھے۔ لیکن چوں کہ یہ مہریں ان کے معیار پر پوری نہیں اتریں اس لیے انھوں نے انھیں رد کر کے جلد ہی ایک اور مہر تیار کرائی جو عرصۂ دراز تک ان کے استعمال میں رہی۔ اپنے شاگرد عزیز منشی جواہر سنگھ جوہرؔ کے نام ۲۳/ اکتوبر ۱۸۵۰ء (۱۲ ذی قعدہ ۱۲۶۶ھ) کے خط میں لکھتے ہیں:

''روزے بود کہ نامۂ بہ من رسید کہ نگارش از شما بود و مہر از من۔ گفتم: سبحان اللہ شگرفی آثار یگانگی و اتحاد کہ ہم نامہ بنام من است و ہم بہ مہر من ..... چوں آں ورق بہ من رسید و من دراں وقت تنہا بودم، مشاہدۂ نقش خاتم خویش بر مکتوب موسومہ خویش مرا بہ وجد آورد۔ بالجملہ چشم بہ راہ نگین مہر داشتم، دی روز کہ سہ شنبہ و بست و دوم اکتوبر بود، رسید۔ ہماناً مہر کن در کشمیر نہ ماند، ع مجلس چو بر شکست، تماشا بہ مار سید۔ پس از پژوہش پدید آمد کہ قریب صد کس از ہوسناکان دہلی نگیں بافرستادہ در کشمیر کندانده اند و ہمہ شرمسار و پشیماں شدہ اند۔ حالیا آں سعادت نشاں را باید کہ در دسر نہ کشند و مہر دیگر بہ کندن نہ دہند۔ امروز دریں فن نظیر بدرالدین بہ گیتی نیست۔ چوں او بد نوشت، پندارم کہ خوبی سرنوشت من است۔''[۲۸]

اس تحریر سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، پہلی یہ کہ ۴ جولائی اور ۲۲ اکتوبر ۱۸۵۰ء کے درمیان غالبؔ نے دلی کے مشہور مہر کن بدرالدین سے اس خطاب کی یادگار کے طور پر ایک تازہ مہر تیار کرائی تھی جو انھیں کسی وجہ سے پسند نہیں آئی۔ دوسری یہ کہ اس مہر کو رد کر دینے کے بعد انھوں نے اپنے شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر سے جو اس زمانے میں پنجاب میں کسی جگہ برسرِ روزگار تھے، یہ فرمائش کہ کہ وہ کشمیر کے کسی مہر ساز سے ان کی مہر تیار کرا دیں۔ یہ دوسرا نگینہ انھیں ۲۲/ اکتوبر ۱۸۵۰ء کو موصول ہوا، لیکن اس کی نقاشی سے بھی وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ غالباً اس کے بعد ہی ۱۲۶۷ھ میں اس سلسلے کی وہ تیسری مہر تیار ہوئی جسے مالک رام صاحب نے چوتھے اور ہم نے ساتویں نمبر پر رکھا۔ احوال ظاہری کے اعتبار سے یہ مہر بھی بدرالدین ہی کی تیار کردہ معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے پچھلی مہر کے بارے میں غالبؔ کی ناپسندیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تیاری پر خصوصی توجہ صرف کی ہو۔

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا بیان ہے کہ قیام آکسفورڈ کے دوران ۱۹۵۴ء میں انھوں نے ایک بار اس مہر کی زیارت کی تھی۔ تقریب یہ ہوئی کہ حیدرآباد سے ڈاکٹر نظام الدین صاحب اور آغا حیدر حسن صاحب کے داماد وہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایک روز جب وہ ان دونوں حضرات کو ایشمولین میوزیم کا وہ شوکیس دکھا رہے تھے جس میں مختلف قسم کی انگوٹھیاں اور مہریں رکھی ہوئی تھیں تو ڈاکٹر نظام الدین صاحب نے اپنے ہم سفر کی انگلی کی طرف اشارہ کیا اور ان سے پوچھا: اس مہر کو آپ پہچانتے ہیں؟ یہ مرزا غالبؔ کی مشہور مہر تھی۔ عقیق پر نہایت خوبصورت حروف میں ''نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ'' کے الفاظ منقوش تھے۔ مختلف کاغذوں پر متعدد بار اس کے نقوش دیکھنے میں آئے تھے۔[۲۹]

مختار الدین احمد صاحب کے علاوہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیبؔ نے بھی اپنی کتاب ''غالبؔ اور حیدرآباد'' میں اس مہر کا ذکر کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۶۹ء تک آغا حیدر حسن کے ہاں موجود تھی۔ شکیبؔ صاحب لکھتے ہیں:

''پروفیسر آغا حیدر حسن کے یہاں میرزا غالبؔ کا ایک چغہ اور ان کی ایک مہر ہے۔ یہ مہر جگری عقیق پر کندہ ہے۔ اس مہر کی عبارت حسب ذیل ہے:

''نجم الدولہ، دبیر الملک، اسداللہ خاں غالبؔ، نظام جنگ''

۱۲ ۶۲ھ

آغا حیدر حسن صاحب کے بیان کے مطابق غالبؔ کی یہ مہر شاہی مہر کن بدرالدین نے تیار کی تھی۔''[۳۰]

اس مہر کے متعلق یہ دونوں بیانات تحقیقی اعتبار سے ناقص اور وضاحت طلب ہیں۔ مختار الدین احمد صاحب کے بیان کا نقص یہ ہے کہ انھوں نے صرف اجزائے خطابی نقل فرمائے ہیں۔ مہر کے باقی اندراجات کو نظر انداز کر دیا ہے، جب کہ شکیبؔ صاحب کی نقل کردہ عبارت میں ''اسداللہ خاں'' اور ''نظام جنگ'' کے درمیان ''غالبؔ'' کا اندراج اور نیچے دیا ہوا سنہ مشکوک ہے۔ سنہ کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے نقل کرنے میں سہو ہوا ہے، خواہ اس کے ذمہ دار خود صاحب کتاب ہوں یا ان کا کاتب۔ اسے بہرحال ۱۲۶۶ھ یا ۱۲۶۷ھ ہونا چاہیے۔ اگر یہ ۱۲۶۶ھ ہے تو یہ مہر یقیناً اس مہر سے مختلف ہے جسے مالک رام صاحب نے اپنے مضمون میں متعارف کرایا ہے اور اگر ۱۲۶۷ھ ہے تو اس میں نام کے بعد لفظ ''بہادر'' کی بجائے تخلص یعنی ''غالبؔ'' کا اندراج خلاف واقعہ ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ دراصل یہ وہی مہر ہے جو منشی جواہر سنگھ جوہرؔ نے کشمیر کے کسی مہر ساز سے کندہ کرا کے اکتوبر ۱۸۵۰ء میں غالبؔ کو بھیجی تھی۔ اس کے رد کیے جانے کی وجہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں نام کے ساتھ ''بہادر'' کا لاحقہ موجود نہیں تھا، جس کا شمول از روے قاعدہ بے حد ضروری تھا۔ اس سلسلے میں منشی شیو نرائن آرامؔ کے نام ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط کا یہ اقتباس ملاحظہ طلب ہے:

''سنو، میری جان! نوابی کا مجھ کو خطاب ہے ''نجم الدولہ'' اور اطراف و جوانب کے امرا سب مجھ کو ''نواب'' لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی ..... یاد رہے ''نواب'' کے لفظ کے ساتھ ''میرزا'' یا ''میر'' نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا ''نواب اسداللہ خاں'' لکھو یا ''میرزا اسداللہ خاں'' اور ''بہادر'' کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔''

یہ مہر چوں کہ شکیبؔ صاحب کی نظر سے گزر چکی تھی، اس لیے نومبر ۲۰۰۴ء میں جب وہ لندن سے حیدرآباد تشریف لائے تو میں نے اپنے شبہات کا حوالہ دیتے ہوئے ان سے رجوع کیا کہ وہ صحیح صورتِ حال سے مطلع فرمائیں۔ موصوف نے اس کے جواب میں اپنے مکتوب مورخہ ۱۹ نومبر ۲۰۰۴ء میں جو وضاحت فرمائی ہے وہ حسب ذیل ہے:

''غالب کی یا غالبؔ سے منسوب جس مہر کا ذکر ''غالبؔ اور حیدرآباد'' میں ہے، وہ اب ہماری دسترس سے باہر ہے۔ یہ مہر پروفیسر آغا حیدر حسن کی ملکیت تھی۔ انھوں نے جناب محمد اشرف صاحب کو تحفۃً دے دی تھی۔ محمد اشرف صاحب وہی ہیں جنھوں نے سالار جنگ میوزیم کے مخطوطات کا کیٹلاگ کئی جلدوں میں شائع کیا ..... میں نے غالبؔ کی یہ مہر محمد اشرف صاحب کے یہاں دیکھی تھی۔ جہاں تک یاد

ہے وہ خود اس مہر سے مطمئن نہیں تھے۔اس کا ذکر میں نے پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب سے کیا۔آغا صاحب نے اپنی روایات کے مطابق وثوق سے کہا کہ یہ مرزا غالب کی ہے بلکہ یہ تک وضاحت کی، یہ بدرالدین مہر کن کی کندہ کی ہوئی ہے۔آغا صاحب قلعہ معلّٰی کی یادگار تھے۔ان کے گھرانے اور مرزا غالب کے گھرانے کے تعلقات قدیم تھے۔میں کیا جواب دیتا۔لہٰذا میں نے تمام اختلافات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ''غالب اور حیدرآباد'' میں اس کا ذکر کر دیا۔اب یہ آپ جیسے محققین کا کام ہے کہ اس کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم فرمائیں۔

جہاں تک مجھے یقین ہے ''غالبؔ اور حیدرآباد'' میں مہر کا متن جو دیا گیا ہے، وہ درست ہے۔ اس میں سہوِ کتابت کو دخل نہیں۔ممکن ہے کہ مہر میں تاریخ غلط کندہ ہو گئی ہو، اس لیے اس کو استعمال نہ کیا گیا ہو۔پڑی رہی ہو اور خاندانی تعلقات کی وجہ سے آغا حیدر حسن صاحب تک پہنچی ہو۔

جس وسیلے سے یہ مہر ہم تک پہنچی، اس کی وجہ سے ہم اس کو Fake تو نہیں کہہ سکتے، لیکن اگر غلط کندہ ہو گئی ہو تو Discarded کہہ سکتے ہیں۔''

شکیبؔ صاحب کی اس تحریر سے یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ آغا حیدر حسن صاحب نے یہ مہر محمد اشرف صاحب کو تحفۃً عنایت فرما دی تھی، یہ مناسب معلوم ہوا کہ آغا صاحب کے داماد میر معظم حسین صاحب سے درخواست کی جائے کہ وہ اس کے بارے میں حصولِ معلومات میں مدد فرمائیں۔موصوف نے میرے ۴ فروری ۲۰۰۵ء کے خط کے جواب میں ۲۵ فروری کو تحریر فرمایا:

''آپ نے خط میں جس مہر کا ذکر کیا ہے، اس کا مجھے علم نہیں ہے، لیکن میری شادی کے موقعہ پر میرے خسر پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا نے مجھے ایک انگوٹھی عنایت کی تھی جس کو میں نے پچاس سال سے زائد اپنے ہاتھ پر پہنا۔اس انگوٹھی پر اسداللہ خاں غالبؔ کے خطابات کندہ تھے۔میں اس انگوٹھی کو اب محفوظ کروا دیا ہوں جس کی وجہ سے اس کا عکس بھیجنے سے قاصر ہوں۔''

اس مایوس کن جواب کے بعد بہ ظاہر اب اس مہر تک رسائی کی کوئی امید نظر نہیں آتی، اس لیے باقی مہروں کی طرح اسے بھی متاعِ گم گشتہ تصور کر کے طاقِ نسیاں کے کسی گوشے میں ڈال دینا چاہیے۔راقم السطور اپنے اس خیال پر بہر حال قائم ہے کہ غالب نے اسے نام کے بعد لفظ ''بہادر'' کی عدم موجودگی کی وجہ سے مسترد کر دیا ہوگا۔شکیبؔ صاحب کی رائے کے مطابق سنہ کا غلط کندہ ہو جانا بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے لیکن اس کا امکان بہت کم ہے۔اس کے برخلاف بے خیالی یا رواداری کے باعث اکائی کے عدد چھ (۶) کا دو (۲) پڑھ لیا جانا عملی تجربات کی روشنی میں زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔

جس طرح ساتویں مہر کے متعلق غور و خوض کے نتیجے میں اس چھٹی مہر کے وجود کا علم ہوا اسی طرح اس چھٹی مہر کے حوالے سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ انھی خطابات پر مشتمل ایک مہر اس سے قبل بھی تیار ہو چکی تھی۔''امروز دریں فن نظیر بدرالدین بہ گیتی نیست۔چوں او بدنوشت، پندارم کہ خوبیِ سرنوشتِ من است۔'' سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ مہر بدرالدین نے کندہ کی تھی لیکن غالب

اس سے مطمئن نہیں تھے۔انھوں نے اپنی اس بے اطمینانی یا ناپسندیدگی کا سبب مہر ساز کی بدنویسی کو ٹھہرایا ہے،لیکن یہ بات اس لیے قابل قبول نہیں معلوم ہوتی کہ ''بدرالدین'' اور ''بدنویسی'' میں بہ ظاہر لفظ ''بد'' کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں تھی۔غالب کی اس زمانے کی تحریریں تقریباً نایاب ہیں۔کافی تلاش وجستجو کے بعد ہمیں صرف ایک خط دستیاب ہوا ہے جس پر یہ مہر ثبت تھی،لیکن یہ اصل خط نہیں،اس کی نقل ہے،اس لیے اس کی روشنی میں اس مہر کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔یہ خط مفتی سید احمد خاں بریلوی کے نام ہے اور پنج شنبہ ۳/اکتوبر ۱۸۵۰ء کو یعنی منشی جواہر سنگھ جوہر کے بھیجے ہوئے تکمینے کے دہلی پہنچنے سے صرف انیس (۱۹) دن پہلے لکھا گیا ہے۔اسے محمد ابرار علی صدیقی نے اپنی کتاب ''آئینہ دلدار'' میں جو میاں دلدار علی مذاق بدایونی کی سوانح عمری ہے دوسرے کئی خطوط کے ساتھ نقل کیا ہے۔خط کے آخر میں مہر کی عبارت بھی بہ ظاہر اس کی ہیئت اصلی کے مطابق ایک مستطیل کی شکل میں نقل کر دی گئی ہے۔[۲۱] پانچویں مہر کی یہ دستی نقل ساتویں مہر کے دستیاب نقوش سے صرف اس قدر مختلف ہے کہ یہ سنہ کی قید سے عاری ہے جب کہ آخرالذکر میں اس کی تیاری کا سنہ (۱۲۶۷ھ) بھی موجود ہے۔لیکن یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ ساتویں مہر جو ۱۲۶۷ھ کے بعد برابر زیر استعمال رہی،اس کی ایسی کئی نقلیں بھی ہمارے علم میں ہیں جن میں سنہ کا اندراج نہیں۔ان حالات میں زیر بحث پانچویں مہر کی کیفیت ظاہری کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔البتہ مفتی سید احمد کے نام کے خط پر اس کے نقش کی موجودگی میں اس کے وجود پر کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

غالبؔ نے اپنی آخری مہر ۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء) میں یعنی اپنی وفات سے تقریباً سات سال قبل تیار کرائی تھی۔اس مہر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان کی دوسری تمام مہروں کی بہ نسبت کافی مختصر ہے یعنی اس پر صرف ان کا تخلص (غالبؔ) اور تیاری کا سنہ (۱۲۷۸ھ) کندہ ہے۔اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے مالک رام صاحب لکھتے ہیں:

> ''جو لوگ نفسیات سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ نفس انسانی میں ''انا'' کے ارتقا کا انتہائی مقام یہ ہے کہ انسان کسی غیر معمولی کامیابی کے بعد اپنے تعارف کے لیے مختصر سے مختصر ''علم'' کا استعمال کرنے لگتا ہے۔'' (ص ۸۸)

غالبؔ کی اس نفسیاتی کیفیت کو انھوں نے جن دو غیر معمولی کامیابیوں کا نتیجہ قرار دیا ہے،ان میں سے پہلی ''قاطع برہان'' کی اشاعت ہے جو ان کے بقول ''ہندوستان کے فارسی دانوں کے خلاف ساری عمر کے جہاد'' کا ایک عملی ثبوت بھی تھی اور ''علی الاعلان عام دعوت مبارزت بھی''۔یہ کتاب ۲۰ رمضان المبارک ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء کو اس زمانے کے سب سے مشہور وممتاز طباعتی ادارے مطبع منشی نول کشور لکھنو میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔دوسری بڑی کامیابی یہ تھی کہ اسی سال مطبع نول کشور میں ان کے کلیات فارسی کی طباعت شروع ہوئی جو اگلے سال یعنی ۱۸۶۳ء میں مکمل ہو گئی۔اس سلسلے کی تمام ضروری تفصیلات قلمبند کرنے کے بعد محترم محقق اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

> ''۱۸۶۲ء-۱۸۶۳ء میرزا کی زندگی میں نہایت اہم سال ہیں۔''قاطع برہان'' اگر دوسروں کی شکست کا اعلان تھا تو کلیات ان کی فتح مندی کا ثبوت۔اسی سال ان کا اپنے تکمیں پر ''غالب'' کندہ کرانا اسی حقیقت

کا ایک اور پیرائے میں اظہار ہے۔ اب گویا انھوں نے اس دعوے پر مہر لگا دی کہ فارسی علم و زبان کے لحاظ سے میں ''علمی کلّ غالب'' ہوں۔'' (ص ۹۰،۹۱)

کسی بھی معروف طباعتی و اشاعتی ادارے سے بہ یک وقت دو کتابوں کی اشاعت کسی بھی مصنف کے لیے فخر و مباہات کا باعث ہو سکتی ہے۔ غالبؔ کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ اتنی بڑی کامیابی یقیناً نہیں کہ غالبؔ جیسا یگانۂ روزگار فن کار اس کی علامت کے طور پر ایک مہر تیار کرا کے اسے یادگار بنا دے۔ دنیا میں ہزاروں کام ایسے ہیں جن کی انجام پذیری میں وقت کا تعین کوئی اہمیت نہیں رکھتا، مگر جب وہ انجام پا جاتے ہیں تو وقت کے ساتھ ان کے تعلق کی متعدد توجیہات و تاویلات کی جا سکتی ہیں اور حسب اتفاق ان میں سے کوئی توجیہ یا تاویل واقعے کے عین مطابق بھی ہو سکتی ہے۔ اس مہر کے سلسلے میں مالک رام صاحب قبلہ کے ارشادات بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کو چوبیس پچیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اپنی انفرادیت کا بہ خوبی ادراک و احساس ہو گیا تھا۔ کلکتے میں قیام کے دوران قتیل کی زبان دانی پر ان کے اعتراضات کو بجا طور پر ہندوستانی فارسی دانوں کے خلاف ان کے مبینہ جہاد کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت اپنے بیان کردہ سال ولادت (۱۲۱۲ھ) کی رو سے وہ عمر کی انیسویں منزل میں اور ہماری تحقیق کے مطابق چھتیسویں سال میں تھے۔ اس کے بعد انانیت کی یہ لے متواتر تیز ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ نصف صدی پوری کرتے کرتے انھیں وہ مقام حاصل ہو گیا جہاں شہرت کے پَر پرواز لگا کر اڑنے والے کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں رہتے۔ چنانچہ ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء میں انھوں نے نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کی خدمت میں جو قصیدۂ مدحیہ ارسال کیا تھا، اس کے ایک شعر میں یہ واضح اعلان موجود تھا:

نامم بہ سخن غالبؔ و روشن ترم از روز　　بے ہودہ چرا جلوہ دہم اسم و علم را

تقریباً اسی زمانے میں (پنج آہنگ کی اشاعت سے قبل) انھوں نے میاں نوروز علی خاں کو پہلی بار خط لکھا تو جواب کے لیے پتے میں صرف ''بہ دہلی بہ اسد اللہ برسد'' کو کافی قرار دیا۔ ۱۲ مارچ ۱۸۵۸ء کے خط میں مرزا تفتہؔ کو بھی اسی مختصر پتے پر اکتفا کی ہدایت کی گئی ہے۔ ان دونوں خطوط کے اقتباسات گزشتہ صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ ایک اور خط مرزا حاتم علی مہرؔ کے نام ہے جو ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا تھا، اس میں لکھتے ہیں:

''آپ کو معلوم رہے کہ میرے خط کے سرنامے پر محلے کا نام لکھنا ضروری نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام، قصہ تمام۔''

اسی ہدایت کا اعادہ چار برس کے بعد مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام کے ایک خط میں بھی کیا گیا ہے۔ یہ خط مرزا صاحب نے ستمبر ۱۸۶۵ء میں رام پور کے سفر پر روانگی سے قبل تحریر فرمایا تھا۔ مکتوب الیہ موصوف کو مطلع فرماتے ہیں:

''اب کوئی خط آپ بھیجیں تو رام پور بھیجیں۔ مکان کا پتا لکھنا ضروری نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے۔''

پیش کردہ مثالوں میں سے تین مثالیں ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۲ء سے قبل کے زمانے سے متعلق ہیں۔ چوتھی اور آخری مثال اگرچہ ۱۲۷۸ھ سے بعد کی ہے لیکن اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ یہ بیرون دہلی یعنی رام پور کے عارضی قیام کے زمانے سے

تعلق رکھتی ہے۔ان سبھی مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ غالبؔ اپنی شخصیت کی یکتائی سے بہ خوبی واقف تھے اور اپنے وقار کے تحفظ اور انا کی سربلندی کے لیے ہمہ وقت سرگرم وفکرمند رہتے تھے۔''ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے'' کسی شہر کی تخصیص کے بغیر ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب ان کے تصور کے مطابق ''نہیں'' کے سوا کچھ اور ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ ایک اتفاقی امر ہے کہ ان کی یہ آخری مہر جس پر صرف ان کا تخلص کندہ ہے، ۱۲۷۸ھ میں تیار ہوئی، ورنہ اس سے مالک رام صاحب کے بقول جس نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے، وہ اس سے اٹھارہ برس قبل ۱۲۶۰ھ میں کہے ہوئے ان کے اس شعر سے بھی ظاہر ہے جس میں ''اسم وعلم'' سے بے نیازی اور صرف تخلص کے حوالے سے انہیں مہی الامس (روشن تر از روز) ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے اپنی بعض تحریروں میں شعر وادب کے تناظر میں صرف تخلص کے حوالے سے اور مراسلت ومکاتبت کی حالت میں نام کی مختصر ترین شکل ''اسداللہ'' کے ذریعے روشناس خلق ہونے پر جو اصرار کیا ہے، وہ کسی داخلی مغائرت یا تضاد کا مظہر نہیں۔تعارف کی یہ دونوں صورتیں ''ہر سخن وقتے وہر نکتہ مکانے دارد'' کے بہ مصداق ایک ہی باطنی کیفیت کی نشان دہی کرتی ہیں۔

غالبؔ کے جن مہروں کے نقوش اہل علم کی دسترس میں ہیں، ان میں یہ آخری مہر وہ واحد مہر ہے جس کے خط کی ناپختگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ بدرالدین کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔ممکن ہے کہ غالب کے کسی دوست یا شاگرد نے یہ سوچ کر کہ شاعر کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت وناموری کے باوجود انھوں نے اپنے تخلص کے ساتھ کوئی مہر کندہ نہیں کرائی۔ یہ مہر بہ طور خود کسی معمولی مہر ساز سے تیار کرا کے ان کی خدمت میں پیش کردی ہو اور انھوں نے اس دوست یا شاگرد کے پاس خاطر کی بنا پر اسے رد کردینا مناسب نہ سمجھا ہو۔اس سوال کا کہ ان کی نفاست پسندی کیوں کر اس کی متحمل ہوئی، اس کے علاوہ کوئی اور جواب سمجھ میں نہیں آتا۔

مفصلہ بالا تجزیے سے ظاہر ہے کہ مالک رام صاحب نے ان مہروں کی تیاری کے سلسلے میں جو تاویلات پیش فرمائی ہیں، ان میں سے بیشتر قابل قبول نہیں۔لیکن ان کے اس بنیادی موقف سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں سے ہر مہر اپنا ایک نفسیاتی، مذہبی یا تاریخی پس منظر رکھتی ہے۔اس اعتبار سے غالبؔ کی پر پیچ شخصیت اور ذہن ومزاج کی تفہیم میں دوسرے خارجی وسائل کے ساتھ ان مہروں کا کردار بھی مناسب توجہ کا مستحق ہے۔یہی ایک بات ان کے بارے میں تحقیق وتنقید کا جواز فراہم کرتی ہے۔

حواشی

۱۔ غالبؔ شناس مالک رام، از ڈاکٹر گیان چند، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۶۷

۲۔ فسانۂ غالبؔ، از مالک رام، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۸۱۔آئندہ تمام مقامات پر اقتباسات کے آخر میں قوسین کے اندر صفحات کے حوالے دے دیے گئے ہیں۔

۳۔ نامہ ہائے فارسی غالبؔ، مرتبہ سید اکبر علی ترمذی، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۷۔غالبؔ کی خاندانی پنشن اور دیگر امور، نیشنل ڈاکومینٹیشن سنٹر، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۳۹

۴۔ فسانۂ غالب، ص ۱۱۵

۵۔ نامہ ہائے فارسی غالبؔ، ص ۱۰۳

۶۔ غالبؔ کی خاندانی پنشن، ص ۴۹

۷۔ ایضاً، ص ۵۳

۸۔ متفرقات غالبؔ، مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، طبع ثانی، لکھنو، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۶

۹۔ دیوان غالبؔ، مرتبہ نظامی بدایونی، طبع ثانی، بدایوں، ۱۹۱۸ء، صفحہ ماقبل متن

۱۰۔ احوال غالبؔ، مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد، طبع ثانی، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۴

۱۱۔ بحوالہ غالب نامہ، نئی دہلی، شمارہ جنوری ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۵ ۔ ۲۱۶

۱۲۔ گلشن بے خار، از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، طبع اول، دہلی، ۱۸۳۷ء، ص ۱۸۵

۱۳۔ بحوالہ غالب نامہ، نئی دہلی، شمارہ مذکور الصدر، ص ۱۷۳

۱۴۔ فسانۂ غالب، ص ۴۹

۱۵۔ احوال غالبؔ، ص ۱۴۲ ۔ ۱۴۳

۱۶۔ مکاتیب غالبؔ، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشیؔ، طبع دوم، رام پور، ۱۹۴۳ء، حاشیہ ص ۴۱

۱۷۔ یادگار غالبؔ (عکسی ایڈیشن) یو۔پی اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۶ء، ص ۹

۱۸۔ نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۱۰۳

۱۹۔ پنج آہنگ، طبع ثانی، دہلی، ۱۸۵۳ء، ص ۳۳۴

۲۰۔ دیوان غالبؔ بہ خط غالب، مرتبہ اکبر علی خاں عرشیؔ زادہ، رام پور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۶

۲۱۔ گل رعنا، مرتبہ مالک رام، دہلی، ۱۹۷۰ء، ص ۳۵

۲۲۔ غالبؔ کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، جلد سوم، دہلی، ص ص ۱۰۲۹ ۔ ۱۰۳۰

۲۳۔ پنج آہنگ، ص ۳۸۹

۲۴۔ تجلیات، از مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، ص ص ۱۹۷ ۔ ۱۹۸، بہ حوالہ ماہنامہ نیا دور لکھنو، شمارہ جولائی ۱۹۸۰ء، ص ۱۲

۲۵۔ غالبؔ درون خانہ، از کالی داس گپتا رضا، ساکار پبلشرز، بمبئی، ۱۹۸۹ء، ص ۴۳

۲۶۔ پنج آہنگ، ص ۱۱۳

۲۷۔ غالب نامہ، نئی دہلی، شمارہ جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۶

۲۸۔ باغ دودر، مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۲۰

۲۹۔ گنجینۂ غالبؔ، پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۶۸ تا ص ۱۷۰

۳۰۔ غالبؔ اور حیدر آباد، از ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۲۳

۳۱۔ آئینۂ دلدار، از ابرار علی صدیقی، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۹۳

مولوی محمد مہدی واصف

علیم صبا نویدی

اورنگ زیب عالم گیر نے دکن پر فتح یابی حاصل کی تو اسد خان کو حاکم دکن بنایا جس نے اپنے بیٹے ذوالفقار کو یہ خدمت سونپ دی۔ آخرش یہ حکومت نواب آصف جاہ کے حصے میں آئی اور آصف جاہ نے اپنے ہم نوا ساتھی انورالدین خان کو کرناٹک کا صوبے دار بنا کر شمالی آرکاٹ بھیج دیا۔ آصف جاہ کے انتقال ۱۱۶۱ھ اور نواب انورالدین خان بہادر کی شہادت (بمقام گڈھ آمبور، شمالی آرکاٹ ۱۱۶۲ھ) ازآں بعد ان کے فرزند محمد علی والا جاہ (المتوفی ۱۲۱۰ھ ۱۷۹۵ء) نے کرناٹک کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی۔ نواب والا جاہ کا دور حکومت بہ ہر اعتبار تاریخی اور یادگار رہا ہے۔ اس دور میں نہ صرف جید علماء کی سرپرستی اور قدر دانی ہوئی بلکہ دینی، علمی و ادبی کارناموں کا ایک ایسا نور آور سلسلہ چلا کہ جس کی نظیر دور دور تک خال خال ہی نظر آتی ہے اور اس نوری سلسلے کا ہر نقش آج بھی ہمارے ذہنوں کو منور و معطر کرتا ہے۔ نواب والا جاہ کے بعد اس سلسلے کو روشن اور عطر بیز رکھنے میں نواب غوث اعظم نے بھرپور سعی کی ہے اور اپنے مشن میں کامیاب و کامران رہے۔ نواب والا جاہ محمد علی کی دعوت پر مولوی مہدی واصف کے جد امجد حافظ محمد معروف برہان پور مدراس تشریف لائے تھے۔ آپ کے والد ماجد عارف الدین خان رونق بھی اپنے دور کے جید علماء سے تھے اور موصوف کو مولانا باقر آگاہ دیلوری سے تلمذ حاصل تھا۔ نواب غوث خان بہادر اعظم کے دور کے علماء کرام میں مولوی واصف کی متنوع شخصیت، کثیر الجہات علمیت کے ساتھ ساتھ اپنے اعلیٰ مقام و مرتبہ کے اعتبار سے بہت ہر دلعزیز اور ممتاز ہے۔

مولوی مہدی واصف ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۲ء میں بمقام مدراس میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد مولانا مولوی عارف الدین خان رونق (المتوفی ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۴ء) سے فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے دور کے جید علماء قاضی بدر الدولہ (المتوفی ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء) مفتی عبدالرحمٰن کڈپوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء) شیخ معین الدین عبدالقادر حسینی (المتوفی ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴ء) اور مولوی عبدالوہاب سے رجوع کیا۔ فقہ، حدیث اور متعلق جیسے علوم پر دستگاہ حاصل کرنے کے بعد انگریزی، ترکی، تمل، سنسکرت، تلگو اور مراٹھی زبانوں میں بھی کمال پیدا کیا۔

۱۱۳۰ھ ۱۷۱۷ء میں مدراس کے گورنر نے فورٹ سینٹ جارج اسکول کی بنیاد رکھی اور بعد میں ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۰ء میں یہی سکول کالج میں منتقل ہوا تو اس کے تعلیمی شعبہ جات میں مولوی تراب علی نامی، حسن علی ماہل، منشی شمس الدین احمد، قاضی ارتضا علی خان خوشنود، مولوی سید تاج الدین کے ساتھ ساتھ مولوی مہدی واصف بھی (۱۲۳۸ھ ۱۸۲۲ء) درس و تدریس کی خدمات پر مامور ہوئے۔ اس کالج سے وابستہ ہونے کے بعد آپ نے کئی ایک معرکہ آراء کتابوں کے تراجم اردو ادب کو دیے آپ نے جو فارسی لغات ''مناظر اللغات'' مطبوعہ (۱۲۳۰ھ ۱۸۵۳ء) فارسی سنسکرت لغات ''دلیل ساطع'' لغات محاورات فارسی و ضرب الامثال ''دلیل

الشعراء'' اور انگریزی لغات (۱۲۲۸ھ ۱۸۵۱ء) تالیف کیں وہ افادیت واہمیت کے حامل ہیں۔آپ نے ان لغات کے علاوہ کرناٹک کے شعراء اور علماء پر تذکرے مثلاً تذکرہ شعراء فارسی ''معدن الجواہر'' مطبوعہ (۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء) علمائے مدراس کا تذکرہ ''حدیقۃ المرام'' (مطبوعہ ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء) (عربی) وغیرہم جیسی تحقیقی کتابیں ادب کو دے کر نہ صرف اپنی علمی، ادبی اور فنی موشگافیوں کا ثبوت پیش کیا بلکہ اپنے علم وفضل اور ذہانت کا ایک نیا شناخت نامہ دنیائے علم وادب کے سامنے رکھ دیا ہے۔

مہدی واصف کی اول الذکر چار کتابیں فورٹ سینٹ کالج کے شعبہ ''تصنیف وتالیف'' سے شائع ہوئی تھیں اور تذکرہ ''حدیقۃ المرام'' کو کالج کے انتظامی بورڈ نے انعام واکرام سے بھی نوازا تھا۔مہدی واصف کے علاوہ یہ انعامات قاضی ارتضا علی خان (مصنف ''نقو والحساب'') اور مولوی تراب علی نامی (مصنف ''وسیط النحو'') کی خدمت میں بھی پیش کیے گئے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کے اشاعتی شعبہ سے دکنی اردو کی بہت سی اہم ترین کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں منشی شمس الدین احمد کی ''حکایات الجلیلہ'' ارتضا علی خان خوشنود کی ''فرائض ارتضیہ'' محمد ابراہیم بیجاپوری کی ''انوار سہیلی'' تاج الدین حسین خان بہجت کی ''اطہر الصلاح'' کے علاوہ ''بکاولی'' ''چہار درویش''، ''اخلاق ہندی'' اور ''باغ وبہار'' بے حد مشہور ہیں۔ان کتابوں میں بعض کتابیں کالج کے نصاب میں بھی شامل تھیں۔

مہدی واصف سنی عقائد کے سچے عاشق اور نقش بندی المشرف تھے۔حدیث اور سیر کے ماہر تھے۔آپ کا سب سے بڑا وصف آپ کی رحم دلی اور صاف گوئی تھا۔آپ جو کام بھی اپنے ذمہ لیتے تھے اسے بڑی تندہی اور شوق سے پایہ تکمیل تک پہنچاتے تھے آپ نے کالج کی ملازمت کے دوران جو کتابیں تالیف وترجمہ کی ہیں وہ آپ کی مہارت نامہ کی روشن دلیل ہیں۔ تذکرہ شعرائے فارسی ''معدن الجواہر'' میں۔بعض شعراء اور علماء کے حالات پیش کرنے میں آپ نے غیر معمولی اختصار سے بھی کام لیا ہے جس سے بہت زیادہ تشنگی کا احساس کھٹکتا ہے مگر تعجب اس بات کا ہے کہ آپ نے مختلف زبانوں، موضوعات اور تقاضوں پر بڑی ذمہ داری کے ساتھ قلم اٹھا کر اپنے علمی تبحر اور ژرف بینی کا جو ثبوت فراہم کیا ہے وہ یقیناً ہماری آئندہ نسل کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

نواب غوث خان اعظم نے اپنے دور میں جس مجلس مشاعرہ کی بنیاد رکھی اس کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔اس سے پہلے اس علاقے میں نہ اس قسم کے مشاعرے کہیں ہوئے نہ تنقیدی مجالس۔ان مجالس میں نہ صرف شعراء کے کلام پر سنجیدہ اور صحت مند تنقیدیں ہوتی تھیں بلکہ محفل شعر وسخن میں ایک ایسی خوش گوار علمی ادبی فضاء پیدا ہو جاتی جس کی مثال آج دور دور تک موجود نہیں ہے۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان مجالس مشاعرہ کی صدارت خود نواب غلام غوث خان بہادر اعظم کرتے تھے جس کی وجہ سے حفظ مراتب کا خیال اور ہر ایک اہل علم کو ایک دوسرے کا احترام نہایت ضروری سمجھا جاتا تھا۔راقم الحروف کا دعوی ہے کہ اس نوع کے مشاعروں کی پہلی کرن اردو ادب میں نواب غوث خان اعظم کے دربار سے پھوٹی تھی۔مہدی واصف نے ایک مدت تک ''مشاعرہ اعظم'' کے صدارتی فرائض بھی انجام دیئے تھے۔

مہدی واصف فورٹ سینٹ جارج کالج سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد حیدرآباد چلے گئے، پھر مسلسل سفر پر رہے۔جہاں بھی گئے وہاں اپنے علمی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے مشہور رہے۔علم پروری آپ کی جبلت بن چکی تھی، درس وتدریس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا۔پتہ نہیں کن حالات کے پیش نظر آپ ترچناپلی گئے، وہاں قیام کے دوران آپ نے اس دور کے جید عالم وفاضل اور پیر

کامل سید جام عالم نقش بندی کے دست مبارک پر بیعت وخلافت کی اور اس کے ساتھ ساتھ باطنی توجہات سے مشرف ہوئے۔آپ کو بزرگان دین سے خاص محبت اور عقیدت تھی یہی عقیدت اور محبت کا فیضان ہے کہ آپ نے بڑے تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے۔

ٹمل ناڈو کے مختلف کتب خانوں کی خاک چھاننے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مہدی واصف تین سو سے زیادہ کتابوں کے مولف اور مصنف ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ موصوف کی تمام کتابیں کسی ایک کتب خانے میں محفوظ نہیں ہیں۔ہندوپاک کی مختلف لائبریریوں میں آپ کی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے لیکن آج ان کتابوں سے استفادہ کرنے والا کوئی بھی نظر نہیں آتا ہے۔کاش اس دور میں بھی سخاوت مرزا جیسا کوئی محقق پیدا ہو جائے تو اسے یقیناً مہدی واصف کی خدمات کا صحیح اور مکمل جائزہ لینے میں اور ان کے علمی وادبی خدوخال کے جزیرے تک رسائی حاصل کرنے میں دشواری نہیں ہوگی۔

مہدی واصف کے دو تذکروں ''معدن الجواہر'' اور ''حدیقۃ المرام'' کو جو عالم گیر شہرتیں نصیب ہوئیں وہ بہت کم تذکرہ نگاروں کے حصے میں آئی ہیں۔ان دونوں تذکروں میں آرکاٹ کے شعراء اور اہل علم وفضل اور اصحاب فکر وفن کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی۔یہ دونوں تذکرے اس لیے بھی جاندار اور وقیع ہیں کہ مولوی مہدی واصف نے ''حدیقۃ المرام''[1] میں نواب غوث خان بہادر اعظم کے نام معنون تذکرہ ''گلزار اعظم'' (مطبوعہ ۱۲۷۲ھ ن ۱۸۸۵ء مطبع کرشن راج، مدراس) کو افضل الشعرا محمد حسین راقم[2] کی تصنیف بتایا ہے۔پتہ نہیں یہ کس حد تک صداقت پر مبنی ہیں بعض باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مہدی واصف بڑے صداقت پسند اور صاف گو انسان تھے۔آخر ش ان کو ان کی صاف گوئی کے عوض کیا ملا۔حضرت راقم نے اپنی تالیف (جو نواب غوث خان بہادر اعظم کے نام سے منسوب ہے) انتقاماً موصوف کی مذمت کی تھی چوں کہ مہدی واصف شریف النفس اور دل النفس آدمی تھے، خاموشی کو اپنا وطیرہ بنایا اور آپ نے ہمیشہ کے لیے چپ سادھ لی۔لیکن راقم الحروف کے ہاتھ میر منشی خاص حاجی قادر مرتضی حسین سالار الملک بہادر[3] نواب غوث خان بہادر اعظم کے نام لکھا ہوا ایک ایسا فارسی مکتوب لگا ہے جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ''گلزار اعظم'' افضل الشعرا محمد حسین راقم کی تالیف ہے۔راقم الحروف اس خط کو من وعن مولانا مولوی سید عبدالجبار قادری باقوی سابق پرنسپل باقیات الصالحات، ویلور (شمالی آرکاٹ) کے اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔[4]

فارسی خط:

بعد آداب وتسلیمات کہ ذریعہ مجرمان عفو طلب است، بعرض عالی می رساند کہ معاینہ بعضے مواقع تذکرہ نو تالیف کہ بنام نامی حضور بلند آوازہ گشتہ است خیلے تاسف خاطر افزود، چہ وقوع کلمات طعن وکنایہ وحرف ناسزا از جانب حضور در حق آنانکہ از ایشاں نسبت بحضور گستاخی راہ نیافتہ است، بغایت ناپسندیدہ وخلاف فحوائے حدیث المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ، تصور یدہ می شود۔اگر چہ فدوی از شیریں سخن خاں بہادر بذریعہ وجود مذکورہ معرض ایں معنی شد کہ چہ ادشنام نامہ خلایق کہ بعضے ازاں بحق پیوستہ بعضے ازاں بمقابلہ شما از دست وزبان استادہ اند بنام حضور تیار ساختہ بمواخذہ دنیا وآخرت می درآیند وحضور را در ضمن اظہار عداوت باطنی خود ہدف دشنام ہائے خلائق حال وآئندہ می سازند:

دہن خویش بدشنام میالا صایب
کین زر قلب بہر کس تو دہی باز دہد

اگر چہ خان مسطور براست بیانی وحق نویسی قصص مروم بزبان حال مترنم شدند سلنا اما آئین ادب نیست کہ عیب فاسق و

فاجر بمواجہہ اش بیان کردہ آید وجبلیت انسان ہم مقتضی آں می شود کہ از وانمودن عیوب واقعی او تحمل وبرداشت نماید، دریں صورت ضرور کہ حضور خود متوجہ شدہ یا حوالہ کہ متدین نمودہ بر برآوردن ہمچو مواقع واقعی یا اتہامہ ازاں کتاب تجویز خواہند فرمود، اگر مرضی حضور بحال داشتنش باشد فحوائے تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان شایان بندگان عالی نیست کہ درچنیں امور نامحمود خود را دخیل فرمایند د بلکہ بہتر است کہ جزائے خیر بدانست عندیہ خان مذبور نظر بر مشقت مولفانہ شان باوشاں سپارند مع ہذا بلحاظ عنایات حضور کہ مبذول حال فدوی است بہ جرات پردازمی شوم کہ حضور نظر بعلو ہمت کریمانہ خود ہرگز مناسب نخواہند کہ متاع غیر در تصرف مالکانہ حضور باشد وحق مؤلف تلف کریمانہ گردد۔ گمان غالب است کہ بعد ازاں گوش زد حضور خواہد شد کہ جوابہائے مغلظہ در صلہ آں چقدر نصیب راقم گشتہ است زیادہ حد ادب۔ غلام قادر مرتضی حسین۔

اردو ترجمہ:

آداب وتسلیمات کے بعد جو مجرموں کے طلب عفو کا ذریعہ ہیں بندہ (خدمت عالی میں) عرض پرداز ہے کہ نوتالیف تذکرہ جو حضور عالی کے نام نامی سے شہرت یافتہ ہے کہ بعض مقامات کے معاینہ نے دلی رنج میں زبردست اضافہ کردیا اس لیے کہ حضور کی جانب سے عیب گیری اور اشارہ کنایہ والے نامناسب کلمات وہ بھی ان لوگوں کے حق میں جن سے حضور کے تعلق سے کسی قسم کی گستاخی رونما نہیں ہوئی ہے انتہائی ناپسندیدہ اور المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامتی میں رہیں) والی حدیث کے مطلب کے خلاف قصور کیا جارہا ہے۔ اگرچہ فدوی شیریں سخن خان بہادر[۵] کی جانب سے وجوہ مذکورہ کے ذریعہ اس معنی ومطلب تک پہنچ چکا ہے کہ کیوں ان لوگوں کا دشنام نامہ (گالی نامہ) جن میں سے بعض اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں اور ان میں سے بعض نے آپ کے مقابلے میں اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں روکے رکھا ہے، حضور کے نام سے تیار کرکے دنیا اور آخرت کی گرفت میں آرہے ہیں اور اپنی باطنی عداوت کے اظہار کے ضمن میں حضور کو موجودہ اور آئندہ لوگوں کی گالیوں کا نشانہ بناتے ہیں۔

کھوٹا سونا تم صائب اپنا منہ گالیوں سے آلودہ مت کرو
یہ جس کسی کو بھی دوگے وہ واپس لوٹا دے گا

ہمیں تسلیم ہے خان[۶] مذکور نے راست بیانی اور حق نویسی کے ذریعہ لوگوں کے قصے بزبان حال بیان کیے ہیں لیکن یہ بات آئین ادب میں داخل نہیں ہے کہ فاسق وفاجر کا عیب اس کے روبرو بیان کیا جائے اور انسانی فطرت بھی اس بات کی مقتضی نہیں ہوگی کہ اس کے واقعی عیوب ہی سہی بیان کرنے پر صبر وتحمل سے کام لے۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ حضور خود متوجہ ہوکر یا (معاملہ) کسی متدین آدمی کے حوالے کرکے واقعی جیسے یا انتہامی مقامات کو اس کتاب سے نکال دینے کی رائے دیں۔ اگر حضور کی مرضی ان مقامات کو باقی رکھنے کی ہو تو بفحوائے آیت شریفہ وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (سورہ مائدہ آیت نمبر ۲) ''نیکی تقوی میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔'' حضور کے شایان شان نہیں ہے کہ ایسے ناپسندیدہ کاموں میں خود دخل دیں بلکہ بہتر ہے کہ اس کی جزائے خیر خان[۷] مذکور کے ارادے کے موافق اور ان کی مولفانہ مشقت کے پیش نظر انہیں کو سونپ دیں۔ اس کے باوجود بھی حضور کے عنایات کے ملاحظے میں جو فدوی کے حال پر مبذول ہیں (یہ کہنے کی) جرات کرتا ہوں حضور اپنی بلند ہمت کریمانہ کے پیش نظر ہرگز مناسب نہ سمجھیں کہ متاع غیر

حضور کے مالکانہ تصرف میں ہو اور مولف کا حق ضائع ہو جائے۔ گمان غالب ہے کہ اس کے بعد حضور سنیں گے کہ اس کے صلہ میں جوابہائے مغلظہ راقم کی نصیب بن چکے ہیں۔ زیادہ حد ادب۔

غلام قادر مرتضی حسین

مہدی واصف کو فارسی اور اردو شاعری پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ موصوف نے فارسی شاعری میں اپنا تخلص واصف اور اردو شاعری میں ''مسکین'' اختیار کیا۔ آپ کی اردو شاعری کا مجموعہ ''دیوان مسکین'' کے نام سے ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۷ء میں مطبع محمدی سے اور فارسی شاعری کا دیوان ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ راقم الحروف نے آپ کے نعتیہ کلام کا دیوان بنام ''روضہ رضوان'' کتب خانہ محمدی میں دیکھا ہے۔ آپ کی شاعری میں عربی اور فارسی کے شاندار الفاظ کی تراش وخراش، نادر تشبیہات و دقیق استعارات کے ساتھ ساتھ متانت کے اسرار و رموز بھی جلوہ فشاں ہیں۔

بحیثیت مجموعی مہدی واصف کی دینی، علمی اور ادبی خدمات تمل ناڈو کے جبین پر وہ روشن بندھیا کی حیثیت رکھتے ہیں جسے کسی بھی زمانے کے ظلم وحوادث کی ہوا مٹا نہیں سکتی۔

آپ نواب غوث خان اعظم کی وفات (۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء) کے بعد حیدرآباد گئے اور وہاں اٹھارہ سال تک مدرسہ دارالعلوم میں مدرس رہے۔ ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۷۳ء میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کے فرزند والا نے آپ کی تاریخ وفات یوں نکالی ہے: ''آج واصف داخل جنت ہوئے۔''

حوالہ جات

۱۔ ''حدیقۃ المرام'' اردو (مترجم سخاوت مرزا) کے مقدمے میں افسر صدیقی نے ''تذکرہ سخنوران بلند فکر'' کا مؤلف عبدالصمد خان ماہر مدراسی بتایا ہے جو غلط ہے۔ اس تذکرے کے مؤلف نواب منور حسین خان گوہر مدراسی ہیں اور اس کی دو جلدیں ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۶ء اور ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۷ء میں Diocesan Press مدراس اور G.S Press مدراس سے چھپی تھیں۔

۲۔ راقم مولوی محمد حسین امام المدرسین کی اولاد سے تھے اور مولوی سید ابو طیب کان والا (متوفی ۱۲۹۴) کے خاص الخاص شاگرد تھے۔

۳۔ حاجی قادر مرتضی حسین سالار الملک بہادر محتشم جنگ (المتوفی ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء) وہی ہستی ہیں جنھوں نے نواب غوث خان اعظم کی راہبری میں پہلے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دی اور گورنمنٹ ایجنٹ مسٹر ایڈورڈ بالفور کے ہم خیال ہو کر ۱۵ ربیع الثانی ۱۲۵۷ھ ۷ فروری ۱۸۵۱ء میں انگریزی تعلیم کی حمایت کرتے ہوئے ایک نئے مدرسے ''مدرسہ اعظم'' کی بنیاد رکھنے کا پروگرام بنایا۔ سالار الملک گورنمنٹ ایجنٹ کی اصل غرض و غایت سے بالکل ناواقف تھے۔ انگریز اپنی مہم میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر کار ردعمل یہ ہوا کہ مدراس کے مختلف علاقوں مثلاً ویلور، آرکاٹ، وانمباڑی، عمرآباد اور مدراس میں عربی مدراس قائم ہو گئے اور ان مدراس کی وجہ سے دینی تعلیمات کی روشنی دور دور تک پھیلنے لگی۔

۴۔ آج بھی فارسی خط کتب خانہ مدرسہ محمدی کا مخزونہ ہے۔

۵۔ شیریں سخن محمد حسین خان بہادر راقم

۶۔ شیریں سخن محمد حسین خان بہادر راقم

۷۔ شیریں سخن محمد حسین خان بہادر راقم

''شمع'' ایک علمی و ادبی ماہنامہ

افضل حق قرشی

حسن ظہیر جعفری اپنے مضمون ''جریدہ شمع آگرہ ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۵ء'' میں تحریر کرتے ہیں:

''رسالہ شمع آگرہ (اکبرآباد) سے دسمبر ۱۹۲۴ء سے شائع ہونا شروع ہوا ..... مدیر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لا ..... راقم الحروف کے تایا تھے۔''[۱]

شمع کے بارے میں حسن ظہیر جعفری کی مہیا کردہ یہ معلومات ناقص ہیں۔ لاہور کے کتاب خانوں میں ''شمع'' کے فائل دستیاب نہیں۔ البتہ مختلف کتاب خانوں میں اس کے متفرق شمارے نظر سے گزرے ہیں۔ انہی کی بنیاد پر یہ مضمون تحریر کیا گیا ہے۔

''شمع'' کے مدیر تنہا حسن عابد جعفری نہیں تھے بلکہ نامور مؤرخ پروفیسر محمد حبیب (۱۸۹۴۔۱۹۷۱) اور حسن عابد جعفری (۱۸۸۵۔۱۹۶۰) دونوں تھے۔ ہر ورق پر مدیران کے نام یوں درج ہوتے تھے:

محمد حبیب آکسن

بیرسٹرایٹ لا۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حسن عابد جعفری آکسن

بیرسٹرایٹ لا آگرہ

''شمع'' کا اجرا جنوری ۱۹۲۵ء سے ہوا تھا نہ کہ دسمبر ۱۹۲۴ء سے۔ مدیرانِ ''شمع'' فروری ۱۹۲۶ء کے شمارے میں تحریر کرتے ہیں:

''شمع جنوری ۱۹۲۵ء سے نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔''[۲]

اس کا اجرا علی گڑھ سے ہوا تھا اور بعد ازاں آگرہ منتقل کیا گیا۔ مدیران ''شمع'' تحریر کرتے ہیں:

''شمع کے اجرا کا خیال مسلم یونیورسٹی میں پیدا ہوا۔ یہیں اس کا نام تجویز ہوا اور یہیں اس کی ابتدا ہوئی۔ جو عقیدت مدیران ''شمع'' کو مسلم یونیورسٹی اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ہے، اور جو نمایاں سرگرمی (کذا) اردو کے فروغ اور اس کے ادب کے احیاء میں یونیورسٹی کے نونہالوں سے ظہور میں آئی ہیں، ان کا یہی اقتضا تھا کہ ''شمع'' کی ابتدا یونیورسٹی کی فضا میں اور اس کی نشو و نما ارض تاج میں ہو''۔[۳]

قواعد و ضوابط کے مطابق یہ رسالہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا تھا۔ ایک شمارے کی قیمت مع محصول

ڈاک دس آنے تھی ۔ قیمت سالانہ چھ روپے اور ششماہی تین روپے آٹھ آنے تھی ۔ ممالک غیر سے قیمت سالانہ دس روپے اور ششماہی چھ روپے تھی ۔ پہلے شمارے کا حجم اسّی (۸۰) صفحات تھا جو بعد کو نوے (۹۰) صفحات ہوا اور جون ۱۹۲۵ء سے ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات کر دیا گیا ۔ ۱۹۲۷ء میں حجم کم اور سائز بڑھا دیا گیا ۔

اس رسالے میں اردو علمی و ادبی مضامین کے علاوہ انگریزی و فارسی سے علمی مضامین کے اردو تراجم بھی شائع کیے جاتے تھے ۔ ہر ماہ ایک یا دو تصاویر بھی شائع کی جاتی تھیں ۔ حصۂ نظم میں اقبال، احسن مارہروی، اختر شیرانی، اکبر حیدری، آرزو لکھنوی، اصغر، ثاقب کانپوری، ثاقب لکھنوی، جلیل مانکپوری، چراغ حسن حسرت، دردکا کوروی، شاد عظیم آبادی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، گرامی، مانی جائسی، محشر لکھنوی، مجنوں گورکھپوری، نوح ناروی، وحشت کلکتوی، وحید الدین سلیم، ہادی مچھلی شہری جیسے ادیبوں کے رشحات قلم شائع ہوتے رہے ۔

''شمع'' کے متفرق شماروں میں شائع شدہ منتخب مضامین کی فہرست درج ذیل ہے:

جولائی ۱۹۲۵ء

محمد معین الدین انصاری	بیادگار شوق قدوائی
شیخ مشیر حسین قدوائی	مطلع سیاسی
مشیر حسین قدوائی و محمد دین تاثیر	شرح محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اکتوبر ۱۹۲۵ء

امیر احمد علوی	مرثیہ اور اس کی عہد بعہد ترقی
سید محمد احمد رضوی	مصحفی کی مثنوی بحر المحبت
شہنشاہ حسین رضوی	شہزادگانِ مغلیہ کی تعلیم
عبدالمنعم سعیدی	مرکزی حکومت اور دکن: عہد مغلیہ سے قبل شمالی ہند
(مرزا محمد عباس ابن محمد علی شوستری / مترجم سید وزارت علی)	کی اسلامی سلطنت اور دکن کے تعلقات قدیم ایرانیوں کے آداب مجلس و نشست و برخاست

دسمبر ۱۹۲۵ء

محمد حبیب / مترجم جمیل حسین	سلطان محمود غزنوی
محمد محفوظ الحق	زیب النساء بیگم اور اس کا مرتب کردہ ''مرقع''
حافظ محمد حسین	ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ
حسن عابد جعفری	عہد اکبری کے معاشرتی حالات
نواب سید مظفر علی خان	عہد مغل میں شاہی محل کے حالات منوچی کی زبانی

جنوری ۱۹۲۶ء

مہدی حسن احسن لکھنوی	آثار جدید: آنریبل سر مہاراجہ صاحب بہادر ریاست عالیہ محمود آباد کے دور حکومت کی ایک نادر الوجود عمارت (بٹلر پیلس)
کرنیل اور بیک رائٹ	جنوں
محمد معشوق حسین خان	تزک جہانگیری
محمد حبیب/مترجم سید جمیل حسین	سلطنت دہلی اوائل دور وسطی میں
شیخ مشیر حسین قدوائی	میثاق لکھنؤ

فروری ۱۹۲۶ء

محمد معشوق حسین خان	تزک جہانگیری
ٹی۔ ایل۔ وسوانی/مترجم عزیز بریلوی	اسلام اور مساوات

مارچ ۱۹۲۶ء

خان صاحب مولوی ظفر حسن	بابر کا وصیت نامہ
محمد معشوق حسین خان	تزک جہانگیری

اپریل ۱۹۲۶ء

محمد عبدالجلیل خاں علی گڑھی	سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ
حسن عابد جعفری	عہد مغل میں گجرات کی حالت: ڈچ مؤرخ کے قلم سے
شہنشاہ حسین رضوی	عربوں کی تصانیف فنِ موسیقی پر

مئی ۱۹۲۶ء

سید حسن برنی	عمر خیام کا مزار
شبیر حسین شبیر مارہروی	تاریخ کتابت

جون ۱۹۲۶ء

حسن عابد جعفری	اکبر
ایضاً	قرونِ وسطی میں آمد و رفت کے ذریعے

جولائی ۱۹۲۶ء

نامعلوم	شمع مزار: دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے حالات زندگی

مارچ ۱۹۲۷ء

سی ۔ایف ۔اینڈ ریوز/مترجم ضیاءالدین برنی	منشی ذکاءاللہ مرحوم
فضل الرحمٰن خاں	خواتین ترکی کی آزادی اور تعلیم اسلام
سید حسن عابد جعفری	قرون وسطیٰ میں ہندوستان کی ڈاک
غلام یزدانی	علماء کی صحبت
حسن عابد جعفری	مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ بہادر

قارئین کی دلچسپی کے لیے شمع کے حصہ نظم ونثر میں سے چند تحریریں نقل کی جاتی ہیں:

(۱)

شمع دسمبر ۱۹۲۵ء میں مولانا چراغ حسن حسرت کے مندرجہ ذیل قطعات شائع ہوئے ۔مولانا ان دنوں شملہ میں مقیم تھے۔

سرو و گل، قمری و بلبل کی حکایت نہ رہی — حسن کا قصہ گیا، عشق کا افسانہ گیا
جس کے ہنگاموں سے تھی درد کی دنیا آباد — آج محفل سے تری وہ دلِ دیوانہ گیا

دل ہے اور شغلِ ماتمِ ہستی — دیدہ ہے اور خوں فشانی ہے
آپ اور داستانِ درد سنیں — مہربانی ہے، مہربانی ہے[۴]

(۲)

جنوری ۱۹۲۶ء کے شمارے میں تاثیر نے ''شمعِ شبستان'' کے عنوان سے اس وقت کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا ایک مجموعہ مرتب کر کے شائع کرایا تھا ۔اس کا ذکر ریاض قدیر صاحب کے پی ۔ایچ ۔ڈی کے مقالے ''ڈاکٹر ایم ۔ڈی ۔تاثیر: شخصیت اور فن'' میں بھی نہیں ۔''شمع'' میں اس کتاب پر شائع شدہ تبصرہ درج ذیل ہے:

> ''جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم ۔اے نے دورِ موجودہ کے افسانہ نگار حضرات کے بعض افسانے کتاب کی صورت میں جمع کر دیے ہیں اور جہانگیر بک کلب (کوچہ) چابک سواراں لاہور نے شائع کیا ہے ۔ جناب تاثیر ایک ہونہار نوجوان ہیں ۔ان کا مذاق صحیح ہے ۔باستثناء ایک دو افسانوں کے جو غیر معروف اشخاص کے قلم سے نکلے ہیں، کل انتخاب دل آویز ہے ۔خود تاثیر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے بہت پاکیزہ ہے۔
>
> یہ افسانے مختلف رسالوں میں چھپے تھے ۔خدا جزاءِ خیر دے ۔حضرت تاثیر کو، ان کی توجہ سے یک جا ہو گئے ۔ہم سفارش کرتے ہیں کہ ادبِ اردو کے شایقین اس مجموعہ کو ضرور خریدیں ۔ہمارے علم میں اس سے

بہتر مجموعہ اس وقت اردو میں موجود نہیں۔ تقطیع بڑی ہے۔ قیمت ایک روپیہ یا ایک روپیہ آٹھ آنے، جو کچھ بھی نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ جہانگیر بک کلب (کوچہ) چابک سواراں لاہور''۔ [۵]

(۳)

مصطفائی بک ڈپو رنگ محل لاہور نے مارچ ۱۹۲۷ء کے پرچے میں ایک ''اقبالی کیلنڈر'' شائع کیا تھا۔ اس کا اشتہار مندرجہ ذیل ہے:

اقبالی کیلنڈر بابت ۱۹۲۷ء

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی تصویر سے مزین ہے۔ تصویر کے نیچے کیلنڈر کے اوراق ہیں۔ ہر ورق پر علامہ موصوف کا ایک شعر ہے، جو مہینہ یا موسم کی رعایت سے دیا گیا ہے۔ کیلنڈر خوب صورت اور خوش وضع ہے۔ [۶]

(۴)

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کی یادگار ایک ماہنامہ ''اکبر'' الہ آباد سے تسلیم الدین شرقی بی۔ اے کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ مدیران معاون میں حسین احمد کشفی بی۔ اے، چودھری سید افضال احمد، سید طالب علی طالب الہ آبادی اور اسرار احمد فاضل کے نام شامل تھے۔ ''اکبر'' کے اشتہار کی عبارت یہ ہے:

اراکین انجمن ''دارالادب'' کی نگرانی میں اکتوبر ۱۹۲۵ء سے شائع ہو رہا ہے۔ ''اکبر'' میں ادبی رنگ میں عالمانہ و محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ملک کے مشاہیر شعرا کا منتخب کلام، عہد حاضر کے جذبات نگار انشا پردازوں کے دلچسپ و سلیس مضامین اس کے لیے باعث زینت ہیں۔ تنقید و تبصرہ (اصلی معنوں میں) ''اکبر'' کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ سب سے خاص بات جو ''اکبر'' کو اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر ماہ لسان العصر مرحوم کا کچھ نہ کچھ غیر مطبوعہ کلام یا کوئی خط شائع کیا جاتا ہے۔ [۷]

رسالہ ''شمع'' کے بارے میں معاصرین کی آرا کو ایک اشتہار کی صورت میں شائع کیا گیا تھا۔ مندرجہ ذیل چند آرا سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے:

شمس العلماء خان بہادر نواب سید امداد امام اثر پٹنہ

''حقیقت میں بے مثل رسالہ ۔۔۔ آپ کی ترقی حیات و اقبال کے لیے دعا نکلتی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کی ذات بابرکات تا دیر نفع رساں بنی آدم رہے گی۔ [۸]

علامہ سر شیخ محمد اقبال ایم۔اے، کے۔سی۔آئی۔ای۔بیرسٹرایٹ لا ءلاہور

''رسالہ 'شمع' نہایت دلچسپ ہے۔تاریخی مضامین کی ندرت کے اعتبار سے اس شمع کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

روشن از وے دلّی شب وہم امشب است۔''[9]

انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی مجلّے ''اردو'' نے یوں تبصرہ کیا:

''اس کے اڈیٹر محمد حبیب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور حسن عابد صاحب جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لا آگرہ ہیں۔دونوں صاحب فضیلت اور صاحب ذوق اور پرجوش نوجوان ہیں۔یہ قران السّعدین شاید ہی اردو کے کسی دوسرے رسالے کو نصیب ہو۔قابل اڈیٹروں کی طرح رسالہ بھی ہونہار ہے اور مضامین کی ترتیب اور نوعیت بتا رہی ہے کہ آگے چل کر نام پیدا کرے گا .....ہمیں اس زمانہ میں جب کہ رنگ برنگ کے رسالے جاری ہو رہے ہیں، ''شمع'' کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ صحیح مقاصد ہی کے ساتھ نہیں مگر صحیح عمل کے ساتھ میدان میں آیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔''[10]

حوالے

۱۔ حسن ظہیر جعفری ''جریدہ شمع آگرہ ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۵''، ''قومی زبان'' ۷۷:۵ (مئی ۲۰۰۵ء) ص ۵۷۔۵۸

۲۔ شمع فروری ۱۹۲۶ء ص ۱۳

۳۔ ایضاً، دسمبر ۱۹۲۵ء ص ۱۱۰۔۱۱۱

۴۔ ایضاً ص ۳۹

۵۔ ایضاً، جنوری ۱۹۲۶ء ص ۱۰۸

۶۔ ایضاً، مارچ ۱۹۲۷ء ص ۸۴

۷۔ اشتہار مطبوعہ شمع جون ۱۹۲۶ء ص ۲

۸۔ ایضاً، فروری ۱۹۲۶ء ص ۸

۹۔ ایضاً ص ۸۔۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۔۷

فکاہاتِ جلیس- ایک مطالعہ

ذوالکفل بخاری

بہت دن ہوتے ہیں کہ جب یہ نکتہ ایک مردِ دانا نے ہمیں سمجھایا تھا کہ کالم جس صنفِ سخن کا نام ہے، تمہید باندھ کر لکھنے سے اُس کی جنس تبدیل ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ نوع تک کے بدل جانے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ آج کی اخباری اور جریدی دنیا میں کالم کے نام سے جو کچھ چھپ رہا ہے، اُسے دیکھ کر اِس نکتے پر ہمارا یقین مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ مثالوں سے چیزیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں لیکن مثالیں ''سلبی'' اور ''ایجابی'' دونوں ہی طرح کی ہوتی ہیں۔ کالم نگاری کی ایک اچھی مثال حال ہی میں ہمارے مطالعے میں آئی ہے اور وہ ہیں مرحوم ابراہیم جلیس کے کالم۔ اگر کالم کو ادب اور صحافت کا نقطۂ اتصال مان لیا جائے تو جلیس کے یہ کالم اپنی معنوی قدر و قیمت اور ادبی حیثیت ثابت کرنے میں بہمہ وجوہ کامیاب ہیں۔ اِن کالموں کا اسلوب شگفتہ، مزاحیہ اور فکاہیہ ہے جب کہ اِن کی زبان عوامی ہے، آسان ہے اور بے تکلف ہے۔

بات یہ ہے کہ یہ جو آج کی اردو صحافت میں بہت رونق اور بہت چہل پہل بلکہ صحیح تر لفظوں میں بہت زیادہ رنگ و روغن دیکھا جا رہا ہے، اُس کے مہیا کرنے میں کتنے ہی ادوار و عہود اور کتنی ہی مساعی و جہود کا پس منظری کردار رہا ہے۔ زبان، ادب، سماج اور سیاست کی راہوں سے امکانات اور تغیرات کے کتنے ہی قافلے چلے جنھوں نے صحافت کے کوچے کو آباد کیا۔ کبھی یہ ایک مشن تھی، آج ایک صنعت ہے۔ کبھی یہ بہت سادہ تھی، آج بہت رنگین ہے۔ رنگین ہی نہیں، پُرکار بھی ہے۔ پاکستان بنا تو لاہور ایک بنا بنایا صحافتی مرکز تھا۔ پھر کراچی نے آنکھیں کھولیں۔ اِس ''عروس البحر'' کے خبری و نشری پر پرزے دنوں ہی میں نکل آئے۔ رنگ جم گیا، سماں بندھ گیا، میدان سج گیا اور پھکیت میدان میں اُتر گئے۔ تاریخ نے ورق پلٹ دیا۔ اور پھر وہ سب لوگ نجانے کہاں کہاں سے آتے چلے گئے جنھوں نے ایک نئے عہد کی راہ میں بچھی آنکھوں، صحافت کی آنکھوں میں امید اور امنگ، شوخی اور شرارت، زندگی اور حرارت بھر دی۔ اِنھی بہت سے لوگوں میں ایک نام جلیس کا بھی ہے۔

ابراہیم جلیس کے فکاہیہ کالموں کے مجموعے ''فکاہاتِ جلیس'' میں اِسی زندگی اور اِسی حرارت کے عکس ہیں جو جا بجا اُبھرتے ہیں، سائے ہیں جو جھومتے اور لہراتے ہیں، اور رنگ ہیں جو بکھرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ جلیس کی زندگی اور ملک کی تاریخ کے پچیس سال، ہنگامہ خیز اور بحرانی (یوں کہیے ''فوجداری'' اور ''دیوانی'') اِن کالموں میں محفوظ ہیں۔ کچھ لوگ چیزوں کو محفوظ کرنے کے لیے حنوط کر دیتے ہیں لیکن جلیس کے ہاں ایک اور ہی فن بروے کار لایا جاتا ہے۔ اظہار کا بے ساختہ پن، جو تحریروں کو مرنے نہیں

دیتا۔ایک اقتباس دیکھیے کہ.....

> ہمارے زمانے میں ایسی فلمیں بہت بنتی تھیں جس میں ہیرو ایک نقاب پوش نوجوان ہوا کرتا تھا جو نیک دل بادشاہ کی خوبصورت شہزادی کو بار بار باغی اور بدطینت دیو یا جن کے چنگل سے بچایا کرتا تھا، اور ایسے موقع پر شہزادی یا بادشاہ پوچھا کرتے ''اے بہادر محسن! اپنا نقاب ہٹا کر بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' تو ہیرو کہتا تھا ''وقت آنے پر سب کچھ بتا دیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے پھلانگ، گھوڑے پر سوار، شوں سے غائب۔ مگر سینما ہال میں پبلک چیخ چیخ کر بتاتی تھی ''شہزادی! ہم نے پہچان لیا کہ وہ دلیپ کمار تھا مگر تو نہیں پہچان سکی۔ دُر فٹے منہ تیرا۔'' وقت کے بارے میں پرانی فلموں کا یہ تھیم ڈائیلاگ ہمیں آج کل بار بار اِس لیے یاد آ رہا ہے کہ اِن دنوں نئے شیرِ پنجاب جناب .....، جب بھی جلسۂ عام نما پریس کانفرنس کرتے ہیں تو اُن کا تھیم ڈائیلاگ بھی ہوتا ہے ''وقت آنے پر میں بھی موجودہ حکومت کے سارے راز فاش کر دوں گا۔'' (ص ۱۸۷)

جلیس کے اِن کالموں کے لکھے جانے کا عرصہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۷ء تک کا ہے۔ دسیوں روزناموں اور ہفت روزوں کی کوچہ گردی پر مشتمل اِس کٹھن صحافتی زندگی کا حاصل یہ کالم ہیں جنھیں جواں سال اور جواں ہمت محقق ڈاکٹر انتیاز بلوچ نے اخباری اور جریدی فائلوں کے قبرستانوں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر یکجا کیا، مرتب کیا اور پھر اِن میں ''کتابی روح'' پھونک دی۔ فراموش گاری کی گرد صاف ہوتے ہی بے شمار تخلیقی جملے، تمثیلیں، طنز پارے، اور مزاح نامے اپنی اصل جون میں واپس آ گئے۔

جلیس بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ اُن کا یہی پس منظر اور تربیت و ریاضت اُنھیں گرد و پیش کے مناظر و مظاہر اور حالات و واقعات کو تمثیلی اور علامتی پیرائے میں پیش کرنے کی ایک خاص مہارت فراہم کرتی ہے۔ اِس مہارت کے ثبوت کے طور پر شاید اُن کا ہر دوسرا کالم پیش کیا جا سکتا ہے۔ اِس سلسلے کی غیر معمولی مثال وہ نو (۹) کالم ہیں جو اُنھوں نے یکے بعد دیگرے۔ یعنی تابڑ توڑ۔ ۱۹۷۶ء کے اوائل میں لکھے۔ اُس وقت کی سیاسی صورتِ حال کو Allegorize کرنے کے لیے جلیس نے جنگلی اور حیوانی ''امیجری'' کا اِن کالموں میں خوب خوب استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں .....

> صبح نو بجے سے چھانگا کے جنگل میں جانوروں کے اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی جلسہ گاہ کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ جانوروں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں سے مندوبین اِس کونسل میں نہ پہنچے ہوں۔ جلسہ گاہ کے ڈائس پر مشہور مصور پکاسو کے پالتو بندر موسیو سیپانزی کا بنایا ہوا انسان کا ایک ایسا سکیچ تھا کہ اُس سے سانپ بچھو چمٹے تھے۔ گھوڑے گدھے اُس پر دولتیاں چلا رہے تھے اور شیر ببر، چیتے اور تیندوے ہر چہار سمت سے اُس پر جست لگا رہے تھے۔ اور چیل، کوے اور گدھ اُس کے سر پر باری باری ٹھونگیں لگا رہے تھے۔ اور تو اور کتا جو انسان کا وفادار ازلی غلام تھا، وہ بھی ایک دم فرنٹ، اُس پر بھونک رہا تھا۔
>
> مزے کی بات تو یہ تھی کہ جلسہ گاہ میں مہمانوں اور مبصرین کے لیے ایک الگ انکلوژر بھی تھا جس

میں آدم کی نا خلف اولاد یعنی اسمگلر، چور بازار تاجر، ناجائز منافع خور دکان دار، ہر دوسرے تیسرے مہینے کرایہ بڑھانے والے اور بار بار اڈوانس گپڑی طلب کرنے والے لالچی بے مروت مالکانِ مکان، مسافروں کو کم سے کم آرام اور اُن سے زیادہ سے زیادہ کرایہ بٹورنے والے مالکانِ بس و منی بس اور ٹیکسی ورکشہ ڈرائیور، رشوت خور ملازمینِ سرکار، دودھ میں پانی ملانے والے گوالے، گوشت میں چھیچھڑے ملانے والے قصائی، گھی میں موبل آئل ملانے والے گھی فروش، آٹا چینی چاول میں برادہ ملانے والے راشن مرچنٹ، ماں بہن بیوی اور بیٹی کی آبرو بیچنے والے بے غیرت دلال، قوم و ملک بیچنے والے عوام دشمن، سامراج کے پٹھو ڈکٹیٹر ڈٹے بیٹھے تھے۔ اِن میں صاف طور پر پہچانے جانے والوں میں کمبوڈیا کے مارشل لون نول، جنوبی ویت نام کے جنرل تھیو اور مارشل کاؤ، جنوبی افریقہ کی گوری اقلیت کے انسان دشمن وزیرِاعظم اسمتھ اور اسرائیل کے انسان نما درندے وزیرِاعظم مسٹر رابن نمایاں تھے۔(ص ۳۲۳)

سب سے زیادہ دلچسپ مسئلہ یہ تھا کہ شیر اور بکری ایک ساتھ، ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ اِس عجیب و غریب منظر کو دیکھ کر ایک اخبار نویس نے بڑی حیرت سے دوسرے سے کہا ''پُرامن بقائے باہمی کا اِس سے بہتر ثبوت اور کیا مل سکتا ہے کہ ایک بکری ایک شیر کے ساتھ یوں بے خوف و خطر بڑے اطمینان سے شانہ بشانہ بیٹھی ہے۔'' تو دوسرے اخبار نویس نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا ''ارے یہ کوئی نیا نظارہ نہیں ہے۔ ایسا تو میں نے نیو کراچی کے زوالوجیکل گارڈن بلکہ اہلِ کراچی کی عام سیرگاہ ''گاندھی گارڈن'' میں بھی دیکھا ہے۔ وہاں بھی ایک شیر کے پنجرے میں ایک بکری مدتوں سے رہتی ہے اور ابھی زندہ سلامت ہے۔'' اخبار نویس کی یہ گفتگو سن کر شیر کے ساتھ بیٹھی ہوئی بکری کو بڑا غصہ آیا اور اُس نے دونوں فوٹو گرافروں کو ڈانٹا ''اے بے خبر اخبار والو! میں تمھیں گاندھی گارڈن میں شیر اور بکری کے نام نہاد پُرامن بقائے باہمی کا راز بتاتی ہوں کیونکہ میرے خاندان کی کئی بکریاں اِس نام نہاد پُرامن بقائے باہمی کی جھوٹی نمائش کے لیے اِس شیر کے پنجرے میں موت کے گھاٹ اتر چکی ہیں۔ تمھاری یہ اطلاع غلط ہے کہ اُس شیر کے پنجرے میں ایک بکری مدتوں سے رہتی ہے اور ابھی تک زندہ سلامت ہے۔ راز کی بات تو یہ ہے کہ دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے اُس پنجرے میں روز علی الصبح ایک نئی بکری باندھی جاتی ہے۔(ص ۳۲۶)

''فکاہاتِ جلیس'' میں ڈاکٹر امتیاز بلوچ نے کوئی دوسو (۲۰۰) کے لگ بھگ کالم یکجا کیے ہیں۔ اِسے ہم جلیس کے کالموں کا ایک نمائندہ انتخاب قرار دے سکتے ہیں۔ پیروڈیاں، لطیفے، تضمینیں، پنجابی لوک گیتوں کے چست و برجستہ مصرعے، بعض نادر روزمرے اور محاورے۔ کتنی ہی سوغاتیں ہیں، جنھیں اِس انتخاب نے آج کے قاری کی حدِ رسائی میں لا کھڑا کیا ہے۔ اِس موقع پر فاضل مرتب و مدون کے انتخاب و ترتیب کے ذوق اور محنت کی داد نہ دینا نا اِنصافی ہے۔ خصوصاً اُس طول طویل مقدمے کے لیے بھی

جناب مرتب لائقِ داد ہیں کہ جسے اِس کتاب کی کلید کہنا چاہیے۔ یہ جلیس کی شخصیت، فن اور زندگی کا ایک طویل مختصر جائزہ ہے۔ جلیس کے بعض نقادوں کا احساس ہے کہ اُن کی کالم نگاری کے آخری دور (۱۹۷۷ء-۱۹۶۷ء) میں، اُن کے اسلوب میں کچھ ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں جنھوں نے اُن کے فن کو نقصان پہنچایا۔ ڈاکٹر امتیاز بلوچ نے اپنے مقدمے میں نقادوں کی اِس رائے سے اختلاف ضرور کیا ہے لیکن کسی بھی تفصیل یا تجزیے سے گریز کرتے ہوئے۔ ہمارے خیال میں جلیس کے اسلوب کے بارے میں اِس رائے میں خاصا وزن ہے۔ کتاب کے مندرجات اِس کی تائید کرتے ہیں۔ اپنی کالم نگاری کے آخری دور میں جلیس ایک ''کامریڈ'' نظر آتے ہیں، جس کے گرد و پیش کی دنیا میں صرف دو طرح کے انسان بستے ہیں: بورژوا اور پرولتاری۔ بورژوا کے لیے اُن کا طنز براہِ راست اور تلخ ہو جاتا ہے۔ اِس میں تمسخر، تضحیک اور استہزا کے رنگ بھی جھلکنے لگتے ہیں۔ اُن کے اندر کا ''صحافی'' حقائق و مظاہر کے کسی گہرے تجزیے کا متحمل ہی نہیں ہے بلکہ وہ ''تازہ'' خبروں پر تبصرے سے کالم بناتا چلا جاتا ہے۔ اِس ''تبصرے'' میں فوری ردِعمل، جذباتی ابال، غم و غصہ، بے بسی کا احساس- سبھی کچھ شامل ہے۔ ایسے میں مزاح کی شگفتگی ناپیدا اور طنز کی بے ساختگی مجروح ہوتی ہے، اور بار بار ہوتی ہے۔ البتہ یہ صورتِ حال بعض دلچسپ داخلی تضادات کے نمایاں ہونے کا سبب بھی بنتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ ''رجعت پسندوں'' کے بارے میں اپنے رویّے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> وہ مجھے یا میرے رسالے کو برا سمجھا کریں، میں اُن کو برا نہیں سمجھتا۔ یہ لوگ با اَخلاق ہوتے ہیں۔ اِن کی سب سے اچھی خصوصیت یہ ہے کہ اِنھیں خریدا نہیں جا سکتا۔ مگر سیاست میں وہ نہ صرف رجعت پسند ہیں بلکہ اِن کا رول آمرانہ یا ہٹلرانہ ہے۔ اِن سے میرا بس اِتنا ہی اختلاف ہے کہ وہ جمہوریت کی بجائے آمریّت کے پرستار ہیں۔ (ص ۳۶۱)
>
> اِس موقع پر جلیس اپنے ایک قاری کا یہ اعتراض بھی نقل کرتے ہیں کہ ''ترقی پسند دوست آپ سے ناراض ہیں کہ آپ ایک آمرانہ حکومت کی حمایت کرتے ہیں اور بِک چکے ہیں'' اور جواباً لکھتے ہیں..... ''آپ نے جن ترقی پسند ساتھیوں کا نام لکھا ہے اُن کا کام صرف دوسروں پر اعتراض کرنا ہے۔ میں تو چلیے عوام کے ووٹوں سے منتخب پاکستان کی پہلی عوامی حکومت کے ہاتھوں بکا ہوا ہوں، یہ لوگ تو چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں، بنیوں، بقالوں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ اِن پر لعنت بھیجیے۔'' (ص ۳۶۲)

یہی وہ دوٹوک پنا (bluntness) ہے، جس سے اُن کے ضمیر، اُن کے شفاف تخلیقی باطن، اُن کی سچی فن کارانہ کمٹ منٹ کا سراغ ملتا ہے- بقول یگانہ ''چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا''! اگر انگریزی محاورے کا سہارا لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ dictates of conscience پر dictates of comrade کے غالب آ جانے سے جلیس کے ہاں تخلیقی سطح پر وہ سب مسائل پیدا ہوئے جن کا اِدراک تو شاید اُنھیں خود بھی تھا، مگر تدارک یقیناً اُن کے بس میں نہیں تھا۔

نعت گویانِ سرگودھا

(عقیدت نبویؐ کی شمعِ فروزاں)

مبصر: ڈاکٹر انور سدید

شاہینوں کا شہر سرگودھا میرے بچپن کی ابتدائی یادوں کا مرکز و محور ہے۔ میری پیدائش ۱۹۲۸ء میں دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر آباد قصبہ میانی میں ہوئی تھی، لیکن ہوش کی آنکھ کھلی تو سرگودھا آباد ہو چکا تھا۔ میں نے اس شہر کے مدرسوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پرائمری درجے میں ماسٹر ہاشم الدین (جو ممتاز اقبال شناس مرزا محمد منور کے والد گرامی تھے)، مولوی محمد بخش (معروف شاعر خالد اقبال یاسر کے نانا) اور مرزا عبدالحمید نے ادبی تربیت کی۔ آزادی سے پہلے سرگودھا بیس بلاکوں پر مشتمل چھوٹا سا جدید شہر تھا، جس میں مسلم، ہندو، سکھ اور عیسائی اقوام کے لوگ آباد تھے۔ میں نے زندگی کا تشکیلی دور سرگودھا میں گزارا ہے اور یہ میرا وطن ہے۔ ۱۹۶۶ء میں عصمت علیگ نے ماہنامہ ''اردو زبان'' جاری کیا تو میں نے اس کے ابتدائی پرچوں میں اپنی یادداشت سے سرگودھا کا تاریخی احوال ''برسبیل سرگودھا'' کے عنوان سے لکھا لیکن نہر لوئر جہلم کی تعمیر اور سائیں گودھا کے تالاب سے آگے تاریخ کی بازیافت نہ کر سکا۔ جناب شاکر کنڈان کی کتاب ''نعت گویان سرگودھا'' ملی تو انہوں نے اس شہر سے میرا پہلا تحقیقی تعارف کرایا اور بتایا کہ اسے ایک انگریز کالونی افسر مسٹر ینگ (Young) نے ۱۹۸۸ء میں ایک روپیہ فی ایکڑ زمین لے کر آباد کیا تھا۔ اس کا ابتدائی نام ''ینگ آباد'' تھا۔ لیکن لوگوں کی زبان پر ''گودھے کا سر'' چڑھا ہوا تھا جو بعد میں سرگودھا معروف ہوا۔ (اس شہر کی تاریخ صاحبزادہ عبدالرسول نے لکھی ہے جو سرگودھا کے استاد الاساتذہ ہیں)۔

جناب شاکر کنڈان نے اس نوآباد شہر سے تین سو اکاون (۳۵۱) ایسے عقیدت مند ان نبیؐ کی بازیافت کی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے نعت کہنے کی سعادت عطا فرمائی۔ مجھے یاد ہے کہ جناب اخلاق عاطف نے ایک نعتیہ مجموعہ ''جان رحمت'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا، اس کتاب نے محمود احمد اسیر کے ذوق تحقیق کو مہمیز کیا اور انھوں نے ''مولانا صلاح الدین احمد'' پر پی ایچ ڈی کی سطح کا مقالہ لکھنے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری پانے سے پہلے ''سخنوران سرگودھا'' کے نام سے ایک تذکرہ مرتب کیا تھا۔ اس علاقے کے شعرا کے کچھ کوائف اور حالات ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، جناب پروفیسر بدر منیر اور ملک جاوید گجیرہ صاحب نے بھی شائع کیے تھے۔ جناب شاکر کنڈان نے اس پورے علاقے کو ''سرگودھا'' شمار کیا اور نعت نگاروں کی تخلیقات اور حالات کی تحقیق کی۔ چنانچہ اب ''نعت گویان سرگودھا'' کے نام سے ایک ایسی کتاب معرض وجود میں آ گئی ہے جو سرگودھا کی تاریخ بھی ہے اور اس میں نعت نگاروں کے ساتھ ان شخصیات کا تذکرہ بھی سما گیا ہے جنھوں نے اس سرزمین کو اپنے قیام کی سعادت عطا فرمائی۔ ان علمائے دین میں مولوی احمد الدین بگوی، مولانا غلام مرتضیٰ (چھرلی شریف) مفتی محمد یار خلیق، خواجہ محمد الدین سیالوی، مولانا فقیر اللہ خوشابی، مولانا ثناء اللہ

امرتسری، مولانا فتح الدین ازہر، مولوی کرم الدین ازہر، حضرت پیر کرم شاہ الازہری اور ڈاکٹر ظہور احمد اظہر جیسی شخصیات شامل ہیں جن کے حالات حیات تلاش کرنا شاکر کنڈان کا کارنامہ ہے۔

جناب شاکر کنڈان نے اس ضخیم کتاب کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں وہ نعت نگار ہیں جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ آغاز شاہ ابوالمعالی غربتی سے ہوتا ہے جو ۱۵۵۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۱۶ء میں وفات پا گئے۔ ان کے حالات سکینۃ الاولیاء، دربار علیؑ اور تاریخ بھیرہ میں درج ہیں۔ اپنے پیر کے روحانی ارشاد پر لاہور آئے اور یہیں واصل بحق ہوئے۔ شاہ ابوالمعالی روڈ ان کے نام سے موسوم ہے۔ ان کی نعت نگاری کا نمونہ پنجابی زبان میں درج کیا گیا ہے۔ اس باب کے آخری شاعر شاہد راہی ہیں جو ۲۵ مارچ ۱۹۶۸ء کو چک نمبر ۲۲ شمالی میں پیدا ہوئے اور ۲۰۰۱ء میں فوت ہو گئے۔ ان کی نعت کا مطلع یہ ہے:

یثرب نہ کہے کوئی آقا کے مدینے کو　　جنت کا کہو ٹکڑا، رحمت کے خزینے کو

یہ حصہ اس لیے نوادرات کا ذخیرہ شمار کیا جا سکتا ہے کہ اس میں حافظ برخوردار، حضرت سلطان باہو، مولوی دلپذیر اور میاں اللہ یار جیسے بزرگوں کی نعتیں پیش کی گئی ہیں جو انیسویں صدی تک کے قدیم شعرا ہیں۔ بیسویں صدی میں رحلت پانے والے شعرا محمد حسین شوق، سید وزیر شیرازی، حافظ یوسف آزاد، جوہر نظامی، فیض لدھیانوی، عبدالرشید اشک، اخگر سرحدی، الطاف مشہدی، اقبال منظر، مرزا محمد منور، حسن اختر جلیل، جمال احسانی، رشک ترابی، واصف علی واصف اور عزیز علوی صاحب سے تو اس ناچیز انور سدید کو بھی نعتیں سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس حصے میں شاکر کنڈان نے متعدد گمنام شعرا کو تجدید حیات سے سرفراز کر دیا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں عہد حاضر کے ان شعرا کا تعارف کرایا گیا ہے جو اس وقت حیات ہیں یا کتاب مرتب کرتے وقت زندہ تھے۔ آخری جملہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے وقت جناب احمد ندیم قاسمی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، خلیل بدایونی، شبلی پانی پتی رحلت فرما گئے ہیں۔ اسے آپ جدید نعت کا دور بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کے بیشتر نعت نگار اب اکیسویں صدی میں بھی سرگرم سخن اور نعت نگاری میں اپنی عقیدت کے چراغ روشن کر رہے ہیں۔ چند نام یہ ہیں شہنشاہ الفاظ علامہ چودھری اصغر علی کوثر وڑائچ، حسن واسطی، نصرت چودھری، پرویز بزمی، ظہیر الدین ظہیر، سلطان علوی، شفیع ضامن، آفتاب راجا، ڈاکٹر خورشید رضوی، ریاض احمد شاد، بیدار سرمدی، اصغر شامی، شاہد بخاری، کامران رشید، خالد اقبال یاسر، ممتاز عارف، ہارون الرشید تبسم، محمود اسیر، اخلاق عاطف، زاہد منیر عامر، شرف حسین انجم اور ارشد ملک۔ یہ کتاب شعرا کی دستیاب تاریخ پیدائش کے لحاظ سے ترتیب دی گئی۔ اس حصے کے آخری شاعر کا نام محمد وقاص قریشی ہے جن کی تاریخ پیدائش ۱۹۸۷ء درج ہے۔ مرتب نے ان سے ملاقات یکم فروری ۲۰۰۶ء کو کی اور ان سے جو نعت حاصل کی اس کا ایک شعر یہ ہے:

ہماری آنکھ ہری خاک کو ترستی ہے　　ہمارے قلب میں مدحت ہے ان ہواؤں کی

کتاب کے آخری حصے کا عنوان ''کچھ خواب سے چہرے'' ہے اور اس میں ایسے نعت نگاروں کو شامل کیا گیا ہے جو

دوسرے شہروں سے سرگودھا میں آئے اور کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد کسی دوسرے مقام پر چلے گئے۔اس حصے میں زیادہ نام ملازمت پیشہ شعرا کے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے سرگودھا کے ادبی افق کو روشن کیا اور نعتیہ عقیدت نگاری میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔چند نام حسب ذیل ہیں:

جسٹس ایس اے رحمان، فیض احمد فیض، رحمٰن کیانی، ڈاکٹر صفدر حسین، رفعت سلطان، غلام رسول ازہر، انجم نیازی، یونس خیال، این اے صوفی، مرتضیٰ برلاس، فخر الدین بلے، تنویر صہبائی، فیاض تحسین، شہزاد احمد، رشید قیصرانی، منظر مفتی وغیرہ۔

صداقت یہ ہے کہ اس حصے کے بیشتر شعرا اردو ادب میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور پورے پاکستان کا وقار ہیں۔شاہینوں کے شہر سرگودھا میں ان کا قیام عارضی تھا لیکن انہوں نے اپنی نعت نگاری سے اس شہر کی فضاؤں کو معطر کیا۔جناب شاکر کنڈان نے انہیں یاد رکھا ہے تو ایک اہم ادبی فریضہ ادا کیا ہے۔فیض احمد فیض کی فارسی نعت کا مطلع یہ ہے:

اے تو کہ ہست ہر دلِ محزوں سرائے تو　　آوردہ ام سرائے دگر از برائے تو

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے مؤلف شاکر کنڈان کا تعارف بھی کرا دیا جائے۔

شاکر کنڈان کا ادبی طلوع تو سکول کے زمانے میں ہی ہو گیا تھا۔کنڈان ان کے مرزبوم کا نام ہے لیکن پائے نسبتی کے بغیر اب یہ ان کے نام کا جزو ہے۔بعض لوگ اسے ان کا تخلص بھی قرار دیتے ہیں۔وہ جون ۱۹۵۱ء میں پیدا ہوئے۔۱۹۷۱ء میں عسکری ملازمت اختیار کی اور ۲۰۰۱ء میں ریٹائرمنٹ لے لی۔ان کا فطری رجحان شاعری کی طرف تھا۔لیکن انہوں نے تحقیق کو بھی اپنا امتیازی وصف بنایا اور ''اردو ادب اور عساکر پاکستان'' کے عنوان سے تین جلدوں میں ایک گراں مایہ کتاب لکھی۔''آشوب زیست'' اور ''رفاقتوں کے وسیلے'' ان کی شاعری کے مجموعے ہیں، ان کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست طویل ہے۔چند نام یہ ہیں۔ ''کراچی کے نعت گو شعرا''۔''سندھ کے نعت گو''۔''جادۂ شوق و محبت (سفرنامہ)''۔''چلتے صحراؤں میں'' (اردو ماہیا)۔''مضامیچے (مضامین)''۔ ''وجدان کی آنکھ (نثر پارے)''۔ انہوں نے اپنی زندگی میں دو حج کیے اور متعدد عمروں کی سعادت حاصل کی۔ ان دنوں ''عقیدت'' کے نام سے ایک دینی پرچہ شائع کر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی شاعری، مقالہ نگاری، نعت نویسی اور تحقیق و تنقید میں بھی رواں ہیں۔سرگودھا کے ادبی افق پر ڈاکٹر وزیر آغا، الطاف مشہدی، غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر خورشید رضوی، سجاد نقوی، انور گوندی، عبدالرشید اشک، جوہر نظامی، سلیم آغا قزلباش، افگر سرحدی کے نام تابناک ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں لیکن اب اس مطلع ادب کو روشن کرنے والوں میں شاکر کنڈان بھی شامل ہو گئے ہیں تو ان کے کام کی تابانی دور دور تک پھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ''نعت گویان سرگودھا'' بلاشبہ ان کا کارنامہ ہے۔اگر سرکاری ایوارڈ میرٹ پر دیئے جائیں تو میں ان کے لیے ''ستارۂ امتیاز'' تجویز کرتا۔اور اب انہیں ایک ہزار ایک مبارکبادیں پیش کرنے کے ساتھ دعا کرتا ہوں۔

''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''

بلاشبہ شاکر کنڈان نے ثابت کر دیا ہے کہ شاہینوں کا شہر سرگودھا نبی اکرم ﷺ کی عقیدت نگاری میں شمع فروزاں لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔

مختصر تبصرے

اسد ملتانی کی حمد و نعت کی کتاب ''مشارق''

مبصر: ڈاکٹر انور سدید

اسد ملتانی اردو کے ایک قادر الکلام شاعر تھے، انہوں نے ہر صنف میں شاعری کی اور اپنے عہد کے ممتاز ادیبوں سے داد پائی۔ المیہ یہ ہوا کہ شہرت سے بے نیاز اس شاعر نے جو ملتان کے ادبی افق سے مہر تاباں کی طرح طلوع ہوا تھا اور جس نے مطلع ادب کو آخری سانس تک تابناک اور منور کیے رکھا، اپنی شاعری کا مجموعہ چھپوانے کی طرف توجہ نہیں دی۔ رسائل کے اوراق سے اب ان کی بازیافت جناب پروفیسر جعفر بلوچ کر رہے ہیں۔ زیر نظر ان کی حمدوں اور نعتوں کا مجموعہ ''مشارق'' ہے۔ جو ایک طرف اسد ملتانی کی دینی حمیت، اللہ کی وحدانیت پر ایمان اور نبی اکرم کی عقیدت کا مظہر ہے تو دوسری طرف یہ حمدیں اور نعتیں آج کے انسانوں کے دلوں کا زنگ اتارنے اور دل کے تار ہلانے میں معاونت کرتی ہیں۔ اسد ملتانی کی شاعری کی داخلی موسیقی اور موضوعی حسن میں قاری بہتا چلا جاتا ہے۔ اہل ادب پروفیسر جعفر بلوچ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے نعت و حمد کی یہ نایاب کتاب مرتب کی۔ کتاب کی ضخامت ۱۳۶ صفحات، قیمت ۱۰۰ روپے۔ ملنے کا پتہ: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور

جاوید اختر بھٹی کی کتاب ''اردو ہندی تاریخ''

مبصر: ڈاکٹر انور سدید

جاوید اختر بھٹی ملتان کے ایک ایسے نوجوان ہیں جنہیں لسانیات میں گہری دلچسپی ہے۔ وہ ایک لمبے عرصے سے اردو اور ہندی کے تاریخی تنازعے پر تحقیق کرتے رہے ہیں اور اب اس تحقیق کا حاصل انہوں نے ''اردو ہندی تاریخ'' کے نام سے ایک کتاب میں پیش کر دیا ہے۔ عرصہ ہوا اس موضوع پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی ایک کتاب شائع کی تھی۔ جاوید اختر بھٹی نے اس تنازعے کی تجدید اس طرح کی ہے کہ اردو کی ادبی اور سیاسی اہمیت کو زمانی اعتبار سے ہندی کے مقابلے میں اجاگر کر دیا ہے۔ اہم بات یہ کہ انہوں نے دونوں زبانوں کی اہمیت کو مقامی ضرورتوں کے مطابق متعین کیا ہے اور تنازعہ کو ابھارنے کی بجائے قاری

کو اپنا فیصلہ غیر جانبداری سے کرنے کی دعوت دی ہے۔ کتاب کی ضخامت ۱۴۴ صفحات اور قیمت ۱۲۰ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور۔

غالب کی بعض تصانیف

مبصر: ڈاکٹر انور سدید

آنجہانی کالی داس گپتا رضا کو غالبؔ سے جو عقیدت اور محبت تھی، اس کی مثال برصغیر پاک و ہند میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ان کی غالب کے سلسلے میں سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ غالب کے نایاب مضامین، خطوط اور تصانیف کا سراغ لگایا اور انہیں منظر عام پر پیش کر دیا۔ غالب کے دیوان کی ترتیب وار تحقیق ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ زیر نظر کتاب ''غالب کی بعض تصانیف'' میں انہوں نے ''غالب کی زندگی میں مطبوعات غالب''۔۔۔ ''غالب کی متنازعہ رباعی پر ایک نظر''۔۔۔ ''پنج آہنگ کے چند اہم نسخے''۔۔۔ ''غالب کی زندگی میں مہر نیم روز کی اشاعتیں''۔۔۔ ''دعائے صیام''۔۔۔ ''غالب کے ایک قطعے کی اولیں شرح'' جیسے مضامین میں اپنی تحقیق کا نادر ثبوت دیا ہے۔ یہ مطالعہ غالب میں بنیادی نوعیت کی کتاب ہے جس کے لیے اردو دنیا کالی داس گپتا رضا کی ہمیشہ ممنون احسان رہے گی۔ افسوس کہ جب یہ کتاب پاکستان میں چھپی تو غالب کا یہ دیوانہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ کتاب کی ضخامت ۱۵۴ صفحات اور قیمت ۱۲۰ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، گلشن اقبال، کراچی

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی کتاب ''انتخاب زرّیں۔ اردو نظم''

مبصر: اورنگ زیب نیازی

مختلف شعری و نثری اصناف کے انتخاب مرتّب کرنا ایک صحت مند اور کارآمد ادبی سرگرمی ہے۔ یہ محض مختلف تخلیقات کو یکجا کر دینے کا نام نہیں بلکہ اس کی مدد سے کسی خاص ادبی تحریک، نظریہ، رجحان اور نقطۂ نظر کا مربوط مطالعہ بھی ممکن ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کچھ عرصہ سے شعری انتخاب مرتّب کرنے کی ایک رو چلی ہوئی ہے۔ ہر مرتّب اپنے ذوق کے مطابق انتخاب ترتیب دیتا ہے اور ناشرین تجارتی بنیادوں پر ایسے انتخاب دھڑا دھڑ شائع کرتے چلے جا رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب ''انتخاب زرّیں۔ اردو نظم'' بھی ایک انتخاب ہے لیکن یہ نظموں کے عام انتخابات سے قطعی مختلف ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس انتخاب کے مرتّب اردو کے معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ انتخاب جن اصولوں، معیارات اور تحقیقی بنیادوں پر مرتّب ہوا ہے انہیں بالعموم انتخابات میں مدِّنظر نہیں رکھا جاتا۔ کتاب کے دیباچے میں خواجہ صاحب نے اپنی ترجیحات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق انھوں نے نظموں کے انتخاب کے وقت نظم کے جدید تصور کو سامنے رکھا ہے۔ یعنی ایسی صنف شاعری جس میں شروع سے آخر تک کوئی ایک مرکزی خیال پایا جائے۔ اس لیے بعض

قدیم شعری اصناف مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ کو اس انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا۔ نثری نظم کا نظم ہونا تا حال زیر بحث ہے اس لیے اس مجموعے میں نثری نظمیں بھی شامل نہیں۔ دکنی دور کی ایسی نظمیں جو مختلف شعرا سے منسوب ہیں لیکن ان کا سن تخلیق معلوم نہیں اور انتساب مشکوک ہے وہ بھی اس مجموعے میں شامل نہیں کی گئیں۔ دوسری طرف بعض مسلسل غزلوں کو جو ہیئت کے اعتبار سے غزل لیکن تسلسلِ بیان کی وجہ سے نظم کے قریب ہیں، اس مجموعے میں جگہ دی گئی ہے۔

اس مجموعے میں ۱۱۰ شعرا کی ۲۱۴ نظمیں شامل ہیں۔ ہر شاعر کے مختصر حالات زندگی بھی دیے گئے ہیں۔ شعرا کی فہرست کا آغاز قلی قطب شاہ سے ہوتا ہے اور حالی، اقبال، حفیظ جالندھری، ن۔م راشد، فیض احمد فیض، مجید امجد سے ہوتا ہوا پروین شاکر اور شبیر شاہد پر آ کر ختم ہوتا ہے۔

شعرا کی فہرست میں کلاسیکی عہد کے شعرا کے علاوہ اصلاحی تحریک، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقۂ ارباب ذوق اور جدید رجحانات کے حامل شعرا بھی شامل ہیں۔ کلاسیکی شعرا کے بارے میں عام تاثر اور ان کی مقبولیت غزل کے حوالے سے ہے۔ مرتب نے قلی قطب شاہ، ولی، سودا، میر، مصحفی، انشا، غالب، مومن اور دوسرے شعرا کی نظمیں شایع کر کے قارئین کو ان کی ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔

اردو نظم نے کئی کروٹیں بدلیں۔ کئی ہیئتیں تبدیل کیں۔ بالآخر مثنوی کی ہیئت سے آزاد اور نثری نظم تک پہنچی۔ یہ کتاب صرف نظم کا انتخاب نہیں، اردو نظم کے ارتقاء کی داستان ہے۔ اور ہماری اصناف سخن میں سے، بقول ڈاکٹر وزیر آغا، نظم ہی ایسی صنف ہے جس کو لے کر ہم عالمی ادب کی رو میں شامل ہو سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا یہ انتخاب اس قول کی صداقت ثابت کرتا ہے۔ اگر اس کتاب کا ترجمہ عالمی زبانوں میں ہو جائے تو یقیناً اردو ادب کے تعارف، اہمیت اور وقار کا باعث بنے گا۔ نصابی سطح پر اردو نظم کا مطالعہ کرنے والے طالب علموں کے لیے بھی یہ کتاب ایک اہم دستاویز ہے۔

ڈاکٹر خواجہ صاحب نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ادبی اصناف کے انتخابات کی پہلی کڑی ہے۔ توقع کرنی چاہیے کہ وہ دوسری اصناف کا انتخاب بھی اسی معیار کا پیش کریں گے۔

سنگت پبلشرز لاہور سے شایع ہونے والی اس کتاب کے کل صفحات ۳۵۰ اور قیمت ۳۰۰ روپے ہے۔

ایاز صدیقی کی شعری کی کتاب ''نقد ہنر''

مبصر: اورنگ زیب نیازی

''نقد ہنر'' ایاز صدیقی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ وہ معروف شاعر حزیں صدیقی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کی ادبی تربیت میں رہتک کے طرحی مشاعروں اور بعد ازاں ملتان کی ادبی محفلوں کا خاص کردار رہا ہے۔ ان کے ہاں وہ پختگی اور چاشنی

ان کی ریاضت کی وجہ سے در آئی ہے جو انھیں عام غزل گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

غزل کے شاعر کے لیے روایتی اسلوب اور ڈکشن سے پہلو بچانا اور جدت کی راہ اختیار کرنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ایاز صدیقی کا اسلوب روایتی ضرور ہے لیکن ان کا آہنگ جدت سے ہم کنار ہے۔انہوں نے غزل کے پامال موضوعات سے حتی الوسع بچ کر چلنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔عشق غزل کا بنیادی اور قدیم موضوع ہے۔ایاز نے عشق کے موضوع کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس میں ایک نئے ذائقے اور تازگی کا احساس ابھر آیا ہے۔

- دنیا کی سمت کیسے پہنچتا مرا خیال
تیرے خیال سے مجھے فرصت ہی کب ہوئی

- تھے اس کے خدوخال میں فطرت کے سبھی رنگ
وہ رشکِ غزالاں مرے دیواں کی طرح تھا

ایاز صدیقی نے اپنی غزل کو عشق یا دوسرے بندھے ٹکے موضوعات تک محدود نہیں رہنے دیا۔کسی قدر روایتی اسلوب اور ڈکشن کے باوجود ان کے ہاں موضوعات کا تنوع سلسلہ در سلسلہ موجود ہے۔وہ کھلی آنکھ سے اپنے گرد و پیش کو دیکھتے ہیں اور ان کا دل جبر، استحصال، معاشرے کی سرد مہری، منافقوں اور دوہرے معیارات پر کڑھتا ہے۔ان کا احساس جمال، عصری مسائل کے بیان کو نعرہ نہیں بننے دیتا بلکہ سہل ممتنع نمایاں ہوتا ہے۔

- پہلے خدا کے قہر سے ڈرتا تھا آدمی
اب قہر آدمی سے ڈرانے لگے ہیں لوگ

- تیرے اکرام کا جواب نہیں
جس کو دیکھو وہی سوالی ہے

ایاز صدیقی نے اشعاروں اور تشبیہوں کے نئے پیکر تراشے ہیں۔صنائع لفظی و معنوی کے استعمال کے باوجود شعر کے مقصد اور حسن کا فوت نہیں ہونے دیا۔

بزم تخلیقِ ادب پاکستان، کراچی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اس کتاب کے صفحات ۱۴۲ اور قیمت ۲۰۰ روپے ہے۔

خطوط مشفق بنام ڈاکٹر طیب منیر

مبصر: محیط اسماعیل

اردو ادب کے ہزاروں ناظرین کے علاوہ بے شمار اہلِ اردو مشفق خواجہ صاحب کے نام نامی سے خوب آگاہ ہیں کہ محترم نے ساری عمر تحقیق ونقد میں گزار دی۔ وہ شاعر پیدا ہوئے لیکن اپنے شاعر ہونے کا کہیں کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اپنے شاعرانہ لوازمات وحسیات کا سودمند حصہ بھی اپنے تدوینی وتالیفی صحت کو بہم پہنچاتے رہے۔ خط کتابت ان کی اہم مصروفیات کا لازمی حصہ تھی، گویا عمر عزیز کا ایک چوتھائی حصہ مکتوب نگاری میں صرف کیا اور یہ شعبہ ان کے مختلف النوع ادبی کارناموں کی تکمیل کے واسطے بہ ہر صورت ضروری بھی تھا۔ علمی ادبی کتب نایاب ہوں، کم یاب ہوں، زیرِ ترتیب یا زیرِ طبع: حصول وفراہمی کے ضمن میں موضوع سے متعلق بیسوں افراد سے ان کی خط کتابت رہی، نامے بے شبہ سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ انتقال کے بعد سے اب تک ایک سے زیادہ مجموعے اور ادبی جرائد نے خاصی تعداد میں نامے پیش کیے ہیں اور خواجہ صاحب کا ہر نامہ خواہ کسی کے نام ہو، پڑھنے، غور کرنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس ناظر نے خواجہ صاحب کا ایک بھی کالم دیکھا ہو، وہ مطلع ہو کر مکتوبات ملاحظہ کرنے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایک ایک نامے سے ان کی کڑی مصروفیات کی کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں۔ کوئی شخص خواجہ صاحب کی سوانح عمری مرتب کرنے بیٹھے تو ان کے سارے خطوط مواد ولوازمات کی فراوانی کا باعث ہوں گے۔

قابلِ رشک ہیں طیب منیر کہ آخری سات برسوں میں انہیں خواجہ صاحب سے میل ملاقات، نیز خط کتابت نصیب رہی اور وفات سے دو ماہ پہلے (دسمبر ۲۰۰۴) تک کم از کم ساٹھ نامے ان کے نام آئے جو کتابی شکل میں اب ہمارے سامنے ہیں۔ اردو ادب سے علاقہ رکھنے والوں کو ان مکتوبات میں کوئی بات معمولی نہیں ملے گی۔ مکتوب الیہ طیب منیر شروع ہی سے خواجہ صاحب کی توقعات پر ایسے پورے اترے کہ پھر دل سے نہ اترے۔ اور خواجہ صاحب کی نظر التفات میں کمی نہ آئی۔ انھیں نثر کے ایوان میں خوش آمدید کہا گیا۔ 'چراغ حسن حسرت۔ احوال وآثار' پر محنت کا اندازہ کر کے خواجہ صاحب نے طیب منیر کو مولوی عبدالحق کے بقایا مکتوبات پر کام سونپا اور یہ بجائے خود ان کے لیے اعزاز ہوگا، اللہ کرے وہ توجہ دیں۔

ناشرین کو چاہیے کہ ضابطے کے صفحے پر کتاب کی تصحیح کرنے والے کا نام ضرور دیا کریں تاکہ معلوم ہو کہ غفلت کا ذمے دار کون ہے؟ زیرِ تبصرہ کتاب میں اغلاط (فاش اور صحت املا کی) بہت زیادہ ہیں۔ ان باتوں سے قطع نظر مکتوبات خواجہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ بلکہ ہمیں ممنون ہونا چاہیے کہ طیب منیر صاحب نے خواجہ ادیب نواز کے خطوط سے نوازا یعنی تسکینِ ذوق کا سبب بنے۔

کتاب کی ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ قیمت ۱۲۰ روپے۔ ملنے کا پتہ: پورب اکادمی، اسلام آباد

ہمارے خوابوں میں آیا کیجیے

جسٹس ۔ایم ۔آر کیانی

صاحب صدر

یوم اقبال سے بہت دن پہلے آپ کے سیکرٹری نے مجھے بذریعہ خط دعوت دی کہ اگر میں کانووکیشن ایڈریس کے لیے لائل پور آ رہا ہوں تو اس کے بعد اسی شام کو مجلس اقبال میں تقریر کروں اور گیارہ بجے رات فارغ ہو کر واپس لاہور بھی چلا جاؤں اور صبح ہائی کورٹ میں مقدموں کے فیصلے بھی کروں ۔یہ آخری بات تو غالباً انہوں نے مجھ پر چھوڑ دی تھی ،مگر میں ان کا مطلب سمجھ گیا ۔وہ جانتے تھے (آخر انہوں نے میری تصویر دیکھی ہوگی) کہ اتنی کارگزاری کے بعد میں واپس جانے کے قابل تو کیا ،یہاں رہنے کے قابل بھی نہیں رہوں گا اور وہ میری یادگار کہیں نہ کہیں بنا دیں گے ۔آج کل یادگاروں کے دن ہیں ۔سنا ہے اب پاکستان کی یادگار بننے کو ہے ،جیسے آپ خود کم یادگار ہوں ۔جیسے آپ کی کاروباری دیانت داری بجائے خود ایک یادگار نہ ہو ۔مگر سنا ہے کہ آپ مجسموں سے گھبراتے ہیں ،کیونکہ بت پرستی دین احمد میں کہیں نہیں آئی ۔جہاں بت دیکھا آپ نے توڑ دیا ۔خواہ لارنس جیسے نیک دل شخص کا ہی کیوں نہ ہو ۔وہ تو اچھا ہوا کہ آپ نے یہ مصرعہ نہیں پڑھا:

اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

ورنہ تصویروں کا کیا حال ہوتا ۔اب تو آپ اخباروں اور رسالوں کو تصویروں سے زینت دے سکتے ہیں اور خوب دیتے ہیں ،حالاں کہ یہ بدعت ہے ۔آپ میں سے جو لوگ زیادہ دیندار ہیں وہ تصویر میں شکل کو ذرا ٹیڑھا کر دیتے ہیں ،یعنی بگاڑ دیتے ہیں تا کہ نقل کفر نہ ہو جائے مثلاً سر کو غبارے کی طرح بناتے ہیں اور ٹانگوں کی بجائے لکڑی کے ڈنڈے لگاتے ہیں ۔اس کو کارٹون کہتے ہیں ۔ایک دفعہ میرے ساتھ بھی کسی رسالے نے یہ سلوک کیا تھا ۔کارٹون دیکھ کر جب ایک خاتون نے مجھے خط لکھا تو میں نے بہت جلد ،دیگر ضروری کام چھوڑ کر ان کو جواب دیا کہ میں دیکھنے میں اتنا برا نہیں ہوں ،مگر تصویر کی کیا بات ہے ۔ایک خاتون نے تصویر نہیں دیکھی تھی ۔انہوں نے جب مجھے دیکھا تو بے ساختہ کہا کہ آپ کی تقریروں سے جو تاثر قائم کیا تھا وہ کچھ اور تھا ۔میں نے کہا مجھے دیکھ کر لوگوں کو مایوسی ہوتی ہے ،مگر حسن تو آپ کے لیے ہے ۔میرے لیے آپ کا حسنِ ظن کافی ہے ۔مگر میں مجسموں کا ذکر کر رہا تھا اور یہ کہ بت پرستی حرام ہے اور بت شکنی حلال ۔البتہ اتنی فراخ دلی ہم میں ضرور ہے کہ یہ حلال و حرام کا سلسلہ صرف پتھر کے بتوں تک محدود کر دیتے ہیں ۔باقی ہمارے بت بھی ہیں اور بت خانے بھی اور ان کی پوجا پر ابھی تک کسی اہل شرع نے اعتراض نہیں کیا ،بشرطیکہ اس پر اللہ کا نام پڑھ لیا جائے:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے

ایک دفعہ میرے ایک دوست کے پاس کوئی ٹھیکیدار پھل کا ایک ٹوکرا لایا۔ میرے دوست میں یہ کمزوری تھی کہ کسی کی دل شکنی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمان کے لیے یہی کافی ہے کہ بت شکن ہو، دل شکن کیوں بنے۔ مگر ساتھ ہی مجھ سے پوچھا "یہ حرام تو نہیں ہے۔ ٹھیکہ تو مجھے کسی کو دینا ہی تھا اتفاق سے اسی کو دے دیا اور اس کے علاوہ میں نے مسئلہ سنا ہے کہ کسی چیز پر شک ہو تو اس پر بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔" میں نے کہا "وہ ٹھیکیدار تو اسے خدا کے نام پر نہیں لایا تھا، تمہارے نام پر لایا تھا۔ ایسی مشکوک چیزیں نہ کھایا کرو۔ اللہ کے نام پر کسی قریبی دوست کو دے دیا کرو۔" اس وقت میں ان کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔

القصہ، سیکریٹری صاحب کو میں نے لکھا کہ میں تو ماہ مئی میں آؤں گا اور اقبال پر مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ دو سال پہلے کہہ چکا ہوں۔ اس خطہ پر لائل پور میں سکوت طاری ہو گیا اور میں آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔ مگر آنے سے دو دن پہلے صاحب صدر نے بھی اللہ کا نام لے کر ایک تیر پھینکا جس سے میں بال بال بچ گیا۔ میں نے ان کو لکھا کہ آپ نے اتنی دیر سے تیر پھینکا ہے کہ طبیعت میں جولانی تو آ نہیں سکتی البتہ جنبش سی ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ نے دو سال پہلے جو باتیں اقبال کے متعلق کی تھیں وہ تو لوگ بھول گئے ہوں گے۔ لوگوں کا حافظہ دو سال تک کہاں رہ سکتا ہے، آپ وہی پرانی باتیں نئی سمجھ کر سنا دیجیے۔ اس لیے اے دوستو اور برہمنو! میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ برا نہ مانو اور اقبال کے لیے کوئی نیا شوالہ بناؤ کیونکہ:

تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اور یہ جو آپ کے حافظے کے متعلق صاحب صدر نے رائے دی ہے، میں یہ تو نہیں چاہتا کہ آپ کو ان کے خلاف بھڑکاؤں، مگر یہ ان لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے جن کا حافظہ بوسیدہ ہو، یعنی اس میں بھوسہ بھرا ہوا اور جو پچھلے واقعات کو بھول جاتے ہیں۔ جیسے کسی ظالم، یا نااہل کے عہد حکومت میں آپ دعا کریں کہ الٰہی اس مرتبہ تو ہمیں معاف کر و آئندہ کبھی اس کو ووٹ نہیں دیں گے۔ پھر پانچ سال تو کیا، دو سال بعد جب نئے انتخابات ہوتے ہیں، بشرطیکہ درمیانی عرصے میں وہ کم از کم ایک سال حکومت کے مخالف گروہ میں رہا ہو، تو وہ آپ کے سامنے مظلوم چہرہ لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تو صرف دس پھانسی کے مجرموں کو اپنے ووٹروں کے کہنے پر چھوڑ دیا تھا۔ میرے بعد ایک سال میں پچیس آدمی چھوڑے گئے اور یہ ان کے علاوہ تھے جو پاکستان ڈے اور یوم جمہوریہ اور یوم نسواں پر چھوڑے گئے۔ یوم نسواں کا ٹھیک علم نہیں کہ منایا جاتا ہے، یا نہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ تین سو پینسٹھ دنوں میں ایک بھی یوم نسواں نہ ہو اور اگر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی خوشی میں قید سے لوگ آزاد نہ کیے جائیں۔ میں پوچھتا ہوں، چلیے پھر سہی، اب مجھے جلدی ہے۔

میں نے لاہور میں کہا تھا کہ میں نے اقبال کے تین شعر یاد کیے ہیں اور اگر یاد رہا تو سنا بھی دوں گا، یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو وہ تین شعر بھی یاد نہیں رہے، مگر کسی نے یاد دلایا کہ لاہور میں، میں نے صرف ایک ہی مصرعہ پڑھا تھا۔ دوسرا مصرعہ پڑھنے کا موقع آج آیا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ میں اپنے سامعین سے کہہ رہا تھا کہ آپ نے ملک میں ہر قسم کے معاملے کھڑے کر دیے ہیں۔ کبھی یہ کہ چاول بنگال میں کیوں زیادہ ہوتے ہیں، کبھی یہ کہ لیچی یہاں کیوں نہیں ہوتی، کبھی یہ کہ ہماری قومی زبان ایک کیوں نہ ہوا اور ایک بھی وہ جسے ہم بولتے ہیں، مگر اب تو یہ عالم ہے کہ:

اقبال تیرے عشق نے سب مل دیے نکال

بس اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ لوگ اختیار کی باگ اپنے پھیپھڑوں کے سپرد کر کے ہنسنے لگے اور مجھے موقعہ ہی نہیں دیا کہ دوسرا

مصرعہ پڑھوں اور میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے بعد کسی نے نہیں پوچھا کہ وہ دوسرا مصرعہ کیا ہے؟ مجھے اس دن معلوم ہوا کہ لاہور کے لوگ کتنے ہوشیار ہیں۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ میں دوسرا مصرعہ پڑھنے والا ہوں، مگر چونکہ آپ لاہور کی ہوشیاری سے ۸۷ میل ادھر ہیں، میں بتائے دیتا ہوں۔

''مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی''

یہ سوال تو مجھے لاہور میں کرنا چاہیے تھا، لیکن چوں کہ وہاں موقع نہیں ملتا، اس لیے مناسب یہ ہوگا کہ آپ ہی سے پوچھ لوں۔ اب جو میں پوچھنے لگا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ بیک وقت تین سوال سامنے آ گئے ہیں اور سوال یہ کہ کون سا سوال پہلے کروں۔ کیا پہلے یہ پوچھوں کہ سچ مچ آپ کے بل سب کے سب نکل گئے ہیں، یا یوں ہی بہانہ کرتے ہیں؟

یا پہلے یہ پوچھوں کہ اگر بل ہیں تو کیا اس نرم جذبے کے تحت جو محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ یا خوف و ہراس کی مجبوری سے۔ میرے ایک درباری کالر میں دھوبی نے بہت سا نشا ستہ لگا دیا تھا، جسے اس کی برادری میں کلف کہا جاتا ہے اور درباری کالر سے میری مراد وہ سخت کالر ہے جو ہمیں جون کے مہینے میں بھی پہننا پڑتا ہے، تاکہ گردن سیدھی رہے۔ ایک دن مجھے زیادہ تکلیف ہونے لگی تو کالر اتار کے پانی میں بھگو دیا۔ آخر گردن کب تک سیدھی رکھی جا سکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ اور سب کچھ ٹیڑھا ہو، جیسے عمر خیام نے کہا تھا کہ ''صد کارکنی کہ گردن زدنی است'' یعنی سو کام ایسے کرتے ہو جن کے سبب تمہاری گردن اڑا دینی جائز ہے۔ اس نے شاید کچھ اور کہا تھا جو مے کی غلامی کے سلسلے میں تھا۔

''صد کارکنی کہ مے غلام است آں را''

مگر بعض شعر لوگوں نے بدل دیے ہیں، کیونکہ مے کچھ ایسی بری چیز نہیں رہی بشرطیکہ دیسی نہ ہو اور کلب میں پی جائے۔ الغرض وہ کالر نمی کے زیر اثر بالکل نرم ہو گیا اور میں نے کہا یہ کالر کتنا ہمدرد ہے، مگر جب اس کو دوبارہ ہوا لگی تو سوکھ کر پھر اکڑ گیا۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ آپ کے بل شاید خوف و ہراس کی مجبوری سے نکلے ہوں تو مجھے وہ کالر یاد آتا ہے جو پانی سے نرم ہو گیا تھا، مگر جب مجبوری خود کسی مجبوری سے چلی گئی تو اس کی اکڑ پھر اکڑ کر واپس آ گئی۔

یا پہلے یہ پوچھوں کہ آپ کی وہ آرزو نکلی، یا نہیں کہ کوئی آپ کو سیدھا کرے، مگر اس پر میں نے سوچا کہ انسان پر خود بینی کا الزام یوں ہی لگایا جاتا ہے۔ زیادہ تر وہ غیر بین ہوتا ہے مثلاً ہر ایک ہم میں سے یہی کہتا ہے کہ ضرورت ہے کہ کوئی ان لوگوں کو سیدھا کرے اور وہ خود کو ان لوگوں میں سے نہیں سمجھتا۔ ایک اقبال ہی نے مان لیا کہ اسے خود سیدھا ہونے کی ضرورت تھی، مگر اقبال کتنا ہی سیدھا آدمی ہے، جہاں کسی جرم کے عائد ہونے کا احتمال ہو تو وہ خود اقبال کر لیتا ہے، تاکہ استغاثے کی جھوٹی شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ مثلاً ہر موقع پر وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ صرف باتیں کافی نہیں کچھ کام بھی کرو، کچھ کر کے دکھاؤ، کسی جگہ میں نے ان لوگوں کا ذکر کیا تھا، جو حال مست ہوتے ہیں، ان کا بھی کیا ہوگا جو مال مست ہیں۔ اس مقام پر قوال مست سے حال بہتر ہیں، مگر ان دونوں سے بہتر کردار مست ہیں۔ میں تو کار مست کہنے کو تھا، مگر اس لیے رک گیا کہ کہیں کوئی یہ سمجھے کہ یہ مستی موٹر کار کی وجہ سے ہے۔ اقبال نے کہا ہے:

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستی کردار

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

ان دونوں اشعار کے درمیان ایک اور شعر بھی ہے جس کو میں نے اس موقع پر غیر ضروری سمجھا تھا، مگر مجھے اب کچھ شک سا ہونے لگا ہے کہ صاحب صدر کہیں شاعر نہ ہوں، چنانچہ ان کے فائدے کے لیے وہ بھی سنا دیتا ہے :

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سر مست نہ خوابیدہ نہ بیدار

اور وہ شک مجھے اس طرح ہوا کہ صاحب صدر نے پرسوں، یا اترسوں یا نرسوں ٹیلیفون کیا۔ یہ اترسوں اور نرسوں کا فرق مجھے برسوں میں معلوم نہ ہو سکا۔ بہر حال کوئی دن تو ہوگا جب انہوں نے ٹیلیفون کیا، تو سب سے پہلے یہ پوچھا ''خان صاحب کیا حال ہے آپ کا؟'' مجھے ابھی تک کسی نے خان صاحب نہیں کہا تھا، سوائے ایک سیشن جج کے جو خان صاحب اس لیے کہتا تھا کہ میں اسے چودھری صاحب کہوں۔ لہٰذا مجھ پر ایک غیر معمولی جذبہ، جس کو آپ جذبہ افغانیت کہہ سکتے ہیں، طاری ہوا۔ یہ جذبہ دیرپا نہ تھا، کیونکہ یاد آیا کہ خاں صاحب پاوندوں کو بھی کہتے ہیں، میں سمجھا کہ صاحب صدر کسی غلط آدمی کو ٹیلیفون کر رہے ہیں، اس لیے میں نے پوچھا ''کون سے خان صاحب؟ آپ کون صاحب ہیں؟ یہ میں نے بدلے کے طور پر کہا تھا، کیونکہ خان صاحب اور کون صاحب میں زیادہ فرق نہیں۔ وہ بولے: میں محمد منور ہوں محمد منور ہوں۔ اب آپ پوچھتے کہ اگر ٹیلیفون والے اتنے بڑے نام پر دو آنے کے بجائے تین آنے چارج کریں تو بے جا نہ ہوگا؟ اور کس قدر مشکل سے بولا جاتا ہے ایسے ثقیل ناموں کی وجہ سے ہی تو ٹیلیفون کے تار کند ہوتے ہیں اور بات سنائی نہیں دیتی اور پھر آپریٹر سے کہتے ہیں کہ بھائی پیسے تو آپ اتنے ہی چارج کریں گے، مگر سنا میں نے کچھ بھی نہیں۔ اور وہ اپنی سرکار پر ذمہ داری ڈالتا ہے کہ لوڈ بڑھ گیا۔ مگر سرکار کا لوڈ تو ہمیشہ سے زیادہ تھا، سرکار کب ہلکی تھی اور سرکار کا لوڈ گھٹانے کے لیے آپریٹر اب خود ٹیلیفون پر ہلکی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب مرد گھر میں نہ ہوں۔ ہاں تو میں نے یہ تو کہیں پڑھا تھا کہ ایک شخص کا نام محمد مکھن تھا اور اس سے کسی شاعر نے لسی مانگی۔ اس نے قیمت کے طور پر ایک ایسے شعر کی فرمائش کی جس میں اس کا نام بھی آئے۔ شاعر نے کہا:

عالم ہمہ دوغ است و محمد مکھن

مگر یہ محمد منور تو قافیے میں آتا ہے نہ ردیف میں۔ میں نے بہت کوشش کی، مگر صرف ایک ضعیف سا مستزاد حاصل ہوا۔

''ترے دم سے ہے بزم اقبال محمد منور''

دوسرا مصرعہ جدید اردو میں لکھا ہے۔

ترے خان صاحب کا ہو خان صاحب محمد منور

یعنی خدا غارت کرے تیرے خان صاحب کو ''جیسے کہتا ہے کوئی ہو تیرا صفایا۔

ان دونوں مصرعوں کے کسی حصے میں سے ضرور کسی کی تاریخ وفات نکلے گی۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ آرام سے دیکھ لیجیے گا۔ اب میں پھر مستی کردار کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اقبال نے بعد میں سوچا کہ اگر صوفی اور ملا اور شاعر تینوں ناراض ہو گئے تو صرف محمد منور مجھے کہاں تک بچائیں گے، اس لیے انہوں نے سارا قصور اپنے ذمے لے لیا۔ یہ تو نہ کہا کہ میں کردار سے عاری ہوں، مگر یہ ضرور

کہا کہ میں کردار کا غازی نہ بن سکا۔اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کردار کی حد تک وہ غازی نہ بن سکے،لیکن غازی سے ذرا کم رتبے کا درجہ انہیں حاصل ہوگیا تھا،یعنی وہ کردار کے قاضی بن گئے تھے۔آپ اقبال کو گفتار کا غازی کہیں،یا کردار کا قاضی،جو کام قدرت نے اس کے سپرد کیا تھا وہ اس نے بڑی دیانت داری سے پورا کیا:

اقبال بڑا اپدیشک ہے،من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا،کردار کا غازی بن نہ سکا

اچھا وہ تین سوال جو میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا،وہ تو یوں ہی رہ گئے اور میں شہید گفتار ہوا اور ابھی تک یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا کہ پوچھوں،یا نہ پوچھوں اور اگر پوچھوں تو پہلے کون سا سوال پوچھوں۔جس طرح میر تقی میر نے یہ سوچ کر کہ:

''سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا''

صبر کر لیا تھا میں بھی اسی میں مصلحت سمجھتا ہوں کہ یہ سوال ہی نہ کروں اور اگر آپ نے میرے تین سوال سن لیے ہیں،تو آپ کی قوت سامعہ نے جلد بازی کی ہے۔سرکاری طور پر تو وہ ابھی معرض وجود میں نہیں آئے۔ابھی وہ تصورات کی بستیوں میں پراگندہ ہیں۔اگر آپ کے خیالات ان سے متاثر ہوئے ہوں تو ہونے دیں۔میں اتنا خود غرض نہیں کہ آپ کے خیالات کو بھی منسوخ کردوں۔البتہ یہ آرزو کا لفظ،جو اس مصرعہ میں استعمال ہوا ہے۔

مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

وہ ان معنی میں بیان نہیں ہوا جو اقبال کی شاعری کا لب لباب ہے۔یہاں تو صرف یہی مراد ہے کہ تم بھی بڑے افلاطون تھے،بلکہ خان صاحب تھے۔اب ٹینگ ہو جایئے۔یہ ٹینگ کا لفظ میں نے پشتو سے لیا ہے،مگر اس کا ترجمہ نہیں کر سکتا۔ہاں تو خاص مقامات پر اقبال نے آرزو کو ایسی اونچی کرسی پر بٹھا رکھا ہے کہ دل یہی چاہتا ہے کہ آرزو پوری ہی نہ ہو اور ناتمام رہے اور اس کے حاصل کرنے میں ہی ساری کوشش،بلکہ ساری زندگی صرف ہو مثلاً:

آرزو بے ضرر خویش بہ آغوش حیات
چشم وا کردو جہان دیگرے پیدا شد

یہ آدم کے پیدائش کے وقت کی بات ہے۔اس وقت تک دنیا میں کوئی آرزو نہ تھی۔بس ایک درخت کا پھل کھاتے اور سو جاتے تھے،یا پھر ننگے پھرتے تھے۔جب زندگی آئی تو اس کی گود میں آرزو بھی آئی۔آرزو نے آنکھ کھولی تو ایک نئی دنیا نے جنم لیا۔اب اگر آرزوئیں ختم ہو جائیں تو زندگی کا پودا بے ثمر رہتا۔اور آپ اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ اقبال کی آرزو کیا ہے''اے بسا آرزو کہ خاک شد''نہیں،ابراہیم نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھ کر کہا کہ یہی خدا ہوگا،مگر وہ ڈوب گیا تو کہا کہ خدا ڈوبنے والا تو نہیں ہوسکتا۔اسی طرح اقبال کی آرزوئیں بھی مٹی میں نہیں مل سکتیں۔مٹی کے مضمون پر زیادہ سے زیادہ ''خاکم بدہن'' تک چلا جاتا ہے وہ بھی تکلفاً کیونکہ خدا سے شکوہ کر رہا ہے اور یہ ڈر دامن گیر ہے کہ کہیں فرشتے خدا کے حضور میں اس کی برائی نہ کریں۔فرشتے اپنی عادت سے مجبور ہیں وہ انسان کی برائی کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ہر چند کہ خداوند دانا و بینا ہے،پھر بھی وہ کبھی کبھی فرشتوں کی سن لیتا ہے،کیونکہ انہیں ہر وقت قرب حاصل ہے اور مقربین کا کچھ نہ کچھ پاس کرنا ہی پڑتا ہے۔الغرض اقبال نے جب کہا کہ:

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

تو اس طرح سے کہا جیسے ہم خط کے آخر میں لکھتے ہیں کہ آپ کا تابعدار، حالانکہ ارادہ ہرگز تابعداری کا نہیں ہوتا اور اقبال کا جسم مٹی کا ہو تو اس کا خیال ہمیشہ آسمانوں پر پرواز کرتا رہا اور یہی اس کی آرزو کی تعبیر ہے۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یعنی ہمیشہ کوئی نئی چیز پیدا کرنے کی لگن رہے اور خدا کرے کہ یہ آرزو اور یہ بے قراری کبھی ختم ہی نہ ہو، تا کہ جو چیز اب ہے اس سے بہتر وجود میں لا سکوں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اور تو ہم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کر سکتے بچے ہی پیدا کریں گے۔ مگر ایسا کرنے میں یہ یقین نہیں ہوتا کہ نیا بچہ پچھلے سے زیادہ حسین یا زیادہ ذہین ہوگا۔

اس لیے نئی نئی شادیاں کرتے رہتے ہیں تا کہ مرحلۂ شوق کبھی طے ہی نہ ہو۔ اقبال نے شادی کی طرف توجہ نہیں کی اور نہ تخلیق کو تولید کے معنوں میں استعمال کیا۔ اس کا آرزومند انسان تو:

آفریند کائناتِ دیگرے
قلب را بخشد حیاتِ دیگرے

نئی دنیا پیدا کرتا ہے جو غالباً روس اور امریکہ کی طرف اشارہ ہے جو آج کل آسمانوں کے احتساب میں مصروف ہیں، مگر آپ کو اس کی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے لیے تو نعرۂ تکبیر ہی کافی ہے:

گفتند لب بہ بندوز اسرارِ ما مگو
گفتم کہ خیر! نعرۂ تکبیرم آرزو است

انہوں نے کہا فطرت کے راز جو ہم نے تمہیں بتائے ہیں کسی کو نہ بتاؤ۔ میں نے جواب دیا منظور ہے البتہ مجھے نعرۂ تکبیر لگانے کی اجازت ہونی چاہیے، یہ اجازت مل گئی اور اب آپ آرام سے نعرے لگاتے ہیں اور فطرت کے اسرار بے نقاب کرنے کا کام آپ نے روس اور امریکہ کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ سب آپ کی تن آسانی کا نتیجہ ہے، ورنہ اقبال تو یہ چاہتا تھا کہ فطرت کے راز نہ صرف افشا کیے جائیں، بلکہ ان پر اضافہ کیا جائے:

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

مگر جو کچھ کرنا ہو اس طرح کرو کہ اس میں ایک ولولہ نظر آئے، اس میں تڑپ پیدا ہو۔ جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی بے قراری ہو۔ اس کام کے لیے وہ جسم کو چھوڑ کر روح کو مامور کرتا ہے، کیونکہ جسم روح کے زور سے چلتا ہے اور جسم زوال پذیر ہے۔

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس
حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

مفسرین کے کہنے کے مطابق گم گشتہ شے سے متروکہ جائداد مراد ہے جیسے کوئی جننگ فیکٹری، یا آموں کا باغ، یا رہائشی

مکان ۔ میں بھی ایک گائے گورداسپور میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں وہاں کے ناظر نے لکھا کہ وہ طغیانی میں بہہ گئی ہے ۔ یہاں سے ایک ہندو دوست نے جاتے ہوئے اپنی گائے دی کہ کسی قصائی کے ہاتھ لگ جائے گی اس سے تو آپ بہتر ہیں ۔ بعد میں جب میں نے سنا کہ گورداس پور والی گائے طغیانی میں بہہ گئی ہے تو سوچا کہ بہہ کر ادھر ہی نکل آئی ہو گی ۔ ممکن ہے یہ وہی گائے ہو ۔ زیادہ غسل کرنے سے صرف رنگ بدل گیا ہے اور رفتہ رفتہ یقین ہو گیا کہ یہ وہی گائے ہے ۔ کیونکہ دودھ بھی ویسا ہی سفید تھا ۔ مکان نہ ملا تو گائے ہی سہی ۔ دراصل میں بھی اچھا خاصا مہاجر ہوں ۔ یہ لوگ تیرہ سال کے مہاجر ہیں ۔ میں تیرہ سو سال کا نکالا ہوا ہوں ۔ اور دادا پردادا کے وقتوں سے تو باقاعدہ ہجرت کرتا رہا ہوں ۔ محض اسلامی جذبے کے تحت یہاں کے لوگوں کو تیر و سناں کا فن سکھانے کی خاطر اپنا سنگلاخ ملک چھوڑ کر کبھی کبھی اس طرف چھاپہ مارتا تھا ۔ پھر یہاں کے دوستوں نے کہا کہ یہیں رہ جاؤ ۔ ہر سال چھاپہ مارنے سے کیا فائدہ ایک ہی سیر حاصل چھاپہ مارو ۔

مگر میں موضوع سے دور نکلتا جا رہا ہوں ۔ انشاء اللہ تعالیٰ پھر کوئی موقع ہجرت کا نکل آئے گا ۔ اس وقت تو میں نے صاحب صدر سے صرف آدھ گھنٹے کی سمع خراشی کی اجازت لی ہے اور ضروری نہیں کہ وہ اقبال کے متعلق ہو ۔ اگر آپ مجھے پہلے کہتے کہ یوم اقبال کے پندرہ دن بعد بھی ردالشمس کے طریقے سے یوم اقبال واپس ہو سکتا ہے تو میں اخبار والوں سے کہتا کہ بہ تحقیق نکالو، ایک سرخی ''علامہ اقبال لائلپور میں'' اور اقبال کے متعلق ایسا پھڑکتا ہو لطیفہ سناتا کہ اقبال نے خود بھی نہ سنا ہوتا ۔ اب تو اس کے متعلق آپ نے اتنا کہا سنا ہے کہ سوائے ابوہریرہ کے نقے کے اور کچھ رہا ہی نہیں اور کچھ رہا ہے تو، یا تو وہ لطیفے ہیں جو مجھ جیسے لوگوں کو معلوم ہیں، جن کے سامنے وہ اٹھتے بیٹھتے تھے اور جو مرتے دم تک ان کو قیام پاکستان کے بارے میں رائے دیتے رہے (لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرے ملاقات ان سے ان کی وفات کے بعد ہوئی) یا وہ تنقیدیں ہیں جو اقبال کے وہم و گمان میں بھی کبھی نہیں آئی ہوں گی ۔ دراصل ایسی تحریروں کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ ان کے بغیر خاطر خواہ طریقے پر دماغی کوفت نہیں ہو سکتی اور اگر دماغی کوفت نہ ہو تو اطمینان نہیں ہوتا کہ واقعی کوئی تحقیق کی گئی ہے ۔ مثلاً سنیے:

> ''ان تمام مباحث سے ثابت یہ ہوا کہ اقبال کا نظریہ حسن معروضیت، موضوعیت کا ہے جسے ہم معنوی مناسبت کی بنا پر وحدت جمال کے نام سے موسوم کر چکے ہیں اور یہی نظریہ اپنی جگہ پر صحیح اور جامع بھی ہے ۔''

اپنی جگہ پر تو سب کچھ صحیح ہوتا ہے، مگر سب کچھ اپنی جگہ پر رہتا کب ہے ۔ حضور کو ساری تکلیف اس وجہ سے پیش آ رہی ہے کہ کسی جگہ تو اقبال کہتا ہے کہ حسن عارضی ہے یعنی اس پر زوال وارد ہوتا ہے ۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابلیس کے علاوہ حسن بھی زوال کا شکار ہوا لیکن چونکہ خدا خود جمیل ہے اور جمال کو پسند ہے اس لیے حسن نے شکایت کی جسارت کی:

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا

خدا نے جو جواب دیا وہ پھر کسی دن سناؤں گا، بات یہ ہے کہ وہ جواب خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا ۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو معروضات اور موضوعات کے دھوئیں میں اپنا مطلب بظاہر آشکار کر کے چھپا سکتا ہوں ۔ لہٰذا بتائے دیتا ہوں، تاکہ آپ کی حسین راتیں بے قراری میں نہ گزریں ۔ خدا نے جواب دیا کہ چونکہ دنیا کی نمود رنگ تغیر سے ہوئی ہے، لہٰذا:

وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہو جس کی

اسی طرح کے جواب ہمارے ایک پروفیسر بھی دیا کرتے تھے اگر ان سے آپ پوچھتے کہ معروضات کیا ہیں تو وہ کہتے "معروضات جیسے موضوعات! یہ سارے ایک قسم کے لفظ ہیں۔واردات، مسمات، لات ومنات۔ان کو ہم قافیہ الفاظ کہتے ہیں اور معروضات تو آسان ہے۔ جب اس کو معروضیت پڑھیں تو واقعی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔تو گویا معروضیت کے معنی ہوئے معروض کی جمع اور مفعول کے وزن پر ہے۔یہاں تک تو میں نے بتا دیا ہے۔اب آگے تم ڈکشنری دیکھ کر اپنی علمیت میں اضافہ کرلو۔"

اللہ میاں نے بھی حسن کو یہی جواب دیا کہ جاؤ اقبال سے پوچھو، یا پھر اقبال کے بعد اس کے مفسرین آئیں گے۔ساری باتیں پہلے ہی دن نہیں پوچھا کرتے۔ازل سے زوال کا کیا تعلق۔

میں کہہ رہا تھا کہ جناب نقاد کو یہ تکلیف پیش آئی ہے کہ کسی جگہ تو اقبال حسن کو عارضی بتاتا ہے اور کسی جگہ کہتا ہے کہ یہ تو ہمارے مشاہدے کی بات ہے، یا خیال کی بات ہے جس کو حسین سمجھیں وہ حسین ہے، جس کو قبیح سمجھیں وہ قبیح ہے۔بعض لوگ سؤر کا نام نہیں لیتے، تاکہ ان کی زبان پلید نہ ہو جائے اور اس کو "بدزناور" یعنی برا جانور کہتے ہیں اور بعض لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو محبت سے "پگی" PIGGY کہتے ہیں جو پگ سے اسم تصغیر ہے اور اسی طرح اقبال کہتا ہے:

آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفان حسن
نہ دیکھے تو بس قطرہ ہے یا:
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من
چہ زمان وچہ مکاں، شوخی افکار من است

یعنی مجھے کوئی چیز نظر آئے تو وہ ہست ہے، نظر نہ آئے تو نیست ہے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ میری نظر میں خواہ آپ کوے کی مانند کیوں نہ ہوں آپ کے حسنِ مطلق پر کیا اثر پڑتا ہے، بشرطیکہ آپ عام دنیاوی اعتبار سے حسین ہوں اور باقی رہی بات زوالِ حسن کی تو مناسب جواب یہ تھا کہ:

کیا کم ہے یہ شرف کہ رہے حسن چند سال

اور اگر دنیا میں بدصورتی نہ ہوتی تو پھر سارے لوگ خوبصورت ہوتے اور خوبصورتی کی کوئی قدر نہ ہوتی۔بات یہ ہے کہ انسان تغیر چاہتا ہے اور جب زیادہ حسن سے اس کی طبیعت اکتاتی ہے تو بدصورتی کی طرف بھی راغب ہو جاتا ہے، مگر نہیں سنی آپ نے کہانی، اس شخص کی طرف بھی راغب ہو جاتا ہے، مگر نہیں سنی آپ نے کہانی، اس شخص کی، جو ایک چیچک رو سے محبت کرتا تھا۔کسی نے پوچھا کہ یہ تمہیں کیسے پسند آیا تو اس نے کہا، "جب فٹ بال کھیلتے وقت اس کے چہرے کے داغوں میں پسینہ چمکتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے آسمان حسن پر تارے چمک رہے ہوں۔" اچھا چھوڑیے اس معروضیت اور موضوعیت کے قصے کو چونکہ آپ نے مجھے بزم اقبال میں شرکت کے لیے بلایا ہے، میں آپ کو اقبال کے بارے میں ایسی باتیں سناتا ہوں، جو آپ نے پہلے کبھی نہ سنی ہوں گی۔

ایک دفعہ اقبال اپنے چند احباب کے ساتھ لائلپور آنے والے تھے۔مجھ سے اصرار کیا کہ تم بھی ساتھ چلو۔میں تیار ہو گیا۔ راوی کے ادھر نواب ذوالفقار علی خاں کی موٹر کھڑی تھی، ہم دونوں پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے۔ڈرائیور سمجھا کہ نواب صاحب بیٹھ گئے ہیں اور موٹر چلا دی۔شاہدرہ تک ہم آئے تو اقبال نے کہا "لائلپور چلو" ڈرائیور نے مڑ کر جب دیکھا کہ نواب صاحب نہیں ہیں تو زور سے بریک لگا کے گاڑی روک دی۔ڈرائیور نے کہا "حضور نواب صاحب تو پیچھے رہ گئے۔" اقبال نے کہا "کوئی ہرج

نہیں وہ اور سردار جوگندر سنگھ ساتھ آئیں گے۔'' آگے چل کر ہم نے دیکھا کہ قلعہ شیخوپورہ کے قریب سردار جوگندر سنگھ اسکوٹر پر جا رہے ہیں۔ان کو ہم نے ساتھ لیا اور اسکوٹر سڑک کے کنارے چھوڑ دی۔وہ اسکوٹر کی سواری پر بہت مصر تھے،انہوں نے بتایا کہ نواب صاحب دوسری موٹر میں چلے گئے ہیں،مگر میں نے ان سے شرط لگائی ہے کہ میں اسکوٹر پر ان سے پہلے پہنچوں گا۔خیر جب موٹر چلنے لگی اور سردار جوگندر سنگھ کا پسینہ سوکھنے لگا تو انہوں نے خوشی میں کہا ''کیسی خاموش گاڑی ہے کہ بغیر آواز کے اتنی تیز ہو جاتی ہے اور میرا اسکوٹر تو بڑا دجال ہے، بلکہ خر دجال ہے۔'' یہ ان کے اپنے الفاظ ہیں۔میں نے کہا ''یہ خاموشی صرف موٹر پر ہی منحصر نہیں جو بھی دنیا میں تیز رفتار ہیں، وہ خاموشی سے کام کرتے ہیں۔'' اس کے کچھ ہی دن اقبال نے یہ شعر سنائے:

کیسے پتے کی بات جوگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرام ناز
مانند برق تیز، مثالِ ہوا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش

آخری شعر میں ''میں نے کہا'' کا ٹکڑا شاعرانہ نازک خیالی ہے۔دراصل یہ بات میں نے کہی تھی چنانچہ میں نے نازک طریقے سے اعتراض بھی کیا۔انہوں نے کہا ''ہم اور تم ایک ہیں۔'' میں خوش ہو گیا۔اس بات کا گواہ سردار جوگندر سنگھ ہے اور اگر آپ نہیں مانتے تو آپ سے پہلے بھی لوگ ایمان نہیں لائے تھے۔بہر کیف قصہ لائلپور کی سڑک سے بھی زیادہ لمبا ہو گیا۔یہاں دیر سے پہنچے۔سرکٹ ہاؤس میں رات کو آرام کیا۔تین بجے رات کو آنکھ کھلی تو شہر میں لاؤڈ اسپیکروں کا ایک ہنگامہ برپا تھا۔اقبال نے کہا ''کئی ایک گھروں میں آگ لگی ہوگی۔'' میں نے کہا ''کہیں بلوہ نہ ہو۔'' جوگندر سنگھ نے کہا ''گوردوارہ میں خیرات بانٹ رہے ہوں گے۔'' ہم نے چوکیدار کو بلا کر پوچھا۔اس نے کہا ''مسجدوں میں سرکاری اذانیں دی جا رہی ہیں'' ہم نے پوچھا ''سرکاری کیسے؟'' کہا ''لاؤڈ اسپیکر تو انگریزی چیز ہے نا۔لاؤڈ اسپیکر میں سے اذانیں ہو رہی ہیں اور چونکہ ایک وقت پر ہو رہی ہیں، اس لیے غل غپاڑہ ہے۔اذان تو اصلی وہ ہوتی ہے جو اپنے گلے کی آواز سے ہو، سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ایک خاص مؤذن تھا جس کی آواز سارے مدینے میں سنی جاتی تھی۔'' اقبال نے ہم سے کہا کہ یہ چوکیدار بلال کا ذکر کر رہا ہے۔پھر وہ دو گھنٹے تک ایک محویت کے عالم میں رہے۔اس کے بعد بلال پر شعر کہے جو بانگ درا کے صفحہ ۷۸ پر ہیں۔بلال ایک حبشی غلام تھا، اس لیے اقبال نے کہا:

تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

مگر یہ لاؤڈ اسپیکر کا اثر تھا جس سے اقبال نے سمجھا، بلال اذان اس لیے نہیں دیتا تھا کہ لوگ نماز پڑھیں، بلکہ اذان اس کے لیے اظہار عشق کا ایک بہانہ تھا۔ادھر مؤذنوں کو دیکھیے جو اذان کو مصنوعی بنا کر اس کا روحانی نغمہ، اس کا ولولہ اور اس کی بلالیت کھو دیتے ہیں۔لہٰذا اقبال نے بلال کو مخاطب کر کے کہا:

اذاں ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

اگلے دن ہم سیر کرتے ہوئے کھدر کے کارخانوں کو دیکھنے گئے۔ اقبال نے کارخانے کے مالکوں کو جمع کر کے کہا کہ اچھا مال بناؤ اور کارخانے کی بجائے ٹیکسٹائل مل بناؤ، کیونکہ:

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسّال کابل سے، کفن جاپان سے

پھر اب لوگوں نے اتنی ترقی کی کہ اب مزدوروں کے کفن لائلپور ہی میں بنتے ہیں۔ مزدور کیا، سرکاری طبقے، متوسط الحال طبقے اور حد یہ ہے کہ خوددار طبقے بھی دولت کے جلوے دیکھ کر اپنے روحانی کفن یہیں تیار کراتے ہیں۔ کل رات اقبال میرے خواب میں آئے، اب میرے خوابوں میں بھی لوگ آنے لگے ہیں۔ صرف یہ کرنا پڑتا ہے کہ رات کو وضو کر کے ایک تسبیح اس طرح پڑھتا ہوں:

''ساڈے خواباں وچ آیا کرو''

پھر کوئی اہل نظر آجاتا ہے۔ اقبال نے سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی اور راجہ حسن اختر اور خواجہ عبدالرحیم ساتھ تھے۔ مجھ سے پوچھا ''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا ''پچھلی یادیں تازہ کر رہا ہوں، مگر یہاں کی تجارتی فضا نے مجھے دل گیر کر دیا ہے۔'' انہوں نے فرمایا کہ مکڑے اور مکھی کی نظم جو میں نے بچوں کے لیے لکھی تھی وہ آج شام کو پڑھو، دل خوش ہو جائے گا۔ اس میں تمہیں اور یہاں کے لوگوں کو ہدایت کا راستہ نظر آئے گا، اس لیے اس حکم کی تعمیل میں کچھ حصے پڑھے دیتا ہوں۔ باقی کے لیے دیکھو بانگ درا صفحہ ۲۔

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا
اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمہارا
لیکن میری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت
بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا
وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا
مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی
حضرت کسی نادان کو دیجے گا یہ دھوکا
اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اترا

مکڑے نے کہا مجھ پر یوں ہی شک کرتی ہیں۔ میں تو محض فی سبیل اللہ مہمان داری کرتا ہوں اور اپنے مہمانوں کو گھر کے عجائب خانے میں طرح طرح کی چیزیں دکھاتا ہوں:

لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
دیواروں کو آئینے سے ہے میں نے سجایا

مکھی پھر بھی نہ مانی اور کہا کہ

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا

اس کے بعد مکڑے نے طریقہ بدلا اور خوشامد کا راستہ اختیار کیا اور کہا رانی! خدا نے تمہیں رتبہ دیا ہے، بڑا حسن دیا ہے، آنکھیں تمہاری ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں ہیں، سر کلغی سے سجا ہے:

یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گاہا

مکھی نے یہ سنا تو پسیجی اور کہا۔ ہاں یہ باتیں تو مجھ میں ہیں اور بعض دفعہ اس خیال سے بھی کہ کسی کا دل نہ ٹوٹے کھانا بھی قبول کر لیتی ہوں:

انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے
پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا

تو اے دوستو! میں یہ پڑھ کر صبح ہی صبح یہاں سے بھاگ رہا ہوں اور آپ کو خدا اور اس کے مکڑوں کے سپرد کرتا ہوں۔ آپ کو پھر کبھی یاد آؤں تو وہ تسبیح پڑھ لیا کرو۔

''ساڈے خواباں وچ آیا کرو''

اقبال کے چند شوخ اشعار

مرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب — خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق
ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد — زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن
عشق میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
دل ہے مسلماں تیرا نہ میرا — تو بھی نمازی میں بھی نمازی
قم باذن اللہ جو کہتے تھے رخصت ہو گئے — خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن
جمہور کے ابلیس میں ارباب سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہہِ افلاک
مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں — لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

انتخاب کلام میر

امجد اسلام امجد

دیوان سوم

استاد ہو دریا تو خطرہ کی بہت ہے　　آ اپنے کھلے بالوں سے زنجیر نہ کر آب

آئی جو لب پر آہ تو میں اٹھ کھڑا ہوا　　بیٹھا گیا نہ مجھ سے تو ایسی ہوا کے بیچ

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اس کے　　آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر
پڑتے نگہ اس شوخ کی ہوتا ہے وہ احوال　　رہ جاوے ہے جیسے کوئی بجلی ہی سے ڈر کر

کیا پتنگے کو شمع روئے میر
اس کی شب کو بھی ہے سحر درپیش

کوہکنی کیا پہاڑ کاٹے گا　　پردے میں زور آزما ہے عشق

نہ کھینچیں کیونکہ نقصاں ہم تو قیدی ہیں تعین کے
خودی سے کوئی نکلے تو اسے ہووے خدا حاصل

اپنے خیال ہی میں گزرتی ہے اپنی عمر　　پر کچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا ہیں　　جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

وجہ بے گانگی نہیں معلوم　　تم جہاں کے ہو، واں کے ہم بھی ہیں

رہے پھرتے دریا میں گرداب سے　　وطن میں بھی ہیں ہم سفر میں بھی ہیں

ہوا ہوں فرط اذیت سے میں تو سن اے میر　　تمیز رنج و خیال نشاط مجھ کو نہیں

ہم بھی تو فصل میں چل ٹک تو پاس بیٹھیں　　سر جوڑ جوڑ کیسے کلیاں نکلتیاں ہیں

جائے ہے جی نجات کے غم میں　　ایسی جنت گئی جہنم میں

تا چند وہ ستم کرے ہم درگزر کریں　　اب جی میں ہے کہ شہر سے اس کے سفر کریں

نرمی مخالفوں سے سختی موافقوں سے　　واں موم سے بنے ہو یاں لوہے سے کڑے ہو

فرو درد آنسو پئے کچھ ہوا　　دوا جیسے پیتے ہیں پانی کے ساتھ

نہ کر دیوار کا مجلس میں تکیہ
ہمارے مونڈھے سے مونڈھا لگا بیٹھ

دیوان چہارم

التفات زمانہ پر مت جا　　میر دیتا ہے روزگار فریب

چار دیواری عناصر میر　　خوب جا گہ ہے پر ہے بے بنیاد

کیا جانیے کہ دل پر گزرے ہے میر کیا کیا　　کرتا ہے بات کوئی آنکھیں پر آب کر کر

بابا ہی ہی کر ڈالے تو اس کا غرور دو چنداں ہے
گھکھیانے کا اب کیا حاصل یوں ہی کریں ہیں ہا، ہا ہم

دیوان پنجم

دیواروں سے سر مارا تب رات سحر کی ہے　　اے صاحبِ سنگین دل اب میری خبر کرنا

یا رب کدھر گیے وے جو آدمی روش تھے　　او جڑ دکھائی دے ہیں شہر و وہ نگر سب

چور اچکے سکھ مرہٹے شاہ و گدا زر خواہاں ہیں
چین میں ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر ہی اک دولت ہے اب

ایک جگہ پر جیسے بھنور ہیں لیکن چکر رہتا ہے　　یعنی وطن دریا ہے اس میں چار طرف ہیں سفر میں اب

کون شکارِ رم خوردہ ہے جا کے کہے ٹک پھر کر دیکھ
کوئی سوار ہے تیرے پیچھے گرد و غبار و خاک کے بیچ
احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا　　کچھ زیرِ لب کہا بھی سو دیر دیر رو کر

کیا ہم میں رہا گردش افلاک سے اب تک　　پھرتے ہیں کمہاروں کے پڑے چاک سے اب تک

اپنے حسنِ عارضی پر آج مت مغرور ہو　　پاس تو ہے جس کے وے ہی کل کہیں گے دور ہو

کیا جانے وہ مائل ہووے کب ملنے کا تم سے میر　　قبلہ و کعبہ اس کی جانب اکثر آتے جاتے ہو

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

کار عدالت شہر کا ہم کو اک، دو دن دو دن ہووے تو پھر
چاروں اور منادی کریے کوئی کسی سے دل نہ لگائے

چاہت روگ بڑا ہے جی کا میر اس سے پرہیز بھلا
اگلے لوگ سنا ہے ہم نے دل نہ کسو سے لگاتے تھے

جنگل جنگل شوق کے مارے ناقہ سوار پھرا کی ہے　　مجنوں جو صحرائی ہوا تو لیلیٰ بھی سودائی ہوئی

آنکھ مستی میں کسو پر نہیں پڑتی اس کی　　یہ بھی اس سادہ و پرکار کی ہشیاری ہے

دیوان ششم

قیامت ہے مشتاق لوگوں کی کثرت　　پہونچنا ہے مشکل ہمیں اس کے گھر تک

بہت میر پھر ہم جہاں میں رہیں گے　　اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

زندگی کرتے ہیں مرنے کے لیے اہل جہاں　　واقعہ میر ہے در پیش عجب یاروں کو

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں　　اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

جان غیور پر ہے ستم سا ستم کہ میر　　بگڑا جنھوں سے چاہیے ان سے بنائیے

حق جو چاہے تو بندھی مٹھی چلا جاؤں گا
مصلحت دیکھی نہ میں ہاتھ کے پھیلانے میں

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں　　میں بوں نسیم باو فروش چمن نہیں

غم کھاویں یا غصہ کھاویں یوں اوقات گزرتی ہے
قسمت میں کیا خستہ دلوں کے یہی لکھے تھے کھانے دو

سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں پہ اپنی　　اس خاک رہ عشق کا اعزاز تو دیکھو

ہوتے ہیں خاک رہ بھی لیکن نہ میر ایسے　　رستے میں آدھے دھڑ تک مٹی میں تم گڑے ہو

حقیقت نہ میر اپنی سمجھی گئی　　شب و روز ہم نے تامل کیا

مرتا تھا جس کی خاطر اس کی طرف نہ دیکھا　　میر ستم رسیدہ ظالم غیور کیا تھا

عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم　　ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بے خبر سب

میر اس خرابے میں کیا آباد ہووے کوئی　　دیوار و در گرے ہیں ویراں پڑے ہیں گھر سب

گردش دنوں کی کم نہ ہوئی کچھ کڑے ہوئے
روزے رکھے غریبوں نے تو دن بڑے ہوئے

نہ رہ مطمئن تسمہ باز فلک سے　　دغا سے یہ بہتوں کی کھینچے ہے تسمیں

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز　　وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

ہم وحشیوں سے مدت مانوس جو رہے ہیں
مجنوں کو شوخ لڑکے کہنے لگے ہیں کاکا

ہے چار طرف شور مری بے خبری کا　　کیا کیا خبریں آتی ہیں اخبار میں صاحب

جز خدا ہم کسی سے ڈرتے نہیں　　گھر ہمارا ہے واں جہاں ہے ہراس

سبھوں سے آرسی کے مثل وا ہو　　کسو کے منہ پہ دروازہ نہ کر بند

کہے کون صید رمیدہ سے کہ ادھر بھی پھر کے نظر کرے
کہ نقاب الٹے سوار ہے تیرے پیچھے کوئی غبار میں

سر عبدالقادر۔ احوال و آثار

(قسط دوم)

محمد حنیف شاہد

انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور ۱۸۶۹ء میں قائم ہوئی تھی۔ مسلمانان پنجاب کی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی بیداری میں اس ادارے نے قابل فخر اور قابل ذکر اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ بادشاہی مسجد اور لاہور کی دوسری مساجد کی نگرانی، مرمت اور دیگر امور میں انجمن مذکور کی مساعی جمیلہ ناقابل فراموش ہیں۔ برکت علی محمڈن ہال جو اب برکت علی ہال کہلاتا ہے اس کا انتظام و انصرام بھی اسی کے سپرد رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی جن سربرآوردہ اور مقتدر شخصیات کا اس ادارے سے تعلق خاطر تھا، ان میں نواب فتح علی خاں قزلباش (رکنیت ستمبر ۱۸۹۱) حاجی شمس الدین (ستمبر ۱۸۹۰ء)، حاجی منشی محبوب عالم (ستمبر ۱۸۹۰ء)، حاجی منشی محبوب عالم (ستمبر ۱۸۹۰ء)، فقیر سید افتخار الدین (فروری ۱۸۹۴ء)، سر میاں محمد شفیع (اکتوبر ۱۸۹۶ء)، شیخ عبدالقادر (اکتوبر ۱۸۹۶ء)، شمس العلماء مولوی عبداللہ ٹونکی (مارچ ۱۸۹۹ء) چودھری شہاب الدین (فروری ۱۹۰۱ء) سر میاں فضل حسین (دسمبر ۱۹۰۵ء)، مرزا جلال الدین بیرسٹرایٹ لاء (فروری ۱۹۰۶ء)، میاں محمد شاہنواز (نومبر ۱۹۰۶ء)، فقیر سید جلال الدین (ستمبر ۱۹۰۸ء)، نواب ذوالفقار علی خان (۱۹۰۹ء) اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (مارچ ۱۹۰۹ء) قابل ذکر ہیں۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے شیخ عبدالقادر انجمن مذکور کے اکتوبر ۱۸۹۶ء میں رکن منتخب ہوئے اس کے ساتھ ہی آپ کا تقرر بحیثیت جائنٹ سیکرٹری عمل میں آیا ۲۵۔ جون ۱۹۰۴ء میں آپ بارایٹ لاء کرنے کی غرض سے انگلستان تشریف لے گئے۔ چنانچہ آپ کی جگہ خالی ہونے پر جنرل کونسل انجمن اسلامیہ پنجاب کا جو اجلاس خان بہادر محمد برکت علی خاں جنرل سیکرٹری انجمن کی رہائش گاہ پر سردار محمد اسلم حیات خان ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی صدارت میں ۳ جولائی ۱۹۰۴ء کو منعقد ہوا، اس میں خان بہادر محمد برکت علی خاں کی تحریک اور خواجہ تصدق حسین کی تائید اور حاضرین کے اتفاق رائے سے مرزا عبدالرحیم سپرنٹنڈنٹ محکمہ انہار کو جائنٹ سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اجلاس مذکور میں مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کو "شمس العلماء" کا خطاب ملنے پر تہنیت نامہ بھیجنے کا فیصلہ کیا چنانچہ ۳ جولائی ۱۹۰۴ء کو خان بہادر محمد برکت علی خان نے شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کو ایک تہنیت نامہ ارسال کیا۔ چنانچہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۴ء کو مولانا الطاف حسین حالی نے تہنیت نامے کا جواب ارسال فرمایا۔ چونکہ مولانا موصوف کا یہ مکتوب نادر و نایاب ہے۔ اس لیے افادۂ عام کے لیے پیش خدمت ہے۔

۱۶جولائی ۱۹۰۴ء　　پانی پت

جناب من!

''شمس العلماء'' کا خطاب ملنے پر جس گرم جوشی اور مسرت کے ساتھ آپ نے خاکسار کو مبارک باد دی ہے اس کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں اور اس کو اپنے لیے ایک دستاویز فخر و امتیاز کی سمجھتا ہوں۔

جس اعزاز کے ساتھ انجمن نے خاکسار کو مبارک باد دی ہے، اس کو میں اس اعزاز سے کچھ کم نہیں سمجھتا جو گورنمنٹ کے خطاب سے نیازمند کو حاصل ہوا ہے۔ امید ہے کہ جناب ما چیز یہ شکریہ انجمن کے معزز ممبروں کی خدمت میں پہنچا کر مرہون منت بے پایاں فرمائیں گے۔ زیادہ حد ادب۔

آپ کا نیازمند
الطاف حسین حالی ۲۶

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مسٹر آرنلڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کے شیخ عبدالقادر کے دوستانہ مراسم تھے اور صاحب موصوف شیخ محمد اقبال کے استاد محترم تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں اور عرصہ تک فیکلٹی آف اورینٹل لرننگ کے ڈین رہے جب کہ سر لوئیس پئر وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی پریذیڈنٹ اور شیخ عبدالقادر، میاں محمد شاہ دین بار ایٹ لاء، لالہ ہنس راج ڈاکٹر ایچ ڈی گرس والڈ فیکلٹی مذکور کے اراکین رہے ۲۷۔

۱۹فروری ۱۹۰۴ء کو پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے پر ان کے اعزاز میں انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور نے ایک گارڈن پارٹی کا اہتمام کیا جس میں کثرت سے معزز اہل اسلام، ہنود اور انگریز صاحبان کو مدعو کیا گیا۔ اس جلسہ میں انجمن مذکور کی طرف سے پروفیسر آرنلڈ کی یادگار میں ایک نقرئی میڈل اس مسلمان طالب علم کو دینے کا فیصلہ کیا گیا جو فارسی زبان میں اول رہے۔ چنانچہ انجمن نے چار سو روپے کی رقم کے ''پیرامیری نوٹ'' خرید کر رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی لاہور کی خدمت میں بھیجے تا کہ وہ ہر سال اس کے منافع سے ایک میڈل کا انتظام کر دیا کریں۔

آرنلڈ میڈل کے لیے جن ممتاز مسلمان بزرگوں نے چندہ دیا ان میں حاجی نواب فتح علی خاں، خان بہادر محمد برکت علی خاں، آنریبل مولوی جسٹس میاں محمد شاہ دین بار ایٹ لاء، میاں محمد شاہ نواز بار ایٹ لاء، فقیر سید افتخار الدین، منشی مولوی محبوب عالم، مولوی سید ممتاز علی، مولوی انشاء اللہ خاں اور شیخ عبدالقادر ایڈیٹر پنجاب آبزرور بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ۲۸

اسی طرح ۲۲فروری ۱۹۰۴ء کو انجمن حمایت اسلام لاہور نے پروفیسر آرنلڈ کے اعزاز میں اسلامیہ کالج لاہور میں ایک ''ٹی پارٹی'' کا انتظام کیا جس میں لاہور کے معززین بکثرت شریک ہوئے یہ ایک نہایت بارونق اور شاندار جلسہ تھا، اس جلسہ میں شیخ عبدالقادر بھی شریک ہوئے جو انجمن مذکور کی مجلس منتظمہ کے رکن اور آنریری جنرل سیکرٹری بھی رہے۔ سب سے پہلے ایک مطلع کاغذ پر لکھا ہوا ''سپاسنامہ'' پڑھا گیا جو صدر انجمن نے پروفیسر آرنلڈ کو پیش کیا۔ بعد ازاں سید امجد علی اشہری اور حافظ محمد اسلم خاں پیسہ اخبار لاہور نے یکے بعد دیگرے نظمیں پڑھیں۔ نظموں کے بعد پروفیسر آرنلڈ نے انگریزی زبان میں تقریر کی جس کا اردو ترجمہ حاضرین کی سہولت کے لیے پیش کیا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پروفیسر آرنلڈ انجمن مذکور کے چند رہ سال رکن رہے

اور قریباً ہر سال سالانہ جلسہ میں اور دیگر جلسوں میں شرکت کرتے رہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے انجمن مذکور سے اپنے تعلق خاطر کا ذکر کرتے ہوئے اپنی الوداعی تقریر کے آخر میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا:

''میں ہمیشہ اس انجمن کی ترقی کو نہایت دلچسپی سے دیکھتا رہوں گا اور نہایت ہی مشکور ہوں گا اگر اس کی کارروائیوں کی خبر وقتاً فوقتاً مجھے ملتی رہے گی۔ میرے کئی پرانے دوست میرے گرد دکھائی دیتے ہیں جن سے جدا ہونا نہایت ہی شاق ہے۔ آپ مجھے ہمیشہ مہربانی سے بلاتے رہے ہیں اور میں آپ کو نہایت شکریہ سے یاد رکھوں گا۔ میں یہاں محض مشاہدہ کنندہ کی طرح نہیں آتا رہا ہوں یا کہ کام میں آپ کا مددگار ہو کر آتا رہا ہوں۔ اب میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کے کام میں ترقی ہو اور الوداع کہتا ہوں''۔ ۲۹

یکم جنوری ۱۸۸۷ء کو ''انجمن مستشار العلماء'' لاہور کے نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا تا کہ علمائے اسلام میں صلح و اتفاق پیدا کیا جائے، علوم عربی کی ترقی اور اس کی اصلاح کی کوشش کے علاوہ منتخب چیدہ علماء کی جماعت سے ایک ''دارالافتاء'' بنایا جائے جو جدید واقعات کی بابت علمائے مذہب سے مشورہ لے اور مختلف آراء کے دلائل و وجوہات کو سنجیدگی اور متانت کے ساتھ وزن کرنے کے بعد ایک مناسب فیصلہ کرے''۔ ۳۰

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''انجمن مستشار العلماء'' لاہور کے ناظم (بانی) مولانا مفتی محمد عبداللہ ٹونکی اور دیگر ممتاز اور مقتدر عہدے داروں میں حضرت پیر سید جماعت علی شاہ اور مولوی غلام محمد بگوی امام شاہی مسجد لاہور شامل ہیں ۳۱۔ انجمن مذکور روئدادوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شیخ عبدالقادر کا بھی انجمن سے تعلق خاطر تھا اور جنوری ۱۸۹۷ء تا ۳۰ ستمبر ۱۹۰۱ء (بمطابق ۲۷ رجب المرجب ۱۳۱۴ھ تا ۱۶ جمادی الاخری ۱۳۱۹ھ) کی رپورٹ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شیخ صاحب موصوف نے اجلاس انجمن میں پہلی بار شرکت نہیں کی بلکہ قبل ازیں بھی وہ شریک ہوتے رہے اور لیکچر بھی دیتے رہے۔ چنانچہ جنوری ۱۸۹۷ء کے اجلاس میں آپ نے شرکت فرمائی اور ''شہرت عام اور بقائے دوام'' کے عنوان کے تحت ایک تفصیلی لیکچر دیا۔ اجلاس کی روئداد میں شیخ عبدالقادر کے بارے میں تحریر ہے:

''رپورٹ سنائے جانے کے بعد جناب مولوی شیخ محمد عبدالقادر صاحب بی۔اے ایڈیٹر ''پنجاب آبزرور'' تشریف لائے اور اپنا لیکچر جو نہ صرف فصاحت اور بلاغت ہی کے قیمتی زیوروں سے آراستہ کیا ہوا تھا بلکہ واقعات کی حقیقت اور اصلیت کے بیش بہا جواہرات سے بھی مرصع تھا، پڑھنا شروع کیا۔ جناب شیخ ممدوح کی شہرت اور ناموری ملک میں ایسی نہیں ہے کہ ان کے انٹروڈیوس کرنے کی ضرورت ہو۔ آپ کے لیکچر جس شان کے پُرمغز اور مدلل ہوتے ہیں، ان کا یقین کرنے میں پبلک کو میری تعریف و توصیف کا مطلق انتظار نہیں ہے اور اس لیے میں چند کلمات میں ان کے حسن و خوبی کو محدود نہیں کرنا چاہتا''۔

جناب مولوی شیخ عبدالقادر صاحب .....بھی انجمن کے حالات اپنے معزز اخبار میں وقتاً فوقتاً مشتہر فرمانے سے ممنون فرماتے رہے ہیں، جن کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے''۔ ۳۲

شیخ عبدالقادر نے اپنے طول طویل لیکچر میں فطرتِ انسانی کا کہ وہ شہرت و ناموری کا خواہاں ہوتا ہے، اس طرح آغاز فرمایا:

''انسان کے دل کو ٹٹولو تو اس کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ خواہش چھپی ہوئی پاؤ گے کہ کسی طرح پس مرگ دنیا میں نام

باقی رہ جائے .....آدمی غیر مہذب حالت میں ہو، نیم مہذب ہو، یا شائستگی اور ترقی کے اعلیٰ زینہ پر شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں نام لکھوانے کا ضرور مشتاق ہوتا ہے''۔

شیخ صاحب کا مکمل لیکچر اسی انسانی فطری خواہش کے گرد گھومتا ہے اور اہرام مصر سے لے کر مساجد، معابد، گرجاؤں، مصنفین، مورخین، معلمین، کتب اور کتب خانوں، اولاد، اور کتب خانوں میں بالخصوص کتب خانہ انجمن مستشار العلماء کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد اسلامی کتب خانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خلفائے بنی امیہ کے کتب خانوں بغداد، قرطبہ، اندلس، خلیفہ منصور، خلیفہ ہارون الرشید، نوح بن منصور (بخارا کے کتب خانے)، سلطان روم کے کتب خانوں، برٹش میوزیم، فارسٹر لائبریری، ریاست رامپور کے کتب خانوں اور آخر میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور کا نہایت فصیح و بلیغ انداز میں تذکرہ فرمایا کہ سامعین عش عش کر اٹھے!

محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا بارھواں اجلاس لاہور میں ۲۷ تا ۳۰ دسمبر ۱۸۹۸ء منعقد ہوا۔ کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۸۹۸ء بروز سہ شنبہ بوقت ۸ تا ۱۱ بجے نواب حاجی فتح علی خان قزلباش رئیس لاہور و تعلقدار صوبہ اودھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نواب محمد حیات خان صدر استقبالیہ کمیٹی نے ممبران کانفرنس کا خیر مقدم کیا۔ سر سید احمد خاں مرحوم اور خان بہادر محمد برکت علی خاں کی خدمات کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد صدر اجلاس اور نواب محسن الملک صاحبان نے تقاریر کیں نیز نواب صاحب نے کانفرنس کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ ازاں بعد مختلف اصحاب نے مجوزہ محمڈن یونیورسٹی پر تقاریر کیں جن میں تھیوڈر ماری سن، مولوی بدر الحسن، میاں محمد شاہ دین وغیرھم کے نام قابل ذکر ہیں۔

دوسرا اجلاس بھی نواب فتح علی خان قزلباش کی صدارت میں ڈیڑھ بجے منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں بھی مجوزہ محمڈن یونیورسٹی کے بارے میں تقریریں ہوئیں۔ سب سے پہلے پروفیسر ضیاء الدین احمد ایم۔ اے پروفیسر علی گڑھ کالج نے ایک طویل تقریر کی۔ اس کے بعد جناب تھیوڈر بیک نے بڑے مدلل انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بعد ازاں صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے جسٹس بدر الدین طیب جی اور سید امیر علی کی نواب محسن الملک کے نام چٹھیاں پڑھ کر سنائیں۔ اس سے پہلے پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ نے علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پھر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کی آراء جو انہوں نے مجوزہ یونیورسٹی کے بارے میں ارسال کی تھیں، پڑھ کر سنائی گئیں۔ ازاں بعد مولوی سید عباس حسین پروفیسر عربی و فارسی مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی رائے پیش کی گئی جو انہوں نے لکھ کر نواب محسن الملک کو بھیجی تھی۔ سید عباس حسین کی تحریر کے بعد شمس العلماء مولوی امداد امام کی رائے پڑھ کر حاضرین کو سنائی گئی پھر مولوی الطاف حسین حالی کی طویل رائے اور نظم سنائی گئی۔ مولانا موصوف بیماری کی وجہ سے خود تشریف نہ لا سکے۔ یہ فرض نواب محسن الملک نے انجام دیا۔ پھر چودھری خوشی محمد صاحب کی رائے کا اظہار کیا گیا۔ اس کے بعد مولوی رفیع الدین صاحب کے انگریزی مضمون کا ترجمہ پیش کیا گیا جو انہوں نے لندن سے بھیجا تھا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ شیخ عبد القادر نے بھی محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی اور اس میں تقریر بھی کی۔ آپ نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ اور لب لباب پیش کیا جاتا ہے:

''نواب محسن الملک بہادر کی تعمیل ارشاد کے موافق کہ مجھ کو بھی کچھ بیان کرنا چاہیے، عرض کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوا ہوں۔ میری رائے اس معاملہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی اس رائے سے متفق ہے کہ 'فیس' کی قید جو کمیشن نے تجویز کی

ہے، نہیں لگانی چاہیے۔

سب سے بڑی وجہ اس کی یہ ہے جو کہ یونیورسٹی کمیشن کے قواعد میں شامل ہے کہ کوئی کالج اس وقت تک کالج نہ تسلیم کیا جائے گا جب تک کہ یونیورسٹی کمیشن کو یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ اس کالج میں عمدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس شرط کے ہوتے ہوئے میں کوئی وجہ نہیں پاتا کہ دوسری قید لگائی جائے اور کیوں فیس بڑھانے پر مجبور کیا جائے۔

سر سید احمد خان نے کالج قائم کرنے سے پہلے یہ اصول اختیار کیا کہ فیس کی تعداد کم رکھی جائے لیکن اس کے ساتھ پروفیسر خاص قابلیت کے ہوں اور ایسا ہی انہوں نے کیا چنانچہ انہی اصولوں پر آج آپ کو فخر و ناز ہے۔

مجھے وہ وقت اور سر سید احمد خان کا وہ مضمون یاد ہے جبکہ ایڈڈ اسکولوں کے لیے دو تہائی فیس لینے کا تعین کیا گیا۔ اس حکم کے نفاذ پر ان کو بڑا رنج ہوا اور انہوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے ایک مضمون لکھا جس کا ایک فقرہ یہ ہے کہ ''اے مسلمانو! تمہاری قوم پر افسوس ہے اور شرم۔ اگر قوم ہماری مدد کرتی تو آج ہم کو گورنمنٹ کی ایڈ کی ضرورت نہ ہوتی اور کیوں دو تہائی فیس کی قید اٹھائی پڑتی۔ سر سید نے یہ حکم ماننے کو تو مانا لیکن بورڈنگ کی مقررہ فیس میں کمی کر دی۔ جس کی نسبت کہا گیا کہ یہ طریقہ ہمارے قواعد کو توڑنے والا ہے''۔ ۳۳

یہ بات نہ صرف محل نظر بلکہ قابل ذکر ہے کہ جس زمانے (یعنی ۱۸۹۹ء) میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا ایک ڈیپوٹیشن ریاست بہاول پور میں انجمن کے مقاصد کی ترویج و اشاعت کے لیے گیا تو شیخ عبدالقادر نے انجمن مذکور کے قائم مقام جنرل سیکرٹری کے فرائض انجام دیے۔ ۳۴

قبل ازیں بیان کیا گیا ہے کہ شیخ عبدالقادر انجمن حمایت اسلام لاہور کے سٹیج پر پہلی بار ۱۸۹۳ء میں جلوہ افروز ہوئے اور ''کلمہ طیبہ'' کے متبرک اور مقدس موضوع پر ایک مضمون پیش کیا۔ ۳۵

شیخ عبدالقادر نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ اجلاس کے تیسرے جلسے میں جو ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد خان دہلوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اپنا بے مثل اور گراں قدر لیکچر بعنوان ''شد پریشاں خوابمن از کثرت تعبیرہا'' پیش کیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ شیخ محمد اقبال سب سے پہلی مرتبہ اسی جلسے میں شریک ہوئے اور اپنی بے بدل نظم الموسوم بہ ''نالۂ یتیم'' پڑھی۔ ۳۶

اس سلسلے میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس زیر نظر کی روئداد میں تحریر ہے:۔

''نماز عصر کے بعد صحن لوگوں سے پُر ہو گیا۔ شیخ محمد اقبال ایم۔ اے کی بے بدل نظم الموسوم بہ ''نالۂ یتیم'' اور شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے کے فصیح اور مفید قوم لیکچر سننے کا شوق ہزارہا آدمیوں کو کھینچ لایا۔

شیخ عبدالقادر صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنا لیکچر جس کا موضوع تھا ''شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا'' پڑھنا شروع کیا۔ شیخ صاحب کی لیاقت اور خوش بیانی کا کون شخص ہے جو قائل نہیں چند سال سے انجمن کے سالانہ جلسہ میں لیکچر دیتے ہیں اور ہر جلسے میں بالکل نئے مضمون پر تقریر کرتے ہیں اور مضمون بھی ایسا جس کے بیان کرنے کی قوم کو سخت ضرورت ہے''۔

شیخ عبدالقادر نے اپنے لیکچر میں مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی، مذہب کے معاملے میں افراط و تفریط اور فرقہ بندی، انگریزی کی ضرورت، اخبار نویسی بطور ایک نیا فن کے نہایت اہم اور ناگزیر موضوعات پر اظہار خیال فرمایا اور قابل ذکر بات تو یہ

ہے کہ لیکچر کے دوران جابجا اردو اشعار، قرآن کریم اور احادیث مقدس کے حوالے دیے۔ مذہبی فرقہ اور گروہ بندی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بڑے دکھ اور قلق سے فرمایا:

''مجھے تھوڑا عرصہ ہوا کانفرنس کی تقریب سے کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا اور میں راستہ میں کئی ایک مقامات پر ٹھہرا جن میں دہلی، علی گڑھ، کانپور، الہ آباد اور واپسی میں پٹنہ بنارس اور لکھنو قابل ذکر ہیں مگر

''بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست''

قومی کاموں میں جس بے توجہی کی نسبت یہاں کے مسلمانوں کے لبوں پر شکایت تھی اس سے زیادہ بے توجہی وہاں پائی بلکہ وہاں کے حالات دیکھ کر قدرے عافیت معلوم ہوئی اور لاہور میں اور اہل لاہور کو پھر غنیمت سمجھا۔ کئی جگہ تو یہ سنا کہ کبھی برسوں میں مسلمانوں کا کوئی مجمع نہیں ہوتا۔ ہر جگہ یہی شکایت پائی کہ اگر چار آدمی کچھ تحریک کار خیر پر آمادہ بھی ہوں تو گاڑی میں روڑا اٹکانے والے جھٹ سے آموجود ہوتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان لوگوں کی جماعت میں کچھ ایسا ایکا اور باہمی قرارداد ہے کہ سب کے حیلے بہانے اور حجتیں ایک ہی ہیں۔ دہلی میں چند آدمیوں کا روزگار یہی پایا کہ مقلدوں اور اہل حدیث کو لڑاویں۔ ہزاروں روپے مدتوں سے اس بکھیڑے پر صرف ہو رہے ہیں اور آج تک ڈھاک کے وہی تین پات! وہی جھگڑے، وہی معرکے۔ مقلد جانتے ہیں کہ وہ اسلام کی خدمت ان جھگڑوں سے کر رہے ہیں۔ اہل حدیث سمجھتے ہیں کہ وہی اسلام کا جھنڈا کفر کے برخلاف گاڑ رہے ہیں۔ جو خدا کو ہی نہ مانیں ان کے مسلمان کرنے کی ضرورت نہیں جو کثرت آلہ کے معتقد ہوں ان سے بحث نہیں مگر خدا اور رسول اکرمؐ کے ماننے والوں سے فروعات پر تکرار ہے''۔ ۳۷

ندوۃ العلماء کا ساتواں اجلاس ۴ تا ۶ نومبر ۱۹۰۰ (بمطابق ۱۰ تا ۱۲ رجب ۱۳۱۸ھ بروز یک شنبہ تا سہ شنبہ عظیم آباد پٹنہ میں منعقد ہوا۔ شیخ عبدالقادر جن کا ندوۃ سے تعلق خاطر تھا انہوں نے نہ صرف اس اجلاس میں شرکت کی بلکہ ''کتب خانہ ندوۃ'' کے موضوع پر ایک پُرمغز اور معلومات افزا تقریر بھی کی۔ آپ ان دنوں پنجاب آبزرور کے چیف ایڈیٹر تھے۔ روئداد جلسہ میں مذکور ہے کہ ''شیخ عبدالقادر نے اپنی تقریر سے پیشتر روسائے لاہور کی طرف سے ایک ''پیغام'' پڑھ کر سنایا''۔ ۱۲۷ الف

یہ پیغام نہایت ایمان افروز اور فکر انگیز تھا۔

شیخ عبدالقادر نے ندوۃ العلماء کے اجلاس سوم منعقدہ ۱۲ رجب (۶ نومبر) بروز سہ شنبہ میں بھی شرکت فرمائی اور تقریر بھی کی چنانچہ اس سلسلے میں روئداد میں مذکور ہے:

''ان کے بعد ہمارے معزز دوست منشی شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے، ایڈیٹر پنجاب آبزرور لاہور کھڑے ہوئے اور ایسی مسلسل اور برجستہ تقریر کی جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ اس تقریر کی برجستگی کے اظہار کی حاجت نہیں۔ ناظرین اس کو دیکھ کر خود اندازہ کر سکتے ہیں''۔

اس تقریر سے متاثر ہو کر سید سلیمان ندوی نے جو اجلاس میں موجود تھے، شیخ عبدالقادر کا شاندار خراج تحسین پیش کیا۔ ۳۷ب

شیخ عبدالقادر نے جس خوبصورت اور انوکھے انداز سے تقریر کا آغاز کیا جی چاہتا ہے اسے پیش کیا جائے۔ آپ نے فرمایا:

''کل میں نے کچھ وکالتاً عرض کیا تھا اور آج کچھ مجھے اصالتاً عرض کرنا ہے۔ آپ شاید جانتے ہیں کہ میں اخبار نویس ہوں

اس لیے جو کچھ مجھے اصالتاً کہنا ہے وہ محض ایک خبر ہے مگر وہ خبر آپ کو سنانے سے پہلے میں یہ کوشش کروں گا کہ آپ اسے سچ مان لیں۔ اخبار نویسی ہندوستان میں ابھی ایسی پست حالت میں ہے کہ عام طور پر سوائے خاص استثناؤں کے اخبار نویس اعتبار سے نہیں دیکھے جاتے۔ کبھی کسی نے جو ایک آدھ بے پر کی اڑا دی تو ملک کا خیال ہو گیا کہ اخباروں میں چنڈو خانہ کی گپ ہوا کرتی ہے۔

اب آپ کو اعتبار آئے تو کیونکر کہ میں جو خبر آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ صحیح اور بالکل صحیح اور مستند اور بالکل مستند ہے گو بظاہر آپ کو باور نہ آ سکے لیکن اول تو یہ کہ اخبار پنجاب آبزرور جس سے مجھے گزشتہ پانچ سال سے تعلق ہے، حتی الوسع خبروں کے بارے میں محتاط ہے اور خبر کا دیر سے چھپنا بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اس سے کہ جلدی میں غیر مستحق خبر چھپ جائے۔ البتہ رپورٹر کے بارے میں معذور ہے۔ ''نقل کفر، کفر نباشد'' دوسرے یہ کہ جیسے کوئی نیا شخص جسے آپ پہلے نہ جانتے ہوں چال چلن کے سندات پیش کرتا ہو۔ میں آپ کو دو مقتدر اور معزز انجمنوں یعنی انجمن اسلامیہ پنجاب اور انجمن حمایت اسلام لاہور کا حوالہ دیتا ہوں جن کی نیابت کا اس وقت مجھے فخر حاصل ہے تا کہ میرا تخن قرین اعتبار ہو۔ جب میں آپ سے یہ کہوں کہ آج کل اہل اسلام کے افلاس کی اس قدر شکایت ہے اور اس پر اسلامیوں کے دفینے جا بجا موجود ہیں کیوں نہیں ان دفینوں کو کھودتے اور نکالتے اور استعمال میں لاتے ہیں''۔ ۳۷ ج

انجمن حمایت اسلام لاہور کے سولہویں سالانہ اجلاس (۲۲ تا ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء) کے تیسرے جلسے منعقدہ ۲۲ فروری ۱۹۰۱ء بروز جمعۃ المبارک جو شیخ وزیر الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر محکمہ انہار کی صدارت میں ہوا، شیخ عبدالقادر نے نہ صرف شرکت کی بلکہ ''ہمارے بدترین دشمن'' کے عنوان سے ایک لیکچر بھی دیا۔ اس اجلاس کی صدارت جسٹس میاں محمد شاہ دین کو کرنا تھی جو بوجوہ تشریف نہ لا سکے۔ چنانچہ خلیفہ عماد الدین کی تحریک، سیکرٹری انجمن کی تائید اور حاضرین جلسہ کے اتفاق سے شیخ وزیر الدین صدر جلسہ منتخب ہوئے۔

اسی طرح اس اجلاس کے مقرر رئیس غلام محمد پلیڈر لاڑکانہ (سندھ) بوجہ ایک سرکاری کام کے تشریف نہ لا سکے اس لیے ان کی جگہ ایک انگریزی لیکچر کا دینا ہمارے لائق اور طباع دوست شیخ عبدالقادر نے منظور کیا گو اس سے پہلے انہوں نے اردو لیکچر کا ذمہ لیا ہوا تھا اور اس کی تیاری میں مصروف تھے اور انگریزی لیکچر کی تیاری کے لیے کافی وقت بھی نہ تھا مگر پھر بھی اس جواں مرد نے اپنی لیاقتِ خداداد کے بھروسے انگریزی لیکچر کے سخت تر کام کا بوجھ بھی خاکسار کے کہنے سے اٹھا لیا۔

پونے آٹھ بجے شیخ عبدالقادر صاحب بی۔اے ایڈیٹر پنجاب آبزرور نے لیکچر دینا شروع کیا۔ شیخ صاحب کی لیاقت اور طرز بیان کسی مدح اور تعریف کی محتاج نہیں۔ انہوں نے اس باب میں کافی شہرت ملک میں حاصل کر رکھی ہے۔ اس لیکچر کا مضمون تھا ''ہمارے بدترین دشمن''۔

''اس میں ان لوگوں کی جو محض نفسانیت کی وجہ سے مسلمانوں کی ترقی کے سد راہ ہوتے اور ان کی سیدھی اور صاف اور اسلام کے مطابق کارروائیوں میں ناحق اعتراض اور بے جا نکتہ چینیاں کرتے ہیں، قلعی کھولی تھی اور ان کو نصیحت کی تھی کہ وہ اس نامعقول اور معیوب طریق کو چھوڑ دیں۔ اس کے ساتھ ہی لائق لیکچرار نے مسلمانوں کی سخاوت اور ان کی خیرات، سخاوت و خیرات کے قابل اصلاح طریقوں کا بیان کر کے بتایا کہ اگر مسلمانوں کی خیرات کا روپیہ جس کا اندازہ ان کے خیال میں ایک کروڑ روپے سالانہ ہے، کسی منضبط اور منظم طریق سے جمع ہو اور مسلمانوں کی موجودہ ضرورتوں پر صرف کیا جائے تو تھوڑے ہی عرصہ میں اس قوم

کے دن پھر جائیں اور ان کی پژمردہ حالت میں شگفتگی پیدا ہو اور پھر دنیا میں ایک مقتدر، معزز اور نیک نام قوم بن جائے۔ قابل لیکچرار نے اس مدعا کو حاصل کرنے کی یہ تجویز پیش کی کہ موجودہ طریق خیرات کی اصلاح کے لیے جا بجا کمیٹیاں قائم ہوں اور وہ اس امر میں ہمہ تن سعی کریں کہ مسلمانوں کی خیرات کا روپیہ متفرق اور بے نتیجہ طور پر صرف نہ ہو بلکہ ایک جگہ جمع ہو کر اس کے مناسب حصے کیے جائیں اور دینی اور قومی مجلسوں کو ان کی ضرورت اور حق کے مطابق ان میں سے حصہ دیا جائے اور مسلمانوں کی دیگر ضروریات میں بھی جس کا کسی انجمن نے ابھی تک ذمہ نہیں لیا، اسی میں سے مدد دی جاوے''۔

لیکچر کے اختتام کے بعد خلیفہ عماد الدین صاحب نے لیکچر کا اردو ترجمہ (خلاصۂ مضمون) ان لوگوں کے افادہ کے لیے جو انگریزی نہیں جانتے تھے، سنایا۔ اس کے بعد صدر جلسہ نے فرمایا:

''صاحبان! سیکرٹری صاحب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آج کے لیکچرار کا شکریہ ادا کروں لیکن اگر سیکرٹری صاحب نہ بھی فرماتے تو میں نے اس فرض کو ادا کرنا ہی تھا۔ لہٰذا میں شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے کا جنہوں نے کمال خوبی اور متانت کے ساتھ انگریزی لیکچر دیا ہے، شکریہ ادا کرتا ہوں نہ اس واسطے کہ ان کو میرے شکریہ کی ضرورت ہے بلکہ اس لیے کہ ہم پر ان کو جو حق ہے، اسے ادا کرنا ہے۔ اس لیکچر میں شیخ صاحب نے ایک عمدہ تجویز پیش کی ہے اور گو وہ خیالی طور پر بڑی خوش کن اور تسلی دہ معلوم ہوتی ہے مگر پریکٹیکل طور بڑی مشکل ہے مگر چونکہ انہوں نے کہا ہے کہ اہل الرائے صاحبان اس کو سوچیں اور اس پر غور کریں تا کہ یہ تجویز کسی طریق سے ممکن التعمیل ہو اور اس سے قوم کو ایک بیش قیمت جائیداد مل سکے۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ''مسلمان ہر سال ایک کروڑ روپیہ خیرات میں خرچ کرتے ہیں مگر انجمنوں کو اس کثیر المقدار رقم کا ایک قلیل حصہ ملتا ہے، ان کا یہ فرمانا بالکل سچ ہے مگر بدنصیبی سے زیادہ تر لوگ ہم میں سے ہی ہیں جو نہیں جانتے کہ کہاں خرچ کرنا چاہیے تاہم اس تجویز پر غور کرنا ضروری ہے اور میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں''۔ ۳۸

شیخ عبدالقادر نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سولہویں سالانہ اجلاس کے ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء بروز اتوار کے دوسرے جلسے میں جو مولوی انعام علی شیخ صاحب ڈویژنل جج سیالکوٹ کی زیر صدارت انعقاد پذیر ہوا، ''گریہ وخندہ'' (رونا اور ہنسنا) کے عنوان کے تحت تقریر کی۔ اس ضمن میں روئداد جلسہ میں مذکور ہے:

''اس کے بعد صاحب صدر جلسہ نے شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے ایڈیٹر پنجاب آبزرور کی تقریب کی اور فرمایا کہ اب ہمارے لائق اور نوجوان دوست اردو میں لیکچر دیتے ہیں''۔

شیخ صاحب موصوف نے ''رونا اور ہنسنا'' کے نیچرل مضمون پر لیکچر دینا شروع کیا۔ شیخ صاحب اب ہماری کسی تقریب اور تعریف کے محتاج نہیں رہے۔ ملک وقوم کے ہر طبقے اور قابلیت کے لوگ ان کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ تمہیدی امور میں بھی ان کی استعداد اور قابلیت کا تھوڑا سا تذکرہ ہو چکا ہے اور ان کی شہرت عامہ کی وجہ سے اس جگہ اس مختصر تذکرہ کے اعادہ کی بھی حاجت نہیں۔ یہ لیکچر قابل دید ہے پس جس کو اس کے پڑھنے کا شوق ہو اور یقین ہے کہ سب کو ہوگا''۔ ۳۹

شیخ صاحب کا یہ لیکچر اس قدر فکر انگیز، پُرمغز اور ایمان افروز ہے کہ جی چاہتا ہے آپ حضرات بھی اس سے مستفید ہوں۔ چنانچہ ''ہنسنا اور رونا'' کے حوالے سے چند اقتباسات حاضر خدمت ہیں:۔

''انسان میں یہ خاصیت عجیب عجیب نیرنگ دکھاتی ہے۔ کبھی تو کسی کا تبسم بن کر عشاق کی جان پر بجلیاں گراتی ہے۔ کبھی

آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی کو ہنساتی اور تبسم نازنام پاتی ہے۔کبھی کھیلتی ہے،کبھی کھلاتی ہے۔کوئی دردندان کی جھلک کے گیت گا رہا ہے۔کوئی مسکراہٹ میں نہ کھلنے والے لبوں کے انداز پر مٹا جاتا ہے ایسی حالت میں یہ کہنا کہ کسی درندیا پرندیا چرند میں اس کا کوئی شمہ بھی پایا جاتا ہے،مشاہدہ کی جنگ اور تجربہ کا ازالہ حیثیت عرفی ہے اور ہنسنے کی طاقت کو انسانی خصوصیت ماننا لازم آتا ہے''۔

''جب تک مسلمانوں میں افلاس ہے،یہ رونا،رونا پڑے گا۔جب تک تعلیم کی کمی ہے،یہ دکھڑا سننا،سنانا ہوگا۔جب تک ہم میں اتفاق نہیں،گریہ سے بھی چارہ نہیں۔اس کمی اور نقصان کو کسی پہلو سے دیکھیں،کف افسوس ملیں گے۔دفاتر میں اگر تھوڑی صورتیں مسلمانوں کی دکھائی دیں گی تو دل دکھے گا۔عدالتوں میں اگر ان کو اغیار کا دست نگر پائیں گے تو کڑھنے سے رک نہیں سکیں گے۔طب یونانی ان کے ہاتھوں سے رفتہ رفتہ نکلتا اور طب انگریزی میں نسبتاً کم ترقی دیکھیں گے تو کیوں کر نہ جلیں گے''۔

منظور ہے رو رو کے رلانا ہمیں ورنہ
ہنسنا نہیں آتا کہ ہنسانا نہیں آتا

''دور کیوں جاتے ہو اپنے مقدس پیشوا افضل الانبیاء محبوبِ خدا کے حالات پر ہی نظر ڈالو۔ان کی یتیمی دیکھو۔ان کا بچپن دیکھو۔ان کی جوانی دیکھو۔ان کا بڑھاپا دیکھو۔ایک سلسلۂ طویل ہمدردی انسانی کا ہے۔ان کی محنت،ان کی ریاضت،ان کی عبادت اور ان سب کے بعد رسالت کا بھاری بوجھ لے کر حرا سے اترنا اور قوم کو پہلی دفعہ پیغام الٰہی سنانا اور قوم کا بے توجہی دکھانا،قوم کا ان کا مبارک لبوں پر جو کبھی سوائے حرف حق کے کسی اور حرف سے آشنا ہی نہ تھے،جھوٹ کی تہمت لگانا،پیغمبر برحق کو ساحر اور مجنون بتانا،اس کی جان کا دشمن تھا،ان کو ڈرانا،ان کو دھمکانا،خدا جانے اس پاک دل کی اس وقت کیا حالت ہوگی ؎

جورِ اخواں بردن و در بند اخواں زیستن
زخم پیکان خوردن و مشتاق پیکاں زیستن ۴۰

جب سے انگریزوں نے برصغیر کی حکومت سنبھالی تھی اسی وقت سے مسلمان ان کی نظروں میں معتوب تھے۔انگریز مسلمان حکمرانوں کی ہر یادگار کو مسخ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ہندو ان کے مددگار تھے۔اردو زبان کا ڈھانچہ اگرچہ ہندی الاصل تھا مگر وہ اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے تھے اسی لیے اس زبان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔انگریزوں اور ہندوؤں کی ملی بھگت سے ۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۸۹۷ء تک مختلف اوقات میں بے شمار موقعوں پر اردو کو تیغ کرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں۔۱۸۹۸ء میں ہندی زبان کے ہندو حامیوں نے بے شمار دستخطوں کے ساتھ ایک محضر نامے کے ذریعے سر اینٹونی میکڈانل لیفٹنٹ گورنر یوپی سے مطالبہ کیا کہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ہندی کو رائج کیا جائے۔اس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء کو یوپی کی عدالتوں میں ہندی دیوناگری رسم الخط جاری کر دیا جس کا اصل مفہوم ہندی زبان تھا۔

نواب سید مہدی علی خاں محسن الملک (۱۸۳۷ء۔اکتوبر ۱۹۰۷ء) علی گڑھ ٹرسٹ کے سیکرٹری اور سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کے جانشین نے اس نئے فتنے کا جواب دینے کے لیے ۳ مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ ٹاؤن ہال میں ایک کامیاب جلسہ عام میں سر اینٹونی میکڈانل کے ان اقدامات کی نہ صرف شدید مذمت کی بلکہ ''اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن'' بھی قائم کر دی۔۱۷/۱۸/اگست ۱۹۰۰ء کو لکھنو میں نواب محسن الملک کی صدارت میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا جو بہت کامیاب رہا۔اس جلسے میں پنجاب کی نمائندگی شیخ عبدالقادر،میر غلام بھیک نیرنگ اور مرزا اعجاز حسین نے کی۔اینٹونی میکڈانل اس بات سے خاصا برہم تھا کہ

پنجاب سے تین آدمی کیوں اس جلسے میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ان کی نقل وحرکت کی خاصی نگرانی کی جا رہی تھی۔اس عظیم الشان جلسہ میں شیخ عبدالقادر نے خطاب میں فرمایا:

''اردو کا مسئلہ صرف صوبہ جات متحدہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ سارے ملک کے ان حصوں سے متعلق ہے جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ہم ''مجروح اردو'' کی پکار سن کر آئے ہیں''۔ ۴۱

شیخ عبدالقادر اس ضمن میں فرماتے ہیں:

''جب لکھنو میں اردو پر ہندی کی یورش ہوئی تو ایک تہلکہ مچ گیا۔نواب محسن الملک کی صدارت میں اجلاس ہوئے۔پنجاب سے میں، نیرنگ اور اعجاز بھی گئے۔ہمارے جانے سے وہاں بڑی تشویش پیدا ہوئی۔سی آئی ڈی والے ان سے دریافت کریں کہ یہ تین پنجابی یوپی میں کیوں آئے؟ ہمارے والد صاحبان کے نام دریافت کیے گئے۔حامد علی خاں صاحب سیکرٹری تھے۔انہوں نے نہ بتایا۔ مجھے خیال آیا کہ کہہ دوں: ''وجہ یہ ہے کہ جو یوپی کی ''اردو مقتول'' ہوئی تو اس نے ''پنجاب کی اردو'' کو آواز دی، خبردار! ہم تو اپنی مصیبت کے علاج کے لیے آئے ہیں۔مجھے ایک انگریزی Stanza یاد آیا۔ہمارے مزاق ذرا کم بولتے ہیں:

Remember me as you pass by,

As you are now once was I:

As I am now so you shall be,

So prepare yourself to follow me.۴۲

نواب محسن الملک نے وہ دھواں دھار تقریر جو ریکارڈ کیے جانے کے قابل تھی اور کہا: ''اردو نہیں مرے گی، اگر مرے گی تو عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے'' کے مصداق اس کا جنازہ بھی دھوم سے نکلے گا''۔ ۴۳

شیخ عبدالقادر نے ایک دوسری جگہ یوں تحریر فرمایا ہے:

''آخر میں نواب صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ اگر حکومت اردو کو مٹانے پر ہی تُل گئی ہے تو بہت اچھا! ہم ''اردو کی لاش'' کو دریائے گومتی میں بہا کر خود بھی ساتھ ہی مٹ جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا:

چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے ۴۴

''چونکہ نواب صاحب علی گڑھ کالج کے سیکرٹری تھے اور کالج کو (حکومت سے) گرانٹ ملتی تھی، فوراً نوٹس آیا کہ علی گڑھ کالج کی گرانٹ بند، گو حضور میکڈانل کو بہت تکلیف ہوئی لیکن وہ جملہ کام کر لیا گیا، ہندی اردو یکجا کر دی گئی''۔ ۴۵

''اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن'' کے زیر اہتمام احتجاجی جلسہ ۱۷/ ۱۸/ اگست ۱۹۰۰ء کو منعقد ہوا جس میں شیخ عبدالقادر نہ صرف شریک ہوئے بلکہ تقریر بھی کی۔چنانچہ ''اردو ہندی تنازعہ'' کے سلسلے میں شیخ عبدالقادر اور نواب وقارالملک مولوی مشتاق حسین صاحب کے درمیان خط وکتابت ہوئی اور نواب محسن الملک کے استعفیٰ پر اظہار خیال ہوا۔نواب وقارالملک نے شیخ صاحب موصوف کے نام جو مکاتیب تحریر فرمائے، ہمیں وہ تو دستیاب نہیں ہو سکے البتہ شیخ عبدالقادر کے دو مکاتیب ملے ہیں جو اس اہم اور تاریخی موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں۔شیخ صاحب نے شملہ سے ۹ ستمبر ۱۹۰۰ء کو نواب وقارالملک کے نام جو خط تحریر کیا اس میں لکھا:

جناب مخدومی ومکرمی نواب صاحب بہادر دام الطافکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! جو تفصیل نواب محسن الملک بہادر کے استعفیٰ کی وجوہات کی آپ نے تحریر فرمائیں، اس کا شکریہ۔ نواب صاحب بہادر کا اپنا خط بھی اس سے پہلے اس مضمون کا پہنچ چکا تھا مگر نواب محمد حیات خان صاحب نے پھر زور سے ان کو تاکید واپسی استعفیٰ کی لکھی ہے۔ انہوں نے آنریبل مسٹر رواز ممبر کونسل عالیہ سے اس باب میں مشورہ کیا تھا اور صاحب موصوف نے جواب میں کہا کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے گورنمنٹ آف انڈیا سیکرٹری کالج کی جانب سے دستور مطمئن ہے۔ اور شاید مسٹر اینوٹی ویسے ہی سیکرٹری صاحب اردو ڈیفنس کی وجہ سے ناراض ہوں مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ اس سبب سے کالج کو نقصان پہنچائیں نیز یہ کہا کہ ان کی رائے میں نواب محسن الملک کی تقریر اور جو تجاویز اس میں پیش کی گئی ہیں، معقول معلوم ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کی اطلاع نواب صاحب کو دے دی گئی ہے۔ اب یہ بھی قرار پایا ہے کہ آنریبل نواب محمد حیات خاں صاحب دو سوال اردو کے متعلق ۵ر اکتوبر کی کونسل عالیہ میں کریں جن کا مضمون حسب ذیل ہو:

نمبر ۱: کیا گورنمنٹ آف انڈیا کو اس اضطراب سے آگاہی ہے جو ممالک مغربی وشمالی کے مسلمانوں میں لوکل گورنمنٹ کے ریزولیوشن ۱۸ر اپریل ۱۹۰۰ء کے نفاذ سے پیدا ہو رہا ہے جس کے ذریعے سے ناگری کا رواج عدالتوں میں جائز کیا گیا ہے اور جس کی ترمیم میں عدالتی عہدوں کے لیے ہندی زبان کا جاننا لازمی ٹھہرایا گیا ہے؟

نمبر ۲: کیا گورنمنٹ آف انڈیا، الفاظ ''عرضی واستغاثہ'' کی تشریح کی بابت ہائی کورٹ الہ آباد اور عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ میں اختلاف ہوا ہے تاکہ اس تشریح سے ناگری حروف کے استعمال کی اجازت سے ایسے لوگوں تک کر دی جائے جو سوائے ناگری حروف کے اور کوئی حروف نہیں جانتے اور جو اپنی عرائض بلاواسطہ اصحاب قانون پیشہ کے اپنے ہاتھ سے پیش کریں''۔

میں جانتا ہوں یہ سوالات عین آپ کی منشا کے مطابق ہوں گے۔

رقعہ نواب محسن الملک بہادر واپس ارسال خدمت شریف ہے۔ از جانب آنریبل نواب صاحب سلام شوق!

آپ کی تقریر میں ترمیم کا مجھے کوئی منصب نہیں۔ آپ نہ صرف میرے بزرگ ہیں بلکہ ''قوم کے بزرگ ہیں'' وہ جتنا بھی اختصار ہوا ہے یوں ہوا ہے کہ ایک ہی مطالب کا کسی قدر اعادہ تھا اور وہ انگریزی میں شاید مستحسن نہ معلوم ہوتا۔

بندہ عبدالقادر ۴۶

شیخ عبدالقادر نے دوسرا مکتوب بھی شملہ ہی سے نواب وقار الملک کو ۱۲ر ستمبر ۱۹۰۰ء کو تحریر کیا جس میں رقمطراز ہیں:

جناب مکرمی ومخدومی نواب صاحب بہادر

السلام علیکم! آپ کے دونوں عنایت نامے پیہم شرف صدور لائے تقریر آپ کی ''آبزرور'' میں چھپ گئی ہے۔ آخر کے حصہ میں میں نے کسی قدر اختصار کر لیا ہے، معاف فرمایئے۔ اگر آبزرور کی کاپیاں جس میں وہ تقریر درج ہے آپ کو نہیں ملیں تو عنقریب مل جائیں گی۔

میں نے جواب محمد حیات خاں صاحب کو آپ کے دونوں خطوط کے پیغام دے دیے تھے۔ وہ جواب میں سلام شوق عرض کرتے ہیں اور یاد آوری کے ممنون ہیں مگر آپ نے جوڈیشلیان پنجاب میں کسی کے سیکرٹری ہونے کی نسبت تحریر فرمایا ہے اگر

نواب صاحب محسن الملک استعفیٰ پر مصر رہیں تو اس کی توقع نہیں ہو سکتی ۔نواب محمد حیات خان صاحب اپنے کاروبار میں اس قدر منہمک ہیں کہ ان کا چھٹکارا مشکل ہے ۔آپ کو معلوم ہے پنجاب کونسل کے ممبر ہیں ۔راولپنڈی میں آنریری ڈسٹرکٹ جج و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں دو تین ضلعوں میں زمینداری کرتے ہیں اور کئی جھگڑے ہیں جو وہ اپنے ذمے لیے ہوئے ہیں وہ جب تک ان سب کو خیر باد نہ کہہ دیں علی گڑھ نہیں آ سکتے اور اس قدر ایثار اس زمانہ میں کس سے ہو سکتا ہے ۔

خان بہادر برکت علی خان صاحب کی نسبت آپ خود تحریر فرماتے ہیں کہ وہ بہت بوڑھے ہیں ۔

نواب محمد حیات خاں صاحب نے نواب محسن الملک بہادر کے استعفیٰ کا ذکر آنریبل مسٹر روا ز سے جو گورنمنٹ انڈیا کے ہوم سیکرٹری ہیں، کیا ہے ۔انہوں نے نہایت افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ ہم ہرگز سر اینٹونی میکڈانل سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ ریزولیوشن کی مخالفت کی ناراضگی کا کالج پر کچھ اثر ہونے دیں اور کم از کم گورنمنٹ آف انڈیا کو نواب محسن الملک سے کوئی ناراضگی نہیں ۔انہیں اپنے کام پر بدستور رہنا چاہیے ۔اس لیے نواب محسن الملک صاحب کو یہاں سے زور کا خط استعفیٰ واپس لینے کے لیے لکھا گیا ہے ۔زیادہ نیاز

بندہ عبدالقادر ۴۷

''سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد سر سید احمد خاں نے ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی کے پیش نظر علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی ۔سر سید احمد خاں نے قدامت اور جدیدیت کا سنگم بنانا چاہا لیکن وقتی تقاضوں اور علی گڑھ کے ''صاحبی'' ماحول کے اثر سے قدامت اور روایت تو پس منظر میں چلی گئیں اور انگریزیت اور جدیدیت کا دور دورہ ہو گیا ۔ سر سید کی تعلیمی تحریک جس قسم کے آدمی پیدا کرنا چاہتی تھی ان کا بہترین نمونہ علی گڑھ سے باہر پنجاب میں پیدا ہوا اور وہ شیخ عبدالقادر تھے اس لیے کہ اعلیٰ درجے کی انگریزی دانی کے باوجود انہیں مشرقی اخلاق، مشرقی ادب، اپنی زبان، اپنی روایات اور اپنی ثقافت اور اقدار سے نہایت گہری دل چسپی تھی ۔شیخ صاحب کی شخصیت میں ماضی اور حال باہم گلے ملتے نظر آتے ہیں ۔ان کی تعلیم اور سرگرمی انگریزی تھی ۔ان کے گرد و پیش پر مغربیت کے گہرے سائے سایہ فگن تھے لیکن اس کے باوصف ان کا انداز فکر رہن سہن اور طریق عمل مشرقی تھا''۔ ۴۸

''علی گڑھ تحریک کے بعد انگریزی کا ایک ایسا سکہ بیٹھا کہ لوگ انگریزی پڑھتے تھے، انگریزی لکھتے اور انگریزی بولتے ۔ سر سید کے علاوہ چند لوگ ہی ایسے رہ گئے تھے جنہوں نے اردو کو ذریعہ اظہار بنایا اور ان کے بعد یہ چراغ بھی بجھانے لگا ۔شیخ عبدالقادر نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اکثر ہندوستانی اردو کی طرف اور اپنے ادب کی طرف توجہ نہیں کرتے، یہ مضامین انگریزی میں اس لیے لکھے گئے ہیں کہ وہ انگریزی دان اپنے ادب کی طرف متوجہ ہوں''۔ ۴۹

شیخ صاحب کی مساعی مشکور میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انہوں نے اردو نوازی کے لیے مقدور بھر جدوجہد کی ۔ان کا زمانہ انگریزی کا زمانہ تھا ۔ جب انگریزی دانی اور انگریزی نوازی کامیاب زندگی کی ضمانت ہوتی تھی ۔اردو پڑھنا اور لکھنا تو درکنار، اردو میں بات کرنا بھی توہین سمجھا جاتا تھا ۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہندو مسلم تعصبات کی سزا بھی بے جا طور پر اردو بیچاری ہی کو مل رہی تھی اور پھر ہندو تو کجا برصغیر کے مسلمان بھی جن کے مذہب، تہذیب اور ثقافت کے صدیوں کے سرمائے کی امین اردو زبان تھی، اس سے پہلو تہی کو شان تفاخر خیال کرتے تھے ۔ایسے حالات میں اردو کی حمایت اگر انگریزی ناآشنا حلقوں سے ہوتی تو اسے جہالت

اور رجعت پسندی کا نام دے کر نا قابل اعتنا گردانا جاتا لیکن اردو کی کس مپرسی کے عین عالم شباب میں خدا نے ایک ایسے با ہمت اور پُرعزم شخص کے دل میں اسکی حمایت کا جذبہ ڈال دیا، جو انگریزی دانی میں بھی کمال رکھتا تھا اور نہ صرف انگریزی دان ہی تھا بلکہ ایک بڑا آدمی بھی تھا: ؎

پاسبان مل گئے کعبے کو بت خانے سے ۵۰؎

اسی سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

''ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس صدی کے آغاز میں جب انگریزی تعلیم وتہذیب نے ہماری تعلیم وتہذیب نے ہماری تعلیم وتہذیب سے ٹکرا کر ہمیں فکری وروحانی اعتبار سے بھی غلام کی زنجیروں میں جکڑنا چاہا اور سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا اپنے دردقومی کے باوصف مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر انگریزی الفاظ وتراکیب کے بے جا اور بلاضرورت استعمال پر فخر کرنے لگے تو سر عبدالقادر نے مخزن کے اجرا سے اس تحریک کا آغاز کیا کہ ہم اپنے افکار کی ترجمانی کے لیے محض اپنی زبان کا سہارا لیں گے اور اسے اس حد تک سنواریں گے کہ یہ ہماری تمام تر تہذیبی، علمی اور معاشرتی ضروریات کو پورا کرنے کی ضامن بن جائے''۔ ۵۱؎

ڈاکٹر سید عبداللہ صدر اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ایک دوسرے مکتوب میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان (شیخ عبدالقادر) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب انگریزی اور انگریزی ادب سے مرعوبیت ہم پر چاروں طرف سے یلغار کر رہی تھی وہ اردو کو بچانے کے لیے سینہ سپر ہو گئے اور اسے ایک ایسا انداز بیان اور اسلوب تحریر بخشا جو اپنی سادگی، سلاست کے باوصف نہ صرف ادب عالیہ کے معیار پر پورا اترا بلکہ اس نے ہمیں یہ اعتماد بخشا کہ ہماری زبان میں علوم و فنون کی جملہ اصناف کو اپنے اندر سمونے اور ہر قسم کی معلومات کو بیان کرنے کی قدرت وصلاحیت موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک اردو زبان باقی ہے اس کے عظیم محسن شیخ عبدالقادر کا نام زندہ اور ان کی یاد تابندہ رہے گی''۔ ۵۲؎

سرسید تحریک کے حوالے سے شیخ عبدالقادر کے تاریخ ساز کردار کا ذکر کرتے ہوئے مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں:

''غالب کے بعد سرسید، زبان کے جدید رنگ میں اردو کے سب سے بڑے نثر نگار ہیں۔ انہوں نے اردو میں بہت سے مطالب کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے .....از بسکہ وہ ایک مصلح پہلے تھے اور ایک قلم کار بعد میں اس لیے ان کی توجہ عبارت کے حسن کی بہ نسبت اس کے مواد کے خوب وزشت کی طرف زیادہ مائل رہی۔ سرسید سے جو اکابر ادب براہ راست متاثر ہوئے ان میں مولانا الطاف حسین حالی، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاءاللہ مولوی نذیر احمد اور مولانا شبلی نعمانی کے اسمائے گرامی سب سے پہلے ذہن میں آتے ہیں۔ لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ان میں کوئی بھی صحیح معنوں میں انگریزی دان نہیں تھا۔ اگرچہ اپنی غیر معمولی قابلیت کے باعث ان میں سے بعض نے بعد میں انگریزی یہاں تک تحصیل کر لی تھی کہ ہمارے بعض معرکہ آراء تراجم ان کے قلم کے مرہون ہوئے .....اس میں کلام نہیں کہ شبلی کی شستہ ورفتہ نثر اور حالی کی سادگی وصفائی بیان آج بھی بے عدیل ہے اور نذیر احمد نے محاورے کے ساتھ جو آنکھ مچولی کھیلی ہے وہ آج ہمیں چونکا دیتی ہے لیکن یہ تینوں اکابر اپنے مشن میں اس درجہ منہمک رہے کہ انہیں زبان اور اس کے روزافزوں مسائل کی طرف براہ راست توجہ کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ یہ سعادت

قدرت نے سرسید سکول کے ایک انگریزی دان نوجوان کے لیے محفوظ کر رکھی تھی جو بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی جواں سال عبدالقادر کے روپ میں منظر عام پر آیا''۔ ۵۳

اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب صادق قریشی تحریر کرتے ہیں:

''سر عبدالقادر ماضی کو حال سے ملانے والی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے تھے آپ مسلمانوں کی اس ذہنی نشاۃ ثانیہ کی پیداوار تھے جس کے قریباً تمام علمبردار ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ سر عبدالقادر کو جن بزرگان قوم کے ساتھ مل بیٹھنے اور متاثر ہونے کا موقع ملتا رہا ان میں سرسید احمد خان، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، حکیم اجمل خاں، سید علی بلگرامی اور نواب عماد الملک جیسی یکتائے روزگار ہستیاں شامل تھیں''۔ ۵۴

شیخ عبدالقادر کو جن بزرگان قوم کی قربت نصیب ہوئی اور وہ ان سے اثر پذیر ہوئے اس ضمن میں پروفیسر حمید احمد خان تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ عبدالقادر اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ..... انہوں نے اس صدی کے موڑ پر برعظیم کے خوابیدہ مسلمانوں کو کروٹ لیتے اور آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا تھا اور ان ابھری ہوئی شخصیتوں کا بھی قریب سے مطالعہ کیا تھا جن کی کوشش سے پاکستان کا ظہور عمل میں آیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عظیم الشان ہستیوں کی صحبت سے فیضیاب ہونا ایک نعمت عظمیٰ کا درجہ رکھتا تھا''۔ ۵۵

''شیخ عبدالقادر کی دوررس نگاہوں نے دیکھا کہ اکابر میں جو اصحاب اہل ذوق اور اہل کار ہیں وہ انگریزی سے ناآشنا ہونے کے باعث ایک قدرتی حصار میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں اور خواہ انہیں عمر خضر ارزانی ہو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکیں گے جو کچھ وہ اپنی بے مثال ہمت سے اب تک کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ نوجوان جنہیں سرسید کی تحریک نے تہذیب مغرب سے آراستہ کیا ہے وہ کچھ اسی کے ہو کر رہ گئے ہیں اور علی گڑھ تحریک میں انگریزی کی طرف حد سے زیادہ میلان نے ہمیں ایک ہنگامی فائدے کے ساتھ ایک حقیقی نقصان بھی پہنچایا ہے۔

عبدالقادر نے حقیقت کو بھانپ لیا تھا چنانچہ وہ ہمارے معاشرے میں ''انگریزی کلچر'' کے فکارانہ مقابلے اور اس کے خوش آیند اور معتدل انجذاب کے لیے ایک ''قومی اور ملکی کلچر'' کے احیاء کا مشن لے کر وارد ہوئے اور انہوں نے اپنی خاموش، بے ضرر اور دل نواز تحریک سے چند سال میں اس مشن کی بنیاد استوار کر دیں، گویا خود سرسید کا تربیت یافتہ ایک طباع نوجوان اس تحریک کے مضر عناصر کے صحیح استیصال کے لیے میدان عمل میں اترا اور اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر کیے بغیر کہ اس کا مقصد کیا ہے، اس نے اس کے دونوں پہلوؤں یعنی ایک غیر دل کش مشرقیت اور ایک گمراہ کن مغربیت کی اصلاح کا ایک کارگر ذریعہ اور ایک خاموش پروگرام تیار کر لیا۔ پھر اپنے وقت اور اپنے حلقے کے چند ہم مذاق نوجوانوں کو اپنے ساتھ لے کر انہوں نے ایک ہلکی سی حرکت کا آغاز کر دیا۔ جو آج نصف صدی کے بعد ایک عظیم الشان تحریک کی صورت اختیار کر چکی ہے اور سرزمین پنجاب سے نکل کر اپنی یلغار میں مشرق و مغرب کے بعید ترین کنارے بھی چھو آئی ہے''۔ ۵۶

مذکورہ بالا حالات و واقعات اور حقائق و دلائل کی تفصیلات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

اول: لودیانہ کے علمی و ادبی ماحول نے شیخ عبدالقادر کے دل میں اردو کے لیے انس اور شوق پیدا کر دیا۔

دوم: جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں اور شیخ عبدالقادر کا شوق مشترکہ مزید رابطہ باہمی کا ذریعہ بنا بلکہ انہیں اس سے ''اردو کی ترقی'' کی کوششوں میں بہت مفید مشورے ملے۔

سوم: جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں کی قائم کردہ تنظیم ''ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن'' جس کے جلسوں میں شیخ عبدالقادر نہ صرف شریک ہوتے بلکہ اردو زبان وادب کے بارے میں لیکچر دیتے اور مضمون پیش کرتے تھے، ان کے اردو سے محبت، انس اور لگاؤ کو جلا بخشی۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے شیخ عبدالقادر پہلی بار ایسوسی ایشن کے سٹیج پر ۱۸۹۳ء میں جلوہ افروز ہوئے۔

چہارم: انجمن اسلامیہ پنجاب ۱۸۶۹ء میں قائم ہوئی۔ پنجاب کے مسلمان علی گڑھ تحریک سے کافی متاثر تھے۔ سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک معاون اور مددگاروں میں انجمن اسلامیہ پنجاب کے جو بزرگ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ان میں سردار محمد حیات خان (سر سکندر حیات خان کے والد) خان بہادر محمد برکت علی خان اور خلیفہ محمد حسن (وزیر اعلیٰ پٹیالہ) شامل ہیں۔ انہوں نے نہ صرف علی گڑھ تحریک کی بھرپور حمایت کی بلکہ پنجاب میں مسلمانوں کی تنظیم کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ برطانوی دور حکومت میں یہ پہلا ادارہ تھا جو مسلمانوں کے مفادات کی دیکھ بھال کے لیے قائم ہوا۔ ۵۷ اس اسلامی انجمن کے ساتھ جن بزرگوں کا تعلق خاطر رہا اور جنہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں، ان میں میاں نظام الدین، سر مراتب علی، حکیم غلام نبی، نواب شاہنواز خان، مولوی فضل الدین پلیڈر، نواب محمد علی خان، میاں دین محمد، ڈاکٹر امیر شاہ، ڈاکٹر عبدالغنی، سید محمد حسین، مولوی سید ممتاز علی، مولوی محبوب عالم، میاں محمد شفیع، میاں محمد شاہ دین، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، شیخ عبدالقادر، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پنجم: سرسید احمد خان کی تحریک نے جن صوبوں کو متاثر کیا ان میں صوبہ پنجاب خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔ بلاشبہ انجمن حمایت اسلام لاہور نے پنجاب میں وہی کام کیا جو شمالی ہند میں سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک نے کیا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کا قیام سرسید احمد خاں ہی کی تحریک کا مرہون منت ہے جو ۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو قائم ہوئی۔ ۵۸

اس ادارے نے پنجاب کے مسلمانوں میں خصوصی بیداری پیدا کی اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ انجمن، انجمن اسلامیہ سے سبقت لے گئی۔ انجمن اسلامیہ نے چند چیدہ چیدہ مسلمانوں کی تنظیم تھی لیکن انجمن حمایت اسلام متوسط طبقے کے لوگوں کی جماعت تھی۔ خلیفہ حمید الدین جو ایک ممتاز علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے اس کے صدر چنے گئے اور مولانا غلام اللہ قصوری سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ ۵۹

جو بزرگ انجمن کے سالانہ جلسوں میں شرکت فرما کر ان کی رونق بڑھاتے رہے اور جنہوں نے آغاز سے لے کر آخر تک انجمن کے جلسوں کے صدر اور مقرر کی حیثیت سے شاندار خدمات انجام دیں ان میں سرسید احمد خان، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا حاجی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، اکبر الہ آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی، شہزادہ مرزا ارشد گورگانی، سر ذوالفقار علی خاں، نواب فتح علی خاں، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، سر فضل حسین، سر میاں محمد شفیع، مولانا غلام دستگیر قصوری

علامہ عبداللہ یوسف علی، شمس العلماء مولوی عبدالحکیم، ابوالوفا امرتسری، مولانا ظفر علی خان، چودھری خوشی محمد ناظر، سید ناظر حسین ناظم، خان بہادر برکت علی خاں، خواجہ حسن نظامی، مولانا سید سلیمان ندوی، میاں بشیر احمد، فقیر سید افتخار الدین، اور جن بزرگوں نے انجمن کی سالہا سال تک صدارت فرمائی ان میں خان بہادر شیخ خدا بخش، شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی، نواب سر فتح علی خان، قزلباش سر میاں محمد شفیع، سر شیخ عبدالقادر، ڈاکٹر محمد اقبال، سر شیخ عبدالقادر (دوسری مرتبہ)، نواب مظفر خاں، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، مولوی غلام محی الدین قصوری، سید محسن شاہ اور میاں امیر الدین قابل ذکر ہیں''۔ ۶۰

ششم: آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو منعقد ہوا اور سر سید احمد خان کے دست راست مولوی سمیع اللہ خاں اس کے صدر مقرر ہوئے۔ سر سید احمد خاں کانفرنس کی روح رواں تھے اور انہوں نے دس سال تک کانفرنس کی سیکرٹری شپ کے فرائض انجام دیے ۶۱۔ کانفرنس کے ساتھ جن علماء وفضلا کا خصوصی تعلق خاطر رہا ان میں نواب محسن الملک، سید مہدی علی خاں، نواب وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، خواجہ غلام الثقلین، شیخ عبداللہ، مولانا مزمل اللہ، سید علی امام، سید امداد امام، ڈاکٹر عبداللہ مامون سہروردی، سید نواب علی چودھری، جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں، شیخ عبدالقادر، میاں محمد شفیع، نواب فتح علی خاں قزلباش، نواب محمد حیات خاں، خان بہادر برکت علی خان، مولوی بدرالحسن، سر تھیوڈر ماریسن، سر تھیوڈر ربیک، پروفیسر آرنلڈ، جسٹس بدرالدین طیب کی، جسٹس سید امیر علی، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، شمس العلماء مولوی امداد امام، مولوی رفیع الدین، خواجہ احمد شاہ، منشی محبوب عالم، سید ممتاز علی، مرزا اعجاز حسین، حاجی شمس الدین، شیخ عمر بخش بار ایٹ لاء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۶۲

شیخ عبدالقادر کے ایم اے او کالج اور مسلم یونیورسٹی سے تعلقات کے بارے میں ''سر عبدالقادر: تعلیمی، علمی، قومی اور انتظامی خدمات'' کے مولف لکھتے ہیں:

''علی گڑھ سے موصوف کے تعلقات سر سید احمد خاں صاحب کے زمانے سے ہیں۔ ''پنجاب آبزرور'' کے مدیر کی حیثیت سے انہوں نے ایم اے او کالج اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات انجام دیں جس کا اعتراف سر سید احمد خاں صاحب سید محمود، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور نواب محمد اسحاق خاں صاحبان نے کیا''۔ ۶۲ الف

ہفتم: ندوۃ العلماء: ندوۃ العلماء کی تحریک مولانا سید محمد علی مونگیری نے جو مولانا لطف اللہ کے شاگرد اور حضرت شاہ فضل الرحمٰن کے خلیفہ تھے، ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے ایک سالانہ اجلاس میں پیش کی جس کے دو بنیادی مقصد تھے۔ پہلا: رفع نزاع باہمی اور دوسرا اصلاح طریقہ تعلیم۔ اس جلسہ میں جو حضرات باکمال شریک تھے ان میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا حافظ شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا محمد اشرف علی تھانوی، مولانا محمد خلیل، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا نور محمد پنجابی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا سید محمد علی، (ناظم اول ندوۃ)، مولانا محمود حسن، مولانا شاہ سلیمان پھلواری، مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا عبدالغنی، مولانا حکیم فخر الحسن گنگوہی، مولانا سید حافظ تجمل حسین دستوی شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ جلسہ پورے ملک کی نمائندگی کر رہا تھا..... ندوۃ العلماء کا قیام مولانا شبلی نعمانی کی عین تمنا کے مطابق تھا۔ ۶۳

مولانا محمد علی مونگیری اس کے ناظم اول مقرر ہوئے۔ ہند کے تمام جید علماء نے اس کے قیام کا خیر مقدم کیا۔ ۱۸۹۴ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں نواب محسن الملک نے قرارداد حمایت پیش کی۔ سر سید احمد خاں نے بھی ندوۃ کے قیام کا خیر مقدم کیا۔ مولانا شبلی نعمانی ایک عرصہ تک اس سے منسلک رہے۔ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور سید نجیب اشرف فارغ التحصیل طلبہ میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ۶۴

دیگر بزرگوں میں جن کا ندوۃ سے خاص تعلق رہا، مولانا عبدالسبحان، الحاج عبدالقدوس بادشاہ، مولوی سید عبدالحئی، مولانا ابومحمد عبدالحق دہلوی، مولانا شاہ محمد سلیمان چشتی، مولانا شاہ ابوالخیر، مولانا خلیل الرحمن سہارن پوری، الحاج مولانا عبدالقیوم حیدر آبادی، مولانا قاضی علی احمد بدایونی، صاحبزادہ مولوی علی حسن نظامی، مولانا عبدالحق دہلوی، قابل ذکر ہیں۔ ۶۵

ہشتم: انجمن مستشار العلماء لاہور کے ضمن میں ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ اس انجمن کا سنگ بنیاد یکم جنوری ۱۸۸۷ء کو لاہور میں رکھا گیا اور اس کے بانی شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی تھے دیگر قابل ذکر علماء میں حضرت پیر سید جماعت علی شاہ اور مولانا غلام محمد بگوی تھے۔ اس انجمن نے اپنے وسائل کے پیش نظر شاندار خدمات انجام دیں۔

نہم: سر اینٹونی میکڈانل گورنر یوپی کے معاندانہ اور ہندوؤں کی اردو دشمنی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور جب شیخ عبدالقادر کو اردو کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اردو کی ترویج اور ترقی کے لیے بنفس نفیس مساعی کریں گے اور اردو کو جو ہماری تہذیب و ثقافت کی امین ہے ''برباد'' نہیں ہونے دیں گے چنانچہ انہوں نے رسالہ ''مخزن'' جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم نے پیشتر ازیں ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن لاہور، انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور، انجمن حمایت اسلام لاہور، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، انجمن مستشار العلماء لاہور اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے اور ان قابل ذکر، ممتاز اور مقتدر ہستیوں، علماء، فضلا، ادبا اور بزرگان دین کا تذکرہ کیا اور اس حصے کو مخزن کے اجرا تک محدود کر دیا ہے اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر نے قریباً ستائیس برس کی عمر میں وہ بلند و بالا مرتبہ اور مقام حاصل کر لیا جس کا ہم عام طور پر تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مخزن کے اجراء تک ..... ''پنجاب آبزرور'' کے نائب مدیر اور مدیر کی حیثیت سے (۱۸۹۵ء سے لے کر اپریل ۱۹۰۱ء تک) یعنی سوا چھ سال کے اندر اندر ان کا نام جانا پہچانا تھا اور ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور تقریباً ہر پڑھا لکھا اور علم و ادب کا شیدا ان کے نام سے بخوبی متعارف تھا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شیخ عبدالقادر اپنی شاندار اور تاریخ ساز ''صحافتی خدمات'' کے باوصف برصغیر کی قریباً تمام علمی، ادبی، تعلیمی، مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی تنظیموں سے منسلک ہو چکے تھے۔ قبل ازیں جن ممتاز تنظیموں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے سربرآوردہ اور قدآور لیڈروں سے ان کے نہایت مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر نے قریباً آٹھ سال (۱۸۹۳ء سے لے کر ۱۹۰۱ء تک) میں اپنی مخلصانہ جدوجہد اور شبانہ روز محنت جو ایماندری، دیانت داری اور نیک نیتی پر مبنی تھی، وہ عزت، وہ مرتبہ اور وہ وقار حاصل کر لیا جو ہزاروں لاکھوں کو پوری زندگی میں نصیب نہیں ہوتا اور اس طرح ان قابل فخر اور باوقار ہستیوں سے نہ صرف اکتساب فیض کیا بلکہ مخزن کے اجرا کے سلسلے میں مفید اور قیمتی مشوروں سے اس کے لیے زمین ہموار کر لی۔

مولانا صلاح الدین احمد نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ:

''اس نوجوان کے شانوں پر ایک سن رسیدہ سر تھا اور اس کے کردار میں قدرت نے وہ خوبیاں اور دلآویزیاں جمع کر رکھی تھیں جو ایک ثقافتی تحریک کے قائد میں لازماً ہونی چاہئیں۔ عبدالقادر ایک صلح جو اور ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے۔ اور مفاہمت اور مصالحت ان کی فطرت کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی''۔ ۶۶

بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کا فرمان ہے:

''قدرت حالات کے مطابق ایسا آدمی پیدا کر دیا کرتی ہے جس کی ''وقت'' اور ''حالات'' کو ضرورت ہوتی ہے''۔ ۶۷

چنانچہ بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے ارشاد کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں ذرا بھی باک محسوس نہیں کرتے کہ جہاں تک ''اردو زبان'' کی حفاظت، اور ترویج و ترقی کا تقاضا تھا تو

''قدرت نے حالات کے مطابق شیخ عبدالقادر کو پیدا کر دیا'' اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی (شیخ عبدالقادر) ''وقت اور حالات کو حقیقتاً ضرورت تھی''۔

اور پھر شیخ صاحب موصوف نے مخزن کے اجراء کو ''خواب جوانی کی تعبیر'' اور ''تقاضائے فطرت'' کہا ہے اور دراصل یہی وہ ''تقاضائے فطرت'' تھا جس نے انہیں مخزن جاری کرنے پر مجبور کیا۔

اس سلسلے میں پروفیسر محمد صدیق کا کہنا ہے:

''سیر لکھنو اور اس جلسہ میں شیخ عبدالقادر نے محسوس کیا کہ بہت سے شعراء نے اپنے اشعار میں تعلّی کا اظہار کرتے ہوئے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ زبان اردو کے اصلی مالک اور اجارہ دار مسلمان اہل زبان ہی ہیں، دوسرے مذاہب یا دیگر صوبہ جات کے لوگ اگر اردو بولتے یا لکھتے ہیں تو ان سے مستعار لیتے ہیں۔ اس احساس کے بعد شیخ عبدالقادر نے لکھنو میں فیصلہ کیا کہ ایک ایسا رسالہ جاری کیا جائے جو مذہبی اور سیاسی بحثوں سے الگ رہ کر صرف ادبی خدمات تک اپنی مساعی محدود رکھے۔ اس خیال کا ذکر انہوں نے لکھنو میں اپنے ہم سفر رفقاء سے کیا۔ انہوں نے بہت پسند کیا۔ لاہور آ کر شیخ عبدالقادر نے علامہ اقبال سے بھی اس سلسلہ میں تبادلہ خیال کیا۔ علامہ اقبال نے نہ صرف اس تجویز کو پسند کیا بلکہ قلمی تعاون کا یقین بھی دلایا۔ رسالہ کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ احباب سے خط و کتابت کے ذریعے قلمی تعاون کے وعدے حاصل کیے گئے۔ نئے رسالہ کے نام کے متعلق شیخ عبدالقادر تحریر کرتے ہیں:

''میں نے جب ۱۹۰۱ء میں اس نام (مخزن) سے رسالہ جاری کیا تو بہت سے نام سوچنے کے بعد اس کے حق میں فیصلہ اس خیال سے کیا کہ یہ لفظ جامع تھا اور مختصر انگریزی ڈکشنری سے مجھے یہ پتہ چلا کہ لفظ ''میگزین'' جو انگریزی رسالوں وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے وہ دراصل لفظ ''مخزن'' سے مشتق ہے''۔ ۶۸

شیخ عبدالقادر نے مخزن کے اجراء کو ''خوب جوانی کی تعبیر'' کہا ہے۔ مخزن جاری کرنے اور اس مشن اور تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے انہوں نے ابتدا میں جو مساعی جمیلہ کیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

''اسی زمانے میں ادب اردو کی خدمت کا شوق پیدا ہوا اور ''خواب جوانی کی تعبیر'' نے ادبی رسالے کی صورت میں جنم

لیا اور مخزن نام پایا۔ انگریزی اخبار (پنجاب آبزرور۔ مؤلف) کے ساتھ ساتھ اردو مضامین کی فکر ہونے لگی۔ سارے ہندوستان کے ادیبوں اور شعرا سے خط وکتابت شروع ہوئی۔ سب نے اس تجویز کا محبت اور جوش سے خیر مقدم کیا اور نظم ونثر کے اچھے نمونے بھیجے۔ جب کہیں سے اچھا مضمون ڈاک میں آتا تھا تو ایسی خوشی ہوتی تھی جیسے کوئی بیش بہا چیز ہاتھ لگ گئی ہو۔ کبھی کبھی بعض مجالس (ان سے مراد ندوۃ العلماء، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ ہے۔ مولف) میں شرکت کی غرض سے دور دور مقامات تک جانا ہوتا تھا۔ میں جہاں جاتا، ماہران ادب کی تلاش رہتی۔ ان سے ملتا تھا اور ان کے حسن طبیعت سے خوش اور لطف اندوز ہوتا تھا۔ حسن طبیعت، حسن صورت سے کم پر اثر نہیں ہوتا۔ ایک ایک ملاقات کا نشہ مدتوں رہتا تھا۔ حضرت مونس لکھنوی کے کلام کا ایک مشہور بند ان ملاقاتوں پر خوب چسپاں ہے:

بندہ نہیں ایسا کہ مرے گلبدنوں پر　　یا ہو متوجہ کبھی غنچہ دہنوں پر
یا میل کرے عطر فشاں پیرہنوں پر　　ہاں طبع جو مائل ہے تو رنگیں سخنوں پر
شاہد ہے خدا یارِ موافق ہوں تو ان کا
شیدا ہوں تو ان کا ہوں جو عاشق ہوں تو ان کا[۶۹]

شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ ''سارے ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں سے خط وکتابت شروع ہوئی''۔ ہمیں اس ضمن میں شیخ صاحب موصوف کے دو مکتوب دستیاب ہوئے ہیں جو افادہ عام کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلا مکتوب خان بہادر مولوی بشیر کے نام ہے جو اناوہ سے ہفت روزہ اخبار ''البشیر'' نکالتے تھے۔ آپ ایک اچھے ادیب اور مشہور صحافی تھے۔ شیخ عبدالقادر کے ساتھ آپ کے گہرے مراسم تھے۔ شیخ عبدالقادر نے انہیں ۲۸ مارچ کو جو خط لکھا اس میں تحریر کیا:

جناب مکرم بندہ مولوی صاحب! السلام علیکم

پندرہ کاپیاں پراسپیکٹس کی ارسال خدمت ہیں۔ انہی کاپیوں کے ساتھ ابھی درخواست فارم کے کارڈ شامل نہیں کیے گئے لیکن چونکہ آپ کو اخبار میں ''مخزن'' پر نوٹ لکھنے کے لیے پراسپیکٹس کی ضرورت تھی، آپ کو جلد ہی روانہ کیا گیا ہے۔ آپ خود ملاحظہ فرما کر نوٹ لکھ دیجئے اور بعد میں باقی ماندہ کاپیاں اپنے احباب میں تقسیم کرا دیجئے تا کہ جو صاحب اناوہ میں خریداری کا قصد رکھتے ہوں ان کے کارڈ میرے نام جلد پہنچ جائیں اور مجھے پہلا نمبر نکالنے سے پہلے قدرے اندازہ لگانے کا موقع ملے کہ مانگ کہاں تک ہوگی۔

بندہ عبدالقادر[۶۹الف]

لاہور

۲۸ مارچ ۱۹۰۱ء

بنام خان بہادر بشیر الدین صاحب

دوسرا خط مسٹر بالم کند گپتا، ایڈیٹر ''بھارت مترا'' لکھنو کے نام ہے جو شیخ عبدالقادر نے تحریر فرمایا۔ آپ نے لالہ صاحب کو لکھا:

لاہور

۱۹ مئی ۱۹۰۳ء

مکرمی گپتا صاحب! تسلیم:

مہینے دو مہینے میں گھنٹہ دو گھنٹے میرے لیے وقف کر رکھیے، کچھ ناممکن تو نہیں! مانا کہ آپ بہت مصروف ہیں میں اگر ہندی لکھ سکتا تو معاوضہ میں آپ کے اخبار کے لیے لکھ بھیجتا!

بندہ عبدالقادر ۶۹ ب

شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالہ ''مخزن'' اور اخبار ''پنجاب آبزرور'' کے ذریعے اردو زبان و ادب کی جو شاندار، تاریخ ساز، اور قابل قدر اور قابل داد خدمت کی ہے وہ بے مثل بھی ہے اور بے مثال بھی۔ مخزن اور عبدالقادر لازم و ملزوم ہیں جب تک اردو زندہ ہے مخزن زندہ رہے گا اور اگر مخزن زندہ رہے گا تو عبدالقادر پائندہ رہے گا اور مستقبل کا مورخ نہ تو انہیں نظر انداز کر سکتا ہے اور نہ ہی ایک دوسرے سے جدا وہ جز ولاینفک ہیں اور آنے والی نسلیں انہیں خراج عقیدت پیش کرتی رہیں گی۔

مخزن ایک رسالہ نہیں ایک تحریک کی حیثیت رکھتا ہے جو مندرجہ ذیل مقاصد لے کر اپریل ۱۹۰۱ء میں منظر عام پر آیا:

الف: مخزن ایک ادبی رسالہ ہو اور سیاسی یا مذہبی جھگڑوں میں نہ الجھے۔ دوسرے رسائل کے بارے میں بھی ان کا یہی نقطہ نظر تھا کہ ادبی رسالے خالص ادبی خدمت کے زور سے ترقی کریں اور صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے کی کوشش ملحوظ اور مدنظر رکھیں۔ نظم و نثر میں سادگی کو مصنوعی زیب و زینت پر ترجیح دی جائے۔

ب: ان انگریزی خواں اصحاب کو جو عموماً اپنی زبان۔ اردو۔ کو اس قابل ہی نہ سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ اردو کے اخبار یا رسالے یا کتابیں دیکھنا، وقت کو ضائع کرنا ہے اور اس میں کچھ لکھنے کی کوشش کرنا بے سود ہے، انہیں اس امر کا قائل کرنا کہ اپنی زبان کی ترقی ضروری ہے۔ اپنی زبان میں بھی دلچسپی کے سامان ہیں اور اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔

ج: اردو نظم میں مغربی خیالات، فلسفہ اور سائنس کا رنگ بھرنا اور نتیجہ خیز مسلسل نظم کو رواج دینا تا کہ نظم اردو کا رنگ نکھرے۔ اس کے اثر کا حلقہ وسیع ہو اور جو لوگ انگریزی نظم کی خوبیوں کے دلدادہ ہیں ان کی تسلی کے لیے بھی کچھ سامان ملکی زبان میں ہو جائے۔

د: نظم قدیم کے اس حصے کو بذریعہ انتخاب زندہ رکھنا جو موجودہ زمانے کی تہذیب اور مذاق کے متضاد نہ ہو اور جس سے وہ حصے جو اخلاق پر مضر اثر ڈال سکتے ہیں، چھانٹ ڈالے جائیں۔ اس سے یہ مدعا ہرگز نہ تھا کہ ایک نیا ذوق اور شوق اشعار کا نوجوانوں میں پیدا کیا جائے بلکہ جو شوق پہلے سے موجود تھا، اس کو نسبتاً موزوں، مصفا اور پاکیزہ بنا دیا جائے۔

ہ: نثر کی اہمیت قائم رکھنا اور نثر لکھنے والوں کو شوق کا زیادہ موقع دینا۔

و: اپنے ہندو ہم وطنوں میں زبان اور ملکی لٹریچر کے مذاق کو بڑھانا اور رسالے کے لیے ہندو و سکھ ناظرین کی ہمدردی اور ہندو و سکھ مضمون نگاروں کے مضامین نظم و نثر حاصل کرنا۔

ز: انگریزی، فرانسیسی یا دیگر مغربی زبانوں کے ادبیات کے بہترین نمونے سلیس اور بامحاورہ ترجموں کے ذریعے اردو داں

اصحاب کے سامنے پیش کرنا۔دنیا جانتی ہے کہ مخزن جو مقاصد لے کر ادبی افق پر طلوع ہوا تھا ان سب میں اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی''۔ ۹ے

مخزن نے بدلتے ہوئے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے عملی سیاسیات میں کودنے کے بجائے غیر جانبداری سے کام لیا اور اس کے مباحث کو اخباروں اور دیگر رسالوں کے لیے چھوڑ دیا البتہ علم سیاسیات پر انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کے مضامین اخذ کر کے سلیس اور عام فہم زبان میں شائع کیے گئے۔

ملک میں نوجوانوں کو اردو کی کتابیں اور رسالے پڑھنے اور ان میں کچھ لکھنے کی جانب ایک پُرزور ترغیب پیدا ہو گئی جس سے نہ صرف مخزن مستفید ہوا بلکہ اس کے ہم عصروں کو بھی بے حد فائدہ ہوا اور یہ شکایت ختم ہو گئی جو اس زمانے سے پہلے اکثر سننے میں آتی تھی کہ اکثر رسالے اس لیے بند ہو جاتے تھے کہ لکھنے والے نہیں ملتے۔

اردو نظم میں مغربی خیالات، فلسفہ اور سائنس کا رنگ بھرنے والا مقصد بھی خاطر خواہ طور پر پورا ہوا اور اس کو پورا کرنے میں سب سے زیادہ کوشش علامہ اقبال اور میر غلام بھیک نیرنگ کی طرف سے ہوئی۔

نظم قدیم کو زندہ رکھنے کے لیے مخزن کے آخر میں سات آٹھ صفحات اشعار کے منتخب یا زمانہ حال کے بعض مغتنم حضرات کی غزلوں کے لیے وقف کیے گئے۔

سب سے زیادہ توجہ نثر کی ترقی کی طرف دی گئی۔ چنانچہ رسالے کا دو تہائی حصہ نثر کے لیے مخصوص کیا گیا۔اس میں دل چسپ اور طبع زاد مضامین کے علاوہ بہت سے مفید تراجم بھی شائع ہوتے رہے جن سے سرمایہ اردو میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

ہندو اور سکھ مضمون نگاروں اور شاعروں کی تخلیقات بھی مخزن کی زینت بنتی تھیں چنانچہ ایک نہایت معقول تعداد ہندو اور سکھ اصحاب کی تھی جن کے رشحات قلم مخزن میں چھپتے تھے۔یہ حضرات ہندی اور سنسکرت سے ترجمے کر کے مخزن کو اشاعت کے لیے بھیجتے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح اردو ادب کا ذخیرہ وسیع تر ہوتا گیا۔

انگریزی، فرانسیسی اور دیگر مغربی زبانوں کے علاوہ ہندی، سنسکرت، فارسی اور عربی کی ادبیات عالیہ کے نمونے سلیس، سادہ اور بامحاورہ ترجموں کے ساتھ مخزن کی زینت بنتے اور اردو دان صاحبان کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔خود شیخ عبدالقادر نے فرانسیسی زبان سے تین بہترین افسانے ترجمہ کیے جو ہندوستانی روپ اور ماحول کا لباس پہن کر مخزن میں شائع ہوئے۔دیگر مترجمین میں مرزا سلطان احمد، پیرزادہ بشیر احمد، میر غلام بھیک نیرنگ اور سید سجاد حیدر یلدرم خاص طور پر قابل ذکر ہیں''۔ ۱۰ے

تحریک مخزن کی کامیابی اور فوائد پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا صلاح الدین احمد رقمطراز ہیں:

''مخزن کے پس منظر میں عبدالقادر کی یہ بڑی جیت کارفرما تھی کہ اس نے اس کے مضمون نگاروں میں زیادہ تر وہی لوگ انتخاب کیے تھے جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔شیخ صاحب کے اس حسن انتخاب نے ہماری زبان کو شروع ہی میں متعدد فائدے پہنچائے۔ایک تو یہ کہ وہ افکار نو اردو میں وارد ہونے لگے جو مشرقی ذہن کے اعلیٰ مغربی تعلیم و تربیت سے متاثر ہونے کے نتائج تھے اور اس لیے ہیئت اور مواد دونوں کے اعتبار سے ایک دل کشا جدت اور ایک حیات آفرین تازگی لیے ہوئے تھے۔

دوسرا فائدہ یہ مرتب ہوا کہ انگریزی داں طبقے میں اپنی زبان سے ایک خوددارانہ محبت پیدا ہونے لگی۔

تیسرا بڑا فائدہ عوام کو یہ ہوا کہ جب انہوں نے دیکھا کہ انگریزی داں طبقہ جس کو وہ وریٰ الوریٰ اور اپنے سے بالکل

علیحدہ اور بلند سمجھتے تھے، اردو میں اظہار خیال کرتا ہے اور کس خوبی سے کرتا ہے تو ان کے دلوں پر سے انگریزی کا بے جا تفوق اٹھنے لگا اور اس کی جگہ اپنی زبان کی محبت لینے لگی''۔ ۷۲

اسی اہم موضوع پر بحث کرتے ہوئے مولانا حامد علی خاں لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالقادر نے اس کٹھن کام کا بیڑا اٹھایا اور بیسویں صدی کے طلوع کے ساتھ اردو کے مقدر کا ستارہ بھی مخزن کے روپ میں درخشندہ ہوا۔ اردو کو اپنی حمایت اور فروغ و ترقی کے لیے کوئی جذباتی اور نعرہ باز آدمی میسر نہیں آیا تھا اس کا موید دور اندیش، حکمت شناس اور با تدبیر انسان تھا جس نے خطیبانہ عزم سے نہیں ادیبانہ اثر کاری اور حکیمانہ تفہیم سے نفرت کو محبت اور مروت میں بدل ڈالا۔ اس طرح وہ انگریزی دانوں اور اردو انشا پردازوں کی درمیانی خلیج کو پاٹنے میں بہت کامیاب ہو گیا۔ جب یہ دونوں فریق باہم آشنا ہوئے تو نئے اور پرانے رنگوں کے امتزاج سے دامان اردو میں وہ گل کاریاں ہونے لگیں جن کی تابندگی اور پائندگی ایک جاوداں حقیقت بن گئی۔ مولانا سید سلمان ندوی مخزن اور صاحب مخزن کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''.....اس وقت تک انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب اردو انشا پردازی سے ناآشنا تھے۔ مخزن پہلی بزم سخن تھی جس میں نئے اور پرانے انشا پرداز اکٹھے ہوئے''۔ ۷۳

شیخ عبدالقادر نے ''کچکول'' نامی ''ایجاد'' کے ذریعے شعرائے قدیم و جدید کے کلام کی ترویج و اشاعت میں بھی مخزن کے ذریعے نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے تمام باذوق انسانوں کو دعوت دی کہ وہ اپنے پسندیدہ اشعار ارسال کریں تاکہ انہیں مخزن کی زینت بنایا جائے۔ شعر یا اشعار کے دائیں جانب بھیجنے والے اور بائیں طرف شاعر کا نام درج کیا جاتا تھا۔ ''کچکول'' سے شیخ عبدالقادر کا جو نقطہ نظر تھا، مندرجہ ذیل شعر اس کی بہترین ترجمانی کرتا ہے:

لیجئے بھیک دوڑ کر گر ہے گداگری کا یہ
جس سے ملے، جہاں سے ملے، جو ملے اور جب ملے ۷۴

شیخ عبدالقادر نے مخزن کے ذریعے نہ صرف بہترین قسم کا لٹریچر مرتب کیا بلکہ اس کے ذریعے سے بہت سے نوخیز مصنفین کو ابھرنے اور چمکنے کا موقع دیا۔ مخزن کے مضمون نگاروں میں ایسے متعدد طباع ادیب اور شاعر تھے جن کا شمار آج ہمارے ادب کے اکابرین میں ہوتا ہے۔ مثلاً علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، سید شاداں بلگرامی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، سید سجاد حیدر یلدرم، شہزادہ مرزا ارشد گورگانی، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، اکبر الہ آبادی، امیر مینائی، مولانا نظم طباطبائی، چودھری خوش محمد ناظر، نواب مرزا داغ دہلوی، مرزا سلطان احمد، مرزا اعجاز حسین، مولانا شاد عظیم آبادی، سید ناصر نذیر فراق، خواجہ حسن نظامی، منشی احمد حسین خاں، جوش ملیح آبادی، سید علی بلگرامی، سید امداد امام اثر، مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی، نواب عزیز یار جنگ، جگر مرادآبادی، ملک برکت علی، حکیم احمد شجاع، حفیظ جالندھری، میاں بشیر احمد، سید میر غلام بھیک نیرنگ، مرزا محمد سعید دہلوی، لالہ سری رام، پیارے لال شاکر، طالب بنارسی، افق لکھنوی، پنڈت شیونرائن شمیم، بسمل الہ آبادی، تلوک چند محروم، میلہ رام وفا، جگن ناتھ آزاد، نادر کاکوروی وغیرہم'' ۷۵۔

شیخ عبدالقادر نے مخزن کے ذریعے جو ادبی تحریک جاری کی وہ علامہ اقبال کے ساتھ سینکڑوں اور اکابر ادب کو منظر عام پر لانے میں حد درجہ مدد و معاون ثابت ہوئی۔ اس نے نہ صرف شعراء اور ادباء کے جوہر طبع کو نمایاں طور پر کھلنے کا موقع دیا بلکہ ان

جواہر کی نمود کا باعث بھی ہوئی اور یوں چراغ سے چراغ جلتا رہا''۔ ۲۶

مخزن کا ایک نہایت اہم اور قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر نے اس کے اولین شمارے کے سرورق پر ایک ''نقشے'' کا اجراء کیا۔ اس نقشے میں برصغیر کے نقشے کے طول وعرض پر ان مقامات کی نشان دہی کی جہاں اردو رائج تھی۔ یہ نقشہ مخزن کے سرورق پر سالہا سال تک شائع ہوتا رہا۔ مخزن کے سرورق پر جن شہروں کے نام درج کیے جاتے تھے ان میں کلکتہ، بنارس، لکھنو، دہلی، لاہور، کانپور، کشمیر، پشاور، بمبئی، حیدرآباد دکن، مدراس اور بنگلور شامل تھے اور یہ عبارت درج تھی:

''نوکروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں۔ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے۔ ان شہروں میں اردو مروج ہے۔ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے''۔ ۲۷

پروفیسر حمید احمد خان وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی لاہور نے اس ''ایجاد'' کی تعریف اور شیخ عبدالقادر کی خدمات جلیلہ پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:

''شیخ عبدالقادر کی زندگی کا ایک اہم رخ اردو زبان وادب سے ان کا عشق تھا۔ وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے بڑے قرینے سے متحدہ ہندوستان کے نقشے کے طول وعرض پر ان مقامات کی نشان دہی کی جہاں اردو رائج تھی پھر اس نقشے کو مخزن کے سرورق پر برسوں شائع کیا۔ وہ خود ایک صاحب طرز ادیب، نقاد اور انشاء پرداز تھے۔ انہوں نے مخزن کے ذریعے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو علمی حلقوں میں روشناس کرایا جو آگے چل کر اردو ادب کے اکابر قرار پائے۔ پنجاب یونیورسٹی کو یہ فخر حاصل ہے کہ جب یہاں ایم۔اے اردو کی تدریس کا آغاز ہوا تو اساتذہ میں ان کا نام سرفہرست تھا''۔ ۲۸

اردو آج کل جس بلند مقام پر فائز ہے اس کا سہرا شیخ عبدالقادر کے سر ہے اور مولانا حالی کا مندرجہ ذیل شعر اس کی بہترین ترجمانی کرتا ہے:

بہار اب جو گلشن میں آئی ہوئی ہے　　یہ سب پود اسی کی لگائی ہوئی ہے ۲۹

حواشی

۲۵ قلمی مکتوب شیخ عبدالقادر جو انہوں نے عبدالرشید چشتی کی وفات پر ۳۰ جون ۱۹۰۴ء کو لندن سے تحریر کیا۔

۲۶ ششماہی رسالہ انجمن اسلامیہ پنجاب جلد نمبر ۸، عدد ۱/ ۲، جولائی تا ستمبر ۱۹۰۴ء، ص ۳، ۸، ۹

۲۷ پنجاب یونیورسٹی کیلنڈر بابت ۱۹۰۳ء/ ۱۹۰۴ء، ص ۲۸۱

۲۸ ششماہی رسالہ انجمن اسلامیہ پنجاب جلد نمبر ۸، عدد ۱/ ۲، جولائی تا دسمبر ۱۹۰۴ء، ص ۵۱ تا ۵۲

۲۹ ماہوار رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور، بابت مارچ ۱۹۰۴ء، جلد ۲ نمبر ۳

شیخ عبدالقادر کا پروفیسر آرنلڈ سے کتنا گہرا اور قریبی تعلق خاطر تھا، اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جب پروفیسر موصوف برصغیر پاک وہند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روانہ ہوئے تو شیخ صاحب انہیں ''الوداع'' کہنے کے لیے لاہور سے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ اس حقیقت کا انکشاف شیخ عبدالقادر کے اس مکتوب سے ہوتا ہے جو انہوں نے مولوی حبیب الرحمن شروانی کے نام ۱۱/ اپریل ۱۹۰۴ء کو تحریر کیا۔ آپ نے لکھا:

''آپ کے لیے یہاں آپ کے سب دوست اور ان سب میں نیاز مند بالخصوص برابر چشم براہ رہے اور اس وقت تک اس مجبوری کو کوستے

رہے جس نے ہمیں اس موقع ملاقات سے محروم رکھا۔ تاہم دنیا میں علائق سے چھٹکارا نہیں کسی اور موقع کے منتظر رہیں گے۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور کاروبار میں کامیاب!

میں علی گڑھ آرنلڈ صاحب کو رخصت کرنے ۲۵ فروری ۱۹۰۴ء کو گیا تھا۔ اس سفر کا ارادہ عین ان کی روانگی کے قریب ہوا۔ اس لیے پہلے سے آپ کو خط نہیں لکھ سکا مگر امید غالب تھی کہ آپ وہاں تشریف فرما ہوں گے کیونکہ ڈسٹی صاحبان کو اس موقع پر بلایا گیا تھا۔ میں نے جاتے ہی دریافت کیا تو کسی نے کہا آپ اس سے شاید ایک دن پہلے تک نمائش میں تھے مگر پھر تشریف لے گئے۔ میں صرف دو روز وہاں ٹھہرا رہا اور اس خیال سے کہ آپ ابھی گئے ہیں بلا بھیجنا مناسب نہ جانا''۔ (شیخ عبدالقادر کا یہ قلمی اور غیر مطبوعہ مکتوب جو انہوں نے مولوی حبیب الرحمٰن شروانی کے نام تحریر فرمایا راقم کے پاس موجود ہے)

علی گڑھ کے ارباب بست و کشاد کی کوشش تھی کہ پروفیسر آرنلڈ صاحب کو جو انگلستان جا چکے تھے، ان سے درخواست کی جائے کہ وہ واپس آ جائیں اور ایم اے او کالج علی گڑھ کی پرنسپل شپ سنبھالیں۔ اس سلسلے میں شیخ عبدالقادر نے لندن سے ایک مکتوب ۱۹ اگست ۱۹۰۴ء کو مولوی حبیب الرحمٰن شروانی کے نام تحریر کیا جس میں اس نیک خواہش اور ارادے کا اظہار کیا۔ شیخ عبدالقادر نے لکھا:

''میرے کرم فرما جناب خان صاحب زاد لطفکم۔ السلام علیکم۔

آپ کو بذریعہ اخبارات معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں آخر انگلستان آ پہنچا۔ خدا کا فضل سفر میں شامل حال رہا اور یہاں آ کر بھی اب تک نعمت صحت حاصل ہے اور کام بخوبی ہو رہا ہے۔

میں نے آج نواب محسن الملک بہادر کو خط لکھا ہے کہ اگر وہاں کے اصحاب کی رائے ہو جائے کہ آرنلڈ صاحب کو پرنسپلی پر بلایا جائے تو وہ ہمیں کوئی باضابطہ قرارداد کر کے ارشاد فرمائیں کہ ہم تحریک کریں۔ ہمیں بہت امید کامیابی کی ہے۔ اگر آپ اس خیال کو پسند فرمائیں تو آپ بھی اس بارے میں ساعی ہوں''۔ (شیخ عبدالقادر کا قلمی اور غیر مطبوعہ مکتوب محررہ ۱۹ اگست ۱۹۰۴ء، بنام مولوی حبیب الرحمٰن شروانی راقم کے پاس موجود ہے)

۳۰ انجمن اسلامیہ امرتسر: تعلیمی و سیاسی خدمات مرتبہ احمد سعید۔ لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب، ۱۹۸۶ء، ص ۲۴۹۔ یہ بات محل نظر ہے کہ مرتب کتاب مذکور نے کتاب کے صفحات ۲۴۶ اور ۲۴۹ پر انجمن مستشار العلماء لاہور کا پانچ مرتبہ ذکر کیا ہے لیکن اسے ''مستشار'' کی بجائے ''تشار'' لکھا ہے جو درست نہیں۔ یہ لفظ کسی بھی لغت میں درج نہیں۔ اسی طرح تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے مرتب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی تالیف میں شمس العلماء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کا تذکرہ کرتے وقت ''انجمن مستشار العلماء لاہور'' کا ذکر نہیں کیا حالانکہ مفتی صاحب موصوف انجمن مذکور کے بانی اور ناظم تھے۔ دوسرے علماء میں حضرت پیر سید جماعت علی شاہ اور مولوی غلام محمد بگوی، امام شاہی مسجد لاہور شامل تھے۔

دوسری بات جو خصوصی توجہ کی حامل ہے وہ یہ ہے انجمن مذکور کی روئداد میں شیخ عبدالقادر کے نام کے ساتھ لفظ ''مولوی'' دو بار تحریر کیا گیا ہے یعنی ''مولوی شیخ عبدالقادر'' اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ سر سید احمد خان نے مسلمانان پنجاب کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ ''آئندہ شیخ عبدالقادر کو ''مولوی'' عبدالقادر کے نام سے پکارا جائے۔ سر سید احمد خاں کی طرف سے شیخ عبدالقادر کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا اور کارپردازان انجمن مستشار العلماء لاہور کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کا عملی مظاہرہ کیا۔ (حوالہ روئداد انجمن مستشار العلماء لاہور بابت ۲۷ رجب المرجب ۱۳۱۴ھ/ یکم جنوری ۱۸۹۷ء تا ۱۶ جمادی الاخری ۱۳۱۹ھ/ ۳۰ ستمبر ۱۹۰۱ء مطبوعہ رفاہ عام سٹیم پریس لاہور ۱۹۰۲ء، ص ۱۸ و ۲۰

۳۱۔ روئداد انجمن اسلامیہ امرتسر مرتبہ احمد سعید، ۱۹۸۶ء، ص ۴۶، ۲۴۹

۳۲۔ روئداد انجمن مستشار العلماء لاہور بابت یکم جنوری ۱۸۹۷ء تا ۳۰ ستمبر ۱۹۰۱ء، ص ۱۸، ۲۰

۳۳۔ روئداد بارھواں اجلاس محمڈن اینگلو اورینٹیل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۲۷ تا ۳۰ دسمبر ۱۸۹۸ء بمقام لاہور، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۹۹ء، ص ۳۲۳، ۳۲۶

۳۴۔ ماہوار رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور: جلد ۱۶ عدد ۹، بابت ۱۸۹۹ء ص ۲۷

۳۵۔ پنجاہ ۵۰ سالہ گولڈن جوبلی انجمن حمایت اسلام منعقدہ ۲۳ تا ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء کی روداد ص ۲۴

۳۶۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام لاہور۔ لاہور: انجمن حمایت اسلام، ۱۹۷۶ء، ص ۶۹ تا ۷۴ (برائے تفصیل ملاحظہ فرمایئے)

۳۷۔ روئداد پندرھواں سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء، ص ۱۲، ۱۳، ۲۶ اور ۳۶

۳۷الف روئداد ندوۃ العلماء ساتواں سالانہ اجلاس منعقدہ ۴ تا ۶ نومبر ۱۹۰۰ء

۳۷ب حوالہ مذکور، ص ۶۰

۳۷ج حوالہ مذکور، ص ۶۲

۳۸۔ روئداد جلسہ شانزدہم انجمن حمایت اسلام لاہور منعقدہ ۲۲ تا ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء، ص ۱۸۱

۳۹۔ رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور، بابت مارچ ۱۹۰۱ء، ص ۴۶

۴۰۔ حوالہ مذکور، متفرق صفحات

۴۱۔ مجلّہ فاران اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور ۱۹۸۴ء، ص ۵۲ تا ۵۴

۴۲۔ مقالات عبدالقادر مرتبہ محمد حنیف شاہد، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء، ص ۸۳

۴۳۔ حصول پاکستان مرتبہ احمد سعید، لاہور: ایجوکیشنل ایمپوریم، ۱۹۸۳ء، ص ۵۸ تا ۵۹

۴۴۔ حوالہ مذکور

۴۵۔ مقالات عبدالقادر مرتبہ محمد حنیف شاہد، ص ۸۲ تا ۸۳

۴۶۔ قلمی مکتوب شیخ عبدالقادر محررہ ۹ ستمبر ۱۹۰۰ء بنام نواب محسن الملک بہادر جو شیخ منظور فادر خلف الرشید شیخ عبدالقادر نے راقم کو عنایت فرمایا۔ نواب مولوی مشتاق حسین وقار الملک (۱۸۳۹ء تا ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء) سرسید احمد خاں کے نورتنوں میں سے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے سیکرٹری اور علی گڑھ کالج کے سیکرٹری۔ آپ کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے بعض جگہ تحریر ہے کہ آپ ۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ سرسید احمد خان اور نواب محسن الملک کے بعد مسلمانوں کی قیادت جس بزرگ ہستی کے ہاتھوں میں آئی قوم انہیں وقار الملک کے نام سے یاد کرتی ہے۔ نواب وقار الملک کو سرسید احمد خاں کے ساتھ سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جنوری ۱۸۶۶ء میں ان کو سوسائٹی کا ''رفیق'' مقرر کیا گیا اور ایک انگریزی کتاب ''انقلاب فرانس اور نپولین'' کا اردو ترجمہ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

نواب محسن الملک کی وفات کے بعد نواب وقار الملک کو تین سال کے لیے کالج کا آنریری سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر قائم مقام سیکرٹری نواب مزمل اللہ خان نے فرمایا: ''نواب محسن الملک کی وفات حسرت آیات کے وقت سے ہندوستان کے تمام مسلمان نہایت آرزومندانہ دلی جوش سے یہ صدا بلند کر رہے تھے کہ نواب وقار الملک مدرسۃ العلوم کے سیکرٹری مقرر کیے جائیں''۔ سر میاں محمد شفیع نے

نواب صاحب کی تقرری بحیثیت آنریری سیکرٹری کا خیر مقدم کرتے ہوئے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ کراچی میں ایک قرارداد ان الفاظ میں پیش کی: ''اس کانفرنس کی رائے میں نواب وقار الملک سے بہتر کوئی شخص نواب محسن الملک کی جانشینی کے لیے نہیں مل سکتا''۔

نواب وقار الملک نے اردو ہندی تنازعہ، پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے قیام، شملہ وفد و آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام، جداگانہ انتخاب، اٹلی کے طرابلس پر حملے اور حادثہ مچھلی بازار کانپور کے سلسلے میں جو شاندار اور تاریخ ساز خدمات انجام دیں انہیں مستقبل کا تاریخ نویس نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

نواب وقار الملک نے ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو امروہہ میں انتقال فرمایا۔ ان کی وفات پر مولانا محمد علی جوہر نے فرمایا: ''ہندوستان اپنے فرزند بزرگ اور ہم اپنے باپ سے محروم ہو گئے''۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمایئے حصول پاکستان مرتبہ احمد سعید صفحات ۲۸۴ تا ۲۹۰ اور ''ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان مولفہ ایس ایم اکرام، صفحات ۹۸ تا ۱۱۰)

۴۷۔ قلمی مکتوب شیخ عبدالقادر بنام نواب وقار الملک بہادر محررہ ۱۳ ستمبر ۱۹۰۰ء جو شیخ منظور قادر خلف الرشید شیخ عبدالقادر نے راقم کو مرحمت فرمایا۔

۴۸۔ ادبی دنیا دور ششم جنوری ۱۹۲۶ء شمارہ نمبر ۱۸ زیر عنوان ''سر عبدالقادر'' ص ۴۱

۴۹۔ حوالہ مذکور: اس کتاب کے دیباچے سے مراد ''نیو سکول آف اردو لٹریچر'' کا دیباچہ ہے۔ یہ کتاب سر شیخ عبدالقادر نے اپنے طور پر عوام کے اصرار پر ۱۸۹۸ء میں شائع کی۔

۵۰۔ حوالہ مذکور، ص ۴۶

۵۱۔ مکتوب ڈاکٹر سید عبداللہ جو انہوں نے شیخ عبدالقادر کی برسی پر ۲۷ دسمبر ۱۹۶۷ء کو تحریر کیا۔ اس زمانے میں آپ اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب کے صدر اور مدیر اعلیٰ تھے۔

۵۲۔ مکتوب ڈاکٹر سید عبداللہ مورخہ ۶ فروری ۱۹۶۹ء

۵۳۔ ماہنامہ ہمایوں (سالنامہ) ۱۹۵۸ء، جلد نمبر ۷۲ عدد نمبر ۴۲۲

۵۴۔ مخزن (مخزن الخازن) مارچ ۱۹۵۰ء، صفحہ ۵۷

۵۵۔ مکتوب پروفیسر حمید احمد خاں، وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب لاہور، بتاریخ ۱۷ اپریل ۱۹۶۶ء

۵۶۔ ماہنامہ ہمایوں (سالنامہ) ۱۹۵۸ء، جلد نمبر ۷۲، عدد ۴۲۲

۵۷۔ ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان (Modern Muslim India and the Birth of Pakistan) مولفہ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ لاہور: شیخ محمد اشرف، ۱۹۷۰ء، ص ۱۴۹

۵۸۔ تاریخ نظریہ پاکستان مولفہ پیام شاہ جہانپوری، لاہور: انجمن حمایت اسلام، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۹

۵۹۔ ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان مولفہ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، صفحہ ۹۸

۶۰۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام مولفہ محمد حنیف شاہد، لاہور: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، ۱۹۷۶ء متفرق صفحات

۶۱۔ حصول پاکستان مرتبہ احمد سعید، ص ۳۰

۶۲۔ روئداد آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹیل کانفرنس بابت ۲۷ تا ۳۰ دسمبر ۱۸۹۸ء، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۹۹ء، صفحات ۳، ۱۸، ۳۳، ۳۲۳ اور ۳۲۶

۶۲الف سر عبدالقادر: تعلیمی، علمی، قومی اور انتظامی خدمات علی گڑھ: اختر پرنٹنگ ورکس، ۱۹۴۱ء، ص ۱

۶۳ برصغیر پاک و ہند کے ادارے۔ کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج، ۱۹۷۳ء/ ۱۹۷۴ء، ص ۱۰۴

۶۴ حصول پاکستان، مولفہ احمد سعید، ص ۴۵

۶۵ تاریخ انجمن اسلامیہ امرتسر مولفہ احمد سعید۔ لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان جامعہ پنجاب، ۱۹۸۶ء، متفرق صفحات

۶۶ ماہنامہ ہمایوں (سالنامہ)، جلد نمبر ۷۲، عدد ۴۲، ۱۹۵۸ء

۶۷ اسلام اور قائداعظم مولفہ محمد حنیف شاہد۔ ریاض/لندن: انٹرنیشنل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳۵

۶۸ مخزن جنوری ۱۹۴۹ء، ص ۴

۶۹ مقالات عبدالقادر مرتبہ محمد حنیف شاہد۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء، ص ۴۳ تا ۴۴

۶۹الف قلمی مکتوب شیخ عبدالقادر بحررہ ۲۸ مارچ ۱۹۰۱ء

۶۹ب مکتوب شیخ عبدالقادر بحررہ ۱۹ مئی ۱۹۰۳ء

۷۰ پنجاب کا سرسید۔ مولفہ محمد حنیف شاہد۔ نقوش عدد ۱۴۰، ۱۹۹۰ء، ص ۷۲۵

۷۱ حوالہ مذکور، ص ۷۲۶ تا ۷۲۷

۷۲ ماہنامہ ہمایوں (سالنامہ) جلد نمبر ۷۲ عدد ۴۲۲، ۱۹۵۸ء

۷۳ ادبی دنیا، دور ششم، شمارہ نمبر ۱۸، جنوری ۱۹۲۶ء، ص ۴۶

۷۴ اقبال ریویو (باقیات اقبال) کچکول) مرتبہ محمد حنیف شاہد) جلد نمبر ۱۹، عدد نمبر ۲، جولائی ۱۹۷۸ء

۷۵ پنجاب کا سرسید مولفہ محمد حنیف شاہد۔ نقوش عدد ۱۴۰: ۱۹۹۰ء، ص ۶۹۰

۷۶ حوالہ مذکور، ص ۷۲۸

۷۷ مخزن جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱: اپریل ۱۹۰۱ء۔ سرورق

۷۸ مکتوب پروفیسر حمید احمد خاں مورخہ ۱۷/اپریل ۱۹۲۶ء

۷۹ پنجاب کا سرسید۔ مولفہ محمد حنیف شاہد۔ نقوش عدد ۱۴۰، ۱۹۹۰ء، ص ۷۲۹

آراءاورتبصرے

محترمی ومجی۔تسلیم

آپ کا مجلّہ نمبر ۱۳ ملا۔اس سے قبل بھی جو رسالہ موصول ہوا تھا اس کی رسید میں نے غالباً بھیجی تھی۔ یہ شمارہ اس سے بدرجہا بہتر ہے اور اس کی ترسیل کے لیے خاص طور پر آپ کا شکرگزار ہوں۔اس شمارے میں ناصر عباس نیر کا مضمون ''مابعد جدیدیت کی اہم اصطلاحات (وضاحتی فرہنگ)'' بطور خاص پسند آیا۔ان کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس موضوع کی مبادیات کو وضاحت سے لکھا۔براہ کرم اس سلسلے کی مبادیات سے متعلق دوسرے مضامین بھی نیر صاحب سے لکھا کر شائع کریں۔

آپ کے مضامین پڑھنے کا خواہش مند ہوں۔

محمد حسن۔ انڈیا

''مخزن'' ۱۳ پر ایک نظر

رسالہ ''مخزن'' قائداعظم لائبریری لاہور کا ادبی مجلّہ ہے جو ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں سال میں دو مرتبہ چھپتا ہے۔ ''مخزن'' کے نام سے ایک جلیل القدر پرچے کا آغاز بیسویں صدی کے پہلے سال میں شیخ عبدالقادر نے کیا تھا۔اس پرچے نے اردو ادب کو تخلیق اور تراجم کی سطح پر متعارف کرانے میں ایک خاص کردار ادا کیا اور اس نام کو ایک مثالی حیثیت حاصل ہوگئی۔پھر جب شیخ عبدالقادر ''مخزن'' کی ادارت جاری نہ رکھ سکے تو اس کی تدوین وترتیب کو حفیظ جالندھری نے سہارا دیا۔آزادی کے بعد جناب حمید نظامی نے قومی زبان اردو سے وابستہ رہنے اور ادب کی جدید کروٹوں سے باخبر رکھنے کا منصوبہ بنایا تو انہوں نے مولانا حامد علی خان کی خدمات مستعار لیں جو اس سے قبل لمبے عرصے تک رسالہ ''ہمایوں'' کی ادارت کا فریضہ ادا کر چکے تھے۔اقبال کے تصورات، قائداعظم کے افکار، دوقومی نظریہ اور پاکستانیت کے علاوہ نئے دور کے ''مخزن'' نے نہ صرف کلاسیکی ادب کی اعلیٰ خدمات انجام دیں بلکہ متعدد نئے لکھنے والوں کو بھی متعارف کرایا۔''مخزن'' کا یہ دور زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ادارہ ''نوائے وقت'' کا خیال تھا کہ اس کا اپنا

پریس لگے گا تو ''مخزن'' پھر جاری کیا جائے گا۔لیکن شومئے قسمت سے حمید نظامی، جو خود اعلیٰ پائے کے ادیب اور مزاح نگار تھے، اس دنیا سے جلد رخصت ہو گئے۔اور ''مخزن'' کے دوبارہ اجرا کا منصوبہ پروان نہ چڑھ سکا۔

۲۰۰۱ء کی نئی صدی کا طلوع ہوا تو ''مخزن'' کی تجدید کا خیال جناب عنایت اللہ کے زرخیز ذہن میں پیدا ہوا۔وہ اس وقت اپنی اعلیٰ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔اور قائداعظم لائبریری لاہور کی مجلس منتظمہ میں شامل تھے۔ انہوں نے ''مخزن'' جاری کرنے کا منصوبہ بنایا تو اس کی ادارت کے لئے ملک کے نامور محقق نقاد اور دانشور ڈاکٹر وحید قریشی کی خدمات حاصل کیں اور ملک کے چھ ادباء جناب انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، انور سدید، امجد اسلام امجد، اور ڈاکٹر سہیل احمد خان کو نامزد کیا۔بعد میں ڈاکٹر سہیل احمد اپنی دوسری تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے مجلس ادارت سے رضا کارانہ طور پر الگ ہو گئے اور ان کی جگہ ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کو نامزد کیا گیا۔لیکن وہ مجلس ادارت کے کسی اجلاس میں شریک نہیں ہوئے۔اس لئے ان کا نام اگر اشتہاری اور نمائشی قرار دیا جائے تو غیر موزوں نہیں ہوگا۔انتظامی امور پہلے ہارون عثمانی صاحب نے انجام دیئے اور اب یہ فرائض شہناز مزمل انجام دے رہی ہیں۔مخزن کی مجلس ادارت نے بارہ کامیاب اشاعتیں پیش کرنے کے بعد لاہور میں ''مخزن قومی اردو کانفرنس'' منعقد کی۔جس میں ملک کے چاروں صوبوں کے نامور ادبا محقق اور نقاد شامل ہوئے اور نہ صرف اردو کی موجودہ صورتحال کا جائزہ پیش کیا بلکہ نفاذ اردو کی آئینی شقات پر عمل درآمد کی قرارداد بھی منظور کی۔اس کانفرنس کی صدارت ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی۔مہمان خصوصی حکومت پاکستان کے ایوان بالا (سینٹ) کے چیئرمین جناب محمد میاں سومرو تھے۔اس کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات کا مجلّہ الگ چھپ رہا ہے۔

اس طویل تمہید کے بعد اطلاعاً عرض ہے کہ ''مخزن'' کا ۲۰۰۷ء کا پہلا شمارہ چھپ گیا ہے۔اس کا اداریہ سابقہ اردو کانفرنس کی صدائے بازگشت سمجھئے۔ڈاکٹر وحید قریشی نے بجا شکایت کی ہے کہ ''بعض مؤثر طبقے قومی زبان کے نفاذ میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ دوسرے ہمارے ہاں لسانی مسائل کو سیاسی طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔حالانکہ سیاسی مسائل کے سیاسی حل ہوتے ہیں اور لسانی مسائل کے لسانی حل۔'' تاہم گزشتہ دنوں حکومت کو قومی زبان کے بارے میں جو احساس پیدا ہوا اور جس کے تحت قومی اسمبلی میں پیش کرنے کے لئے کابینہ کمیٹی نے جو سفارشات مرتب کیں، ان پر ڈاکٹر وحید قریشی نے اطمینان کا اظہار کیا اور اسے خوش آئند قرار دیتے ہوئے لکھا کہ اس پیچیدہ مسئلے کا کوئی نہ کوئی قابل عمل حل حکومت کے پیش نظر ضرور ہوگا۔

''مخزن'' شمارہ ۱۳۔تنقید، اقبالیات، تحقیق، شخصیت، فنون لطیفہ اور طویل، مختصر تبصروں کے ابواب میں منقسم ہے۔ڈاکٹر ضیاء الحسن ان دنوں ''غزل اور غزل کی تنقید'' پر قابل قدر کام کر رہے ہیں۔اس مقالے میں انہوں نے غزل کے لچکدار مزاج کا ذکر کیا تو کہا: ''غزل خود پر ہونے والے اعتراضات کو غور سے سنتی ہے۔لغو اعتراضات کو نظر انداز کر دیتی ہے لیکن ہمدردانہ مشوروں کا احترام کرتی ہے اور اپنے تخلیقی مزاج میں ضروری تبدیلی کر لیتی ہے''۔یہ نکتہ غزل کے ارتقا کا ضامن ہے۔ان کا یہ خیال بھی غور طلب ہے کہ موجودہ عہد میں غزل ہند برطانوی تہذیب سے ''پاک امر تہذیب'' کے تشکیلی مراحل سے گزر رہی ہے۔ڈاکٹر ضیاء الحسن کو اس نقطے کی مزید وضاحت کرنی چاہئے۔

ناصر عباس نیر مشکل موضوعات پر کام کرنے والے نقاد ہیں۔اس پرچے میں انہوں نے مابعد جدیدیت کی اہم اصطلاحات کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ انہیں ایک عام استاد اردو بھی سمجھ سکے۔ڈاکٹر خالد سنجرانی نے ایک بھولے ہوئے نفسیاتی افسانہ نگار اختر اورینوی کا تعارف کرایا ہے۔ڈاکٹر روبینہ شاہجہان نے مظفر علی سیّد کی تنقید پر مقالہ پیش کیا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر کے مقالے کا عنوان ''معجزۂ فن کی نمود'' ہے اور اس میں آخری نکتہ یہ پیش کیا ہے کہ ''صرف تخلیق ہی ہے جو بندے کو آقا کا ہمسر بنا دیتی ہے۔''

''شخصیت'' کے حصے میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے ممتاز شاعر و دانشور ڈاکٹر خورشید رضوی کا ''شخصیت نامہ'' پیش کیا ہے اور انہیں جھوٹی تہذیب کا سچا آدمی قرار دیا ہے۔اس مقالے کا ہر جملہ ڈاکٹر خورشید کی کلاسیکی شخصیت کا عکاس ہے۔اور انہیں ایک ایسی عبقری شخصیت قرار دیا گیا ہے جنہیں اپنے الفاظ کے مطالب کا پورا شعور ہے اور جن کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف نہیں۔دوسرا شخصیت نامہ علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند اور اسلام کے شیدائی خواجہ عبدالوحید کے بارے میں ہے۔خواجہ صاحب نے بیسویں صدی کے اوائل میں لٹی لاج اور قدیر منزل کی محفلوں میں اقبال کو دیکھا، ان کی باتیں سنیں اور پھر ان کے مشوروں سے رسالہ ''اسلام'' جاری کیا اور قومی امور پر خامہ فرسائی کی۔ان کی ڈائری ''یادایام'' حال ہی میں چھپی ہے۔اور یہ بیسویں صدی کے ایک خاص دور کا، جس میں اقبال زندہ تھے، آئینہ ہے۔پروفیسر خالد جامعی نے خواجہ عبدالوحید کو علامہ اقبال کا مردِ مومن قرار دیا ہے۔بلاشبہ وہ اس رتبۂ بلند کے اپنے عمل سے حقدار تھے۔اقبالیات کے حصے میں محمد نعیم بزمی نے نظم ''جگنو'' کی امیجری کا تجزیہ کیا ہے اور ڈاکٹر محمد آصف اعوان نے اقبال کے چوتھے خطبے پر توضیحی مقالہ لکھا ہے۔جناب محمد حنیف شاہد نے سر عبدالقادر کے احوال و آثار پر اور علیم صبا نویدی نے مدراس کے ''فورٹ سینٹ جارج'' پر تحقیقی مقالہ پیش کیا ہے۔تبصرہ نگاروں میں حافظ صفوان محمد چوہان، غلام رسول تنویر، ڈاکٹر وحید قریشی، شہناز مزمل اور انور سدید شامل ہیں۔

یہ صاف ستھرا علمی و ادبی رسالہ اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمت کر رہا ہے۔اس کا مطالعہ ہر صاحب ذوق کی ادبی ضرورت ہے۔سفید دبیز کاغذ پر خوبصورت طباعت میں ضخامت ۲۰۴ صفحات اور قیمت صرف ۱۰۰ روپے ہے۔یہ رسالہ مطالعے کے بعد گھر میں محفوظ رکھنے کی چیز ہے۔

(نوائے وقت، لاہور۔ ۱۰/اگست ۲۰۰۷ء)

قائداعظم لائبریری کی علمی وادبی سرگرمیاں

شہناز مزمل

۵ مئی ۲۰۰۷ء

مخزن قومی اردو کانفرنس

اردو زبان کی قومی، دینی اور بین الاقوامی افادیت کے تناظر میں پاکستان میں سرکاری سطح پر اس کی ترویج کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے مجلّہ مخزن کی مجلس انتظامیہ اور قائداعظم لائبریری لاہور کے اشتراک سے ۵ مئی ۲۰۰۷ء کو "مخزن قومی اردو کانفرنس" کا انعقاد کیا گیا۔ اس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت ملک کے نامور محقق، نقاد اور ادیب ڈاکٹر جمیل جالبی نے فرمائی۔ تقریب کے چیئرمین سینٹ محمد میاں سومرو مہمان خصوصی تھے۔ جبکہ اس اجلاس میں حکومت پنجاب کی نمائندگی ایڈیشنل چیف سیکرٹری نجیب اللہ ملک نے کی۔ افتتاحی اجلاس کا کلیدی مقالہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین پروفیسر فتح محمد ملک کا تحریر کردہ تھا۔ موصوف بوجوہ تشریف نہ لا سکے لہٰذا ان کا مقالہ ڈاکٹر سلیم اختر نے پڑھا۔

اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے چیئرمین سینٹ نے فرمایا کہ پاکستان کی حکومت سرکاری سطح پر اردو کے نفاذ میں سنجیدہ ہے۔ صدر مملکت جنرل پرویز مشرف کی تحریک پر وزیراعظم پاکستان جناب شوکت عزیز نے ایک قومی کمیٹی قائم کی ہے جو اس موضوع پر اپنی سفارشات مرتب کر رہی ہے۔ محمد میاں سومرو صاحب نے کانفرنس کے مندوبین کو یقین دلایا کہ پاکستان میں اردو کے فروغ اور سرکاری سطح پر اس کے نفاذ کے سلسلے میں وہ بھرپور طور پر اپنا اثر ونفوذ کام میں لائیں گے۔

افتتاحی اجلاس کے صدر ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخی حوالے دیتے ہوئے پاکستان کی ترقی اور قومی یک جہتی کے لیے اردو کے کردار پر زور دیا۔ آپ نے صدفی صد شرح خواندگی کے حصول میں اردو کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ انہوں نے کہا "گزشتہ کئی دہائیوں سے اردو کو نظر انداز کیے جانے کا انجام یہ ہے کہ آج ہماری قوم نامور فلسفی، سائنس دان اور اہل ہنر سامنے لانے میں ناکام رہی ہے"۔

مخزن بورڈ کے چیئرمین جناب عنایت اللہ نے اردو کی قبولیت کی دلیل کے طور پر اس بات کا حوالہ دیا کہ برصغیر کے کئی علاقے اردو کے نکتۂ آغاز کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کوریا، چین، جاپان اور روس جیسے ملک اپنی قومی زبان کے توسط سے مثالی ترقی کر پائے۔ ہمیں بھی اگر ترقی کی منازل طے کرنا ہیں تو اردو کا دامن تھامنا ہوگا۔ آپ نے کانفرنس کے مندوبین کو باور کروایا کہ اردو کا نفاذ ہمارے ملک کا آئینی تقاضا ہے جس کی تعمیل میں ہمیں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

کانفرنس کی دوسری نشست کی صدارت ملک کے نامور ادیب اور نقاد انتظار حسین نے کی جب کہ اختتامی نشست کی صدر

محترمہ مہتاب اکبر راشدی تھیں۔ ملک کے چاروں صوبوں سے تشریف لانے والے ادبا نے پُرمغز مقالات پڑھے۔ان میں ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر فردوس انور قاضی، ڈاکٹر عطش درانی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، شہزاد احمد، محسن احسان، عبدالحکیم بلوچ، خاطر غزنوی، ڈاکٹر شاہین مفتی، مہتاب اکبر راشدی اور ظہیر جاوید نمایاں تھے۔

کانفرنس کے مندوبین نے متفقہ سفارشات پر مبنی دو قراردادیں کثرت رائے سے منظور کیں۔ان کے نمایاں نکات یہ ہیں:

(۱) حکومت پاکستان اردو زبان کی تاریخی افادیت اور قومی زبان کی حیثیت میں اس کی ماہیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرکاری سطح پر اس کے نفاذ کو بلا تاخیر و تامل عملی جامہ پہنائے۔

(۲) وزیراعظم شوکت عزیز کی قائم کردہ کمیٹی کی سفارشات کو فوری طور پر لاگو کیا جائے۔اس سلسلے میں ۱۹۷۳ء کے آئین کی روح کو مزید نظر انداز نہ کیا جائے۔

(۳) اردو زبان پر انگریزی کو ترجیح نہ دی جائے۔اور حسب سابق انگریزی کی تدریس چھٹی جماعت سے کی جائے۔

(۴) معاصر فکری، سائنسی اور معلوماتی مضامین و کتب کو اردو میں منتقل کر کے عوام تک پہنچانے کے لیے ایک مرکزی دارالترجمہ قائم کیا جائے۔

(۵) اردو زبان میں کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لیے ادبا کو بلا سود قرضے جاری کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

(۶) علم و ادب کے فروغ میں کتب خانوں کا کردار مسلمہ ہے۔ملک کے چھوٹے بڑے کتب خانوں کے انتظامی اور خدماتی امور میں بہتری لانے کے لیے ہر علاقے کے معروف دانش وروں اور اساتذہ پر مشتمل مشاورتی بورڈ تشکیل دیے جائیں جو کتب خانوں کی ترقی اور فعالیت میں معاونت کر سکیں۔

(۷) اردو اور دیگر علاقائی زبانوں کے ادیبوں اور دانش وروں کو اندرون و بیرون ملک سفر کے لیے کرائے میں ۵۰ فی صد رعایت دی جائے۔

(۸) اردو رسائل کی بیرون ملک بالخصوص بھارت ترسیل کے لیے ڈاک کی شرح میں خصوصی رعایت دی جائے۔

اس یادگار قومی اردو کانفرنس میں نظامت کے فرائض معروف شاعرہ ڈاکٹر شہناز مزمل نے ادا کیے۔زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد بالخصوص ادبا، شعرا اور طلبا و طالبات نے بھرپور شرکت فرمائی۔

۱۲ جون ۲۰۰۷ء

اردو اور عصر حاضر کے تقاضے

قائداعظم لائبریری لاہور میں ۱۲ جون ۲۰۰۷ء کو ایک تقریب منعقد ہوئی جس کا موضوع تھا ''اردو اور عصر حاضر کے تقاضے''۔اس تقریب کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں رسمی طور پر کسی نے صدارت نہیں کی۔یہ تقریب ایک گول میز کانفرنس کے مصداق تھی جس میں شامل سب لوگ بحث میں حصہ لے رہے تھے۔اسے محترمہ شہناز مزمل نے بڑی خوبصورتی سے جاری رکھا۔ان کی رائے میں آج کا زمانہ گزشتہ زمانوں سے مختلف ہے۔اب دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس گلوبل ولیج کے تقاضوں کے مطابق ایک نیا معاشرہ تشکیل دیں۔بنیادی معلومات کا ایک وسیع و عریض سمندر ہے جو چشم بصیرت کو خیرہ کر رہا ہے۔

معلومات کے اس بے پناہ بہاؤ کا راستہ میڈیا کہلاتا ہے۔اردو کو بھی اگر عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے تو اس کو میڈیا کے ساتھ چلنا ہوگا۔محترم عنایت اللہ نے کہا کہ میڈیا کی بنیادی طور پر تین قسمیں ہیں:

۱۔الیکٹرک میڈیا: اس میں ٹیلی ویژن، ریڈیو، انٹرنیٹ، ٹیلی فون، موبائل وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔پرنٹ میڈیا: یہ اخبارات، رسائل وجرائد، ریسرچ جرنلز اور ڈائریکٹریز وغیرہ پر مشتمل ہے۔

۳۔آؤٹ ڈور میڈیا: اس میں بل بورڈ، بینرز، جھنڈیاں وغیرہ شامل ہیں۔

عنایت اللہ صاحب نے کہا کہ میڈیا نے عصر حاضر کے تمام شعبوں کی طرح اردو زبان اور شعر وادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ لیکن الیکٹرانک میڈیا نے اردو زبان کو اس کے اصل حروف تہجی سے محروم کر دیا ہے۔پیغامات رومن زبان میں تحریر ہو رہے ہیں اور اس میں انگریزی اور اردو کا ملغوبہ بنایا جا رہا ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کیا اردو زبان کی بقا اور تحفظ کی خاطر سکرپٹ تبدیل کر دینا چاہیے یا میڈیا کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک نئے تحریری نظام کو متعارف کروایا جائے؟

قائداعظم لائبریری کے چیف لائبریرین جناب محمد تاج نے کہا ''عصر حاضر میں میڈیا کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہر قسم کی معلومات کا ایک ذخیرہ ہمیں دستیاب رہتا ہے۔میڈیا نے زبان وادب کے لیے نئی نئی راہیں دریافت کی ہیں اور موجودہ راہوں کو مزید کشادہ کر دیا ہے۔عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان راہوں پر کیسے چلنا ہے اس کا فیصلہ آپ سب کریں گے۔'' ہمیں تھوڑی سی وسعت نظری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔اگر ہم کج فہموں کی طرح میڈیا کو تعصب کی عینک سے دیکھتے رہے تو ہمارا عظیم شعری ونثری سرمایہ بھی بے وقعت ہو جائے گا اور جدید رجحانات کے علمبردار شعرا اور ادبا اپنی وقعت کھو بیٹھیں گے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے ادیب میڈیا کے ذریعے جدید تکنیکی علوم سے خاطر خواہ استفادہ کریں۔سی ڈی۔ڈی وی ڈی اور ویب سائٹ کی تکنیک کو اپنائیں اسی میں ہماری اور اردو زبان کی بہتری ہے۔

اس تقریب میں مقامی کالجوں کے طلبا نے کثرت سے شرکت کی اور کچھ دیر کے لیے ایسی اردو زبان استعمال کی گئی جس میں انگریزی کا ایک لفظ بھی شامل نہیں تھا۔اس نادر تجربے کو سب نے سراہا۔

۳۰/اگست ۲۰۰۷ء

قرۃ العین حیدر کو خراج تحسین

قائداعظم لائبریری اور اکادمی ادبیات پاکستان کے اشتراک سے ۳۰/اگست ۲۰۰۷ء کو اردو کی ممتاز ناول وافسانہ نگار محترمہ قرۃ العین حیدر کی وفات پر لاہور کے ادیبوں اور دانشوروں کا ایک اجلاس قائداعظم لائبریری ہال میں ہوا، جس میں مرحومہ کو شاندار خراج عقیدت ادا کیا گیا۔اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر انور سدید نے کی اور اسٹیج سیکرٹری کے فرائض ڈاکٹر شہناز مزمل نے ادا کیے۔

شہناز مزمل نے اجلاس کے آغاز میں قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات کا جائزہ اختصار سے پیش کیا۔ڈاکٹر یونس جاوید نے ان کی افسانہ نگاری اور رپورتاژ نگاری کا تذکرہ کیا اور کہا کہ انہوں نے اردو فکشن کو ایک الٹرا ماڈرن کلچر سے متعارف کرایا جو آزادی سے قبل ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دور میں پروان چڑھ رہا تھا۔انہوں نے قرۃ العین حیدر کے رپورتاژ ''ستمبر کا چاند'' اور ناولٹ

''سیتا ہرن'' کا خصوصی تذکرہ کیا اور کہا ''عینی آپا۔۔ایک تاریخ دان، ناول نگار اور دانشور ہی نہیں تھیں بلکہ ایک عہد تھا جو ہندوستان و پاکستان کے ہر شہر کی ہواؤں میں مہکتا اور چہکتا رہا۔'' محترمہ افضل توصیف نے اپنی ذاتی ملاقاتوں کے حوالے سے کہا کہ قرۃ العین حیدر اپنی تحریروں کی موجودگی میں ہمارے ادبی منظر سے کبھی اوجھل نہیں ہوں گی۔ پروفیسر امجد طفیل نے ان کے ناول ''آگ کا دریا'' کا تجزیہ کیا اور کہا کہ ان کا مطالعہ، مشاہدہ اور تاریخ کا گہرا ادراک ان کے فن کو نئی جہات سے آشنا کرتا ہے۔ محمد سعید شیخ نے ان کی ادبی خدمات کے تذکرے میں ان کے سوانحی ناول ''کارِ جہاں دراز'' کا تجزیہ اور محاکمہ کیا جس میں ان کے خاندانی حالات ہند اسلامی کلچر کے آئینہ دار ہیں۔ پروفیسر رضی عابدی نے ''آخر شب کے ہم سفر'' اور ''آگ کا دریا'' کا موازنہ انگریزی کے چند مشہور ناولوں سے کیا جن کی ترتیب میں تاریخ کو بھی استعمال کیا گیا تھا۔

آخر میں صدر محفل ڈاکٹر انور سدید نے قرۃ العین حیدر کا تذکرہ ان کے والد گرامی سجاد حیدر یلدرم کے حوالے سے کیا اور کہا کہ اس قدر زریں ادبی وراثت اردو کے کسی ادیب کو نصیب نہیں ہوئی۔ انہوں نے قرۃ العین حیدر کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ عینی آپا نے اردو افسانے اور ناول میں جو طرز نو ایجاد کیا تھا، وہ اس کی بانی بھی تھیں اور منتہی بھی اور وہ اپنی کتابوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

اس اجلاس میں لاہور کے بہت سے ادیبوں نے شرکت کی اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔

قائداعظم لائبریری کی مطبوعات

۱۔ ابتدائی فلکیات	خالد مسعود	20/- روپے
۲۔ پودوں کی زندگی	خالد مسعود	30/- روپے
۳۔ مسلمان اور سائنس	خالد مسعود	30/- روپے
۴۔ عالم حیوانات	خالد مسعود	20/- روپے
۵۔ کروزمین	خالد مسعود	20/- روپے
۶۔ کلیاں میرے گلشن کی	عبدالرحمٰن خالد	20/- روپے
۷۔ اصطلاحات حدیث	محمد سعد صدیقی	80/- روپے
۸۔ علم حدیث اور پاکستان میں اس کی خدمت	محمد سعد صدیقی	100/- روپے
۹۔ اسلامی آداب	سید عبدالرحمٰن بخاری	100/- روپے
۱۰۔ اسلامی قانون کا نظریہ مصلحت	سید عبدالرحمٰن بخاری	190/- روپے

ملنے کا پتا: قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور۔ پاکستان

پندرھویں شمارے کے قلمی معاونین

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، 30 محمود شیرانی روڈ، سٹیڈیم پارک شیخوپورہ

عارفہ محمود، ۷۸۰، بلاک زیڈ، ڈیفنس، لاہور

ڈاکٹر مختار الدین احمد علی گڑھ، انڈیا

سفیر حیدر نقوی، لیکچرار شعبہ فلسفہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر ممتاز احمد خان، 1837/14 دستگیر سوسائٹی، فیڈرل بی ایریا، کراچی

ڈاکٹر تحسین فراقی، Tehseen Firaqi

Zer-1- Pule Gaisha, Danish Kadah-i-Zuban,

Hai Kherji Guruh -i- Zuban-o-Adabiat-e-Urdu, Tehran, Iran

حافظ صفوان محمد چوہان، ڈی۔ای (کمپیوٹر اینڈ ڈیٹا سروسز) ٹیلی کمیونیکیشن سٹاف کالج، ہری پور

پروفیسر ڈاکٹر حنیف نقوی، سی کے ۲۰/ ۴۶ بی، تھرڈ فلور بینیا باغ، وارانسی۔ ۲۲۱۰۰۱

علیم صبا نویدی، مدیر اعلیٰ، ''نور جنوب'' چنئی (بھارت)

جناب افضل حق قرشی، ادارہ ثقافت اسلامی، ۳۔کلب روڈ لاہور

سید ذوالکفل بخاری، لیکچرار انگریزی، عبداللہ بن مسعود کالج، املج، تبوک، سعودی عرب

ڈاکٹر انور سدید، ۷۲ استلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

اورنگ زیب نیازی، ایڈیٹر ''تضمین'' ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور

محیط اسمٰعیل، معرفت عوامی کتاب گھر، 17، اردو بازار لاہور

جسٹس ایم۔آر۔کیانی (مرحوم)

امجد اسلام امجد، 275-N ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، لاہور کینٹ

محمد حنیف شاہد، 170 جہانزیب بلاک، اقبال ٹاؤن لاہور

شہناز مزمل، لائبریرین، قائداعظم لائبریری لاہور